قصص القرآن

جلد سوم

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

ندوۃ المصنفین دہلی

سلسلہ ندوۃ المصنفین (۳۳)

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ

یہ بیان حق ہے

قصص القرآن

حصۂ سوم

جس میں انبیا علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی اصحاب الکہف والرقیم، اصحاب الرس، اصحاب الاخدود، اصحاب الجنۃ، اصحاب القریہ، اصحاب سبت، اصحاب الفیل، ذوالقرنین، سد سکندری، سبا اور سیل عرم وغیرہ کی نہایت مکمل اور محققانہ تفسیر کی گئی ہے۔

تالیف

مولانا الحاج محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین۔ دہلی

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی کے اہتمام سے

جید برقی پریس و محبوب المطابع پریس دہلی میں طبع ہوئی

سنہ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء

طبع اول

قیمت للعہ / مجلد صہ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ العلی الاکبر والصلوۃ والسلام علی محمدن المبعوث الی الاسود والاحمر وعلی آلہ واصحابہ الذین ہم ھداۃ الدین الازہر۔

قصص القرآن کی تالیف کے وقت یہ خیال تھا کہ اس موضوع سے عہدہ برآ ہونے کے لئے چند سو صفحات کا ایک جزء کافی ہوگا لیکن اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد میدان کی وسعت نے اس خیال میں انقلاب پیدا کر دیا اور رہوارِ قلم جس قدر آگے بڑھتا گیا میدانِ موضوع وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تاہم تیسرے جزء پر اس موضوع کو مکمل کر دینے کا حتمی ارادہ تھا مگر سعیِ بلیغ کے باوجود ناکام رہا اور اس تیسری جلد پر بھی حدِ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور چوتھی جلد کے اضافہ پر مجبور ہونا پڑا جو عنقریب انشاء اللہ ہدیہ ناظرین ہوگی۔

قصص القرآن کا یہ تیسرا حصہ ہدیۂ ناظرین ہے پہلے اور دوسرے حصہ کی افادیت اور قدیم وجدید علمی طبقوں میں ان کی مقبولیت، خدائے برتر کا وہ فضل وکرم ہے جس کے اظہارِ شکر کے لئے میرے قلب و زبان دونوں قاصر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی اس جدید ترتیب وتدوین کے ساتھ اہلِ علم کا شغف مصنف کی محنت وکاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ قرآنِ عزیز کی برکت وعظمت کا ثمرہ ہے مسلمانوں کا کلامِ الٰہی کے ساتھ والہانہ ذوق اگر اس محنت کو مفید اور پسندیدہ سمجھتا اور اس کاوش کو بہ نظرِ استحسان دیکھتا ہے تو فالحمد للہ علی ذالک وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

قصص القرآن کے اس تیسرے جزء میں وہ تمام تاریخی واقعات سپردِ قلم ہوئے ہیں جو انبیاء علیہم السلام

کی سیرتِ طیبہ اور ان کی رشد و ہدایت کے سلسلہ میں قرآنِ عزیز نے عبرت و بصیرت اور پند و موعظت کے لیے بیان کیے ہیں۔

ان میں بعض وہ واقعات ہیں جن کے متعلق حریف اہلِ قلم خصوصاً متعصب مستشرقین یورپ "اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" کہکر ان کو بے سروپا داستان اور غیر تاریخی قصے ظاہر کرتے ہیں۔

اس لئے ان کے علی الرغم صحیح اور مستند اسلامی و غیر اسلامی تاریخی نقول کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ یہ وقائع تاریخی حقائق ہیں۔ اور ان کا انکار علمی حقائق کا انکار ہے۔ اس سلسلہ میں ذوالقرنین۔ اصحاب الکہف والرقیم۔ اصحاب الرس اور اصحاب الفیل کے واقعات خصوصی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآنِ عزیز تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایتِ ثقلین کے لئے معاد و معاش کا مکمل نظام اور دین و دنیا کی رشد و ہدایت کا قانونِ کامل ہے اس لئے اس نے قوموں کے عروج و زوال اور مبدء وانجام سے متعلق اسی قدر حصہ بیان کیا ہے جو اس کے مقصدِ تذکیر و موعظت کیلئے مناسب تھا لیکن جب ایک تاریخِ عالم کا طالب علم ان قوموں کی تاریخ کا مکمل مطالعہ کرتا یا صفحاتِ عالم پر ان کے آثار و نشانات کو دیکھتا اور پڑھتا ہے تو اس کو بے ساختہ یہ اقرار کرنا ہوتا ہے کہ قرآن نے ان اقوام کے متعلق جو کچھ بھی کہا ہے سرتاسر حقیقت اور ان کے حیاتِ ماضی کا صحیح مرقع ہے۔

اور ان میں بعض واقعات وہ بھی ہیں جو درحقیقت ایک "مثال" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی قرآن نے ان کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ موعظت و نصیحت کی جس نوع کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے والوں کی یہ "مثال" ہے اور ظاہر ہے کہ "مثال" کے لئے واقعہ کا پیش آنا ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ وہ واقعہ کی شکل ہی میں کیوں نہ پیش کی جائے اور یہ حقیقت کسی بھی زبان کے فصیح و بلیغ ادیب سے مستور نہیں ہے اور وہ جانتا ہے کہ مثال کا یہ طریقہ موعظت و نصیحت کے لئے کس درجہ مفید اور دل نشین ہوتا ہے؟ مگر بعض مفسرین نے ان واقعات کو بھی ماضی میں ہو گذرے واقعات کے سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے لہٰذا ہم نے ایسے مواقع پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اس واقعہ کی حقیقت ایک "مثال" سے زیادہ نہیں ہے

لیکن اگر کوئی شخص اس کو واقعاتِ ماضی کی ہی ایک کڑی سمجھتا ہے، تب بھی اُن واقعات کو واقعات تسلیم کر لینے میں نہ کسی اجنبی بات کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور نہ ایسے واقعات کا غیر تاریخی ہونا ان کے "مثال" بننے میں حارج ہو سکتا ہے مثلاً "مومن و کافر" یا "اصحاب الجنہ۔ باغ والوں کا واقعہ" کہ قرآن کا مقصد ان کے بیان کرنے سے صرف حسب حال ایک "مثال" دینا ہے خواہ وہ ماضی میں ہو گذرا واقعہ ہو یا نہ ہو۔

قصص القرآن کے دوسرے اجزاء کی طرح اس جزء میں بھی واقعات کے تاریخی حقایق و مطالب کو روشنی میں لانے کے علاوہ ان سے متعلق "تفسیری و حدیثی مباحث" اور "تحقیقی مباحث" پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان سے حاصل شدہ نتائج و ثمرات کو "بصائر و عبر" اور "مواعظ و بصائر" کے مختلف عنوانات سے بیان کیا گیا ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کا حقیقی مقصد قرآنی "عبرت و بصیرت" ہی ہے۔

موضوعِ کتاب سے متعلق واقعات کو اس طرح زیر بحث لانے سے آپ کو یہ حقیقت جگہ جگہ ابھری ہوئی نظر آئے گی کہ مستشرقینِ یورپ نے کہ جن کی ریسرچ اور فلسفۂ تاریخ کی موشگافیوں سے ہم بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں، کس طرح فلسفۂ تاریخ کے نام پر اپنے مخالف واقعات کو غیر تاریخی ظاہر کرنے اور اپنے موافق واقعات کے غیر تاریخی پہلوؤں کو کس طرح تاریخی حیثیت دینے کی سعی کی ہے اور پھر اس زہرِ ہلاہل کو کس خوبصورتی سے "تریاق" کی شکل میں پیش کیا ہے؟

ان اہم خصوصیات کے علاوہ اپنے دوسرے اجزاء و مجلدات کی طرح یہ جلد بھی حسب ذیل خصوصیات کی حامل ہے۔

(۱) کتاب میں تمام واقعات کی اساس و بنیاد قرآنِ عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث و مستند تاریخی واقعات سے ان کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

(۲) کتبِ عہدِ قدیم اور قرآنِ عزیز کے "یقینِ محکم" کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے، تو یا روشن دلائل و براہین کے ذریعہ دونوں کے درمیان تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر

قرآنِ عزیز کی صداقت کو واضح براہین اور مُسکت دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

(۳) اسرائیلی روایات کی خرافت اور معاندین کے اعتراضات کی بطالت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

(۴) تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور ان سے متعلق مباحث و اشکالات پر بحث و نظر کے بعد سلفِ صالحین کے مسلکِ قویم کے مطابق ان کی تحقیق اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

(۵) واقعہ کا ذکر قرآن میں کتنی جگہ ہوا ہے اس کو دورانِ بحث میں بیان کر دیا گیا ہے۔

مصنف کو ان خصوصیات کے متعلق کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ اصحابِ نظر اور اہلِ ذوق کی صوابدید پر ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ وھو حسبی ونعم الوکیل۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی

شعبان ۱۳۶۳ھ

(د۔ ج۔ م)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصحاب الجنّۃ

سورۂ القلم اور اصحاب الجنّہ۔ واقعہ سے متعلق اقوال
تشریح ، موعظت

سورۃ القلم اور اصحاب الجنّہ

سورۂ القلم میں اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کے حسب حال ایک مثال بیان فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جس طرح باغ والوں نے خدا کی نعمت کو ٹھکرایا اور اُس کا حق ادا کرنے کے لیے شکرِ نعمت نہ کیا اسی طرح مکہ کے مشرکین کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث فرما کر اُن پر اپنی نعمتِ کاملہ کا اظہار فرمایا اور اُن کے ارشاد وہدایت کے لیے ہادیٔ اعظم بھیج کر عظیم الشان احسان کیا لیکن اُنہوں نے اس کی کوئی قدر نہ کی اور انکار و مخالفت کے ساتھ اس نعمت کو رد کرنے لگے تو اب ان کا بھی وہی نتیجہ ہونے والا ہے جو باغ والوں کا ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ — بے شبہ ہم نے اُن (کفارِ مکہ) کو اسی طرح آزمایا ہے جس طرح
إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ — باغ والوں کو آزمایا جبکہ اُنہوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم
وَلَا يَسْتَثْنُونَ فَطَافَ عَلَيْهَا — صبح ہوتے ان (کے پھلوں) کو کاٹ لینگے اور وہ ان شاء
طَائِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ — اللہ بھی نہ کہتے تھے، پس ابھی وہ سو ہی رہے تھے کہ (اُن
فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ فَتَنَادَوْا — کے باغ پر) تیرے پروردگار کی جانب سے پھرنے والا
مُصْبِحِينَ أَنِ اغْدُوا عَلٰى حَرْثِكُمْ — پھر گیا (یعنی عذاب الٰہی سے وہ باغ برباد ہو گیا) پس

إِنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ ۝ فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ۝ أَنْ لَا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِسْكِينٌ ۝ وَغَدَوْا عَلَى حَرْدٍ قَادِرِينَ ۝ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُّونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ ۝ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طَاغِينَ ۝ عَسَى رَبُّنَا أَنْ يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِنْهَا إِنَّا إِلَى رَبِّنَا رَاغِبُونَ ۝ كَذَلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

(القلم)

صبح کو ایسا ہو گیا گویا جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا گیا ہے۔ (صبح ہوئی) تو انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر کھیتی کاٹنا چاہتے ہو تو سویرے چلے چلو اور وہ چلتے چلتے آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے کہ (جلدی کرو) ایسا نہ ہو کہ کاٹتے وقت تم کو فقیر آگھیریں، اور اپنے بخل کی وجہ سے بہت سویرے باغ (کھیت) پر پہنچے اندازہ لگا کر (کہ اس وقت تک فقیر نہ پہنچ سکیں گے) پس جب اس کو (اس حال میں) دیکھا تو کہنے لگے یقیناً ہم راہ بھول گئے ہیں (یہ وہ مقام نہیں ہے) مگر جب غور سے دیکھا تو کہنے لگے) بلکہ ہم (باغ کے نفع سے) محروم رہ گئے، ان میں سے ایک بھلا آدمی نے کہا: "کیا میں نے تم سے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ (اس نعمت الٰہی پر) کیوں خدا کی پاکی بیان نہیں کرتے (اب انجام بد کے بعد) کہنے لگے ہمارے پروردگار کے لیے پاکی ہے بیشک ہم نے خود ہی اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے (یہ کہہ کر تم نے ہی ہم کو پہلے سے کیوں نہ سمجھایا) اور کہنے لگے ہائے بدقسمتی! بلا شبہ ہم سرکش تھے جلد توقع ہے کہ ہمارا پروردگار ہم کو اس سے بہتر بدل عطا فرمائے بے شبہ (اب) ہم اپنے پروردگار ہی کی جانب متوجہ ہیں۔ (اے مکہ والو!) خدا کا عذاب اسی طرح (اچانک) آجاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی ہولناک ہے کاش کہ وہ جان لیتے۔

واقعہ سے متعلق اقوال | حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ یہ کفار مکہ کے حالات

کے مناسب قرآن نے ایک مثال دی ہے کوئی واقعہ نہیں ہے[1] اور سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے جو یمن کی ایک بستی ضروان میں پیش آیا جو کہ صنعاء سے چھ میل پر واقع تھی[2] چنانچہ مفسرین نے اس واقعہ کی تفصیل یہ بیان فرمائی ہے۔

اہل کتاب میں سے ایک شخص بہت مالدار، صاحب زمین واملاک اور مرد نیک تھا، اپنی پیداوار میں سے فقراء و مساکین پر کافی خرچ کرتا رہتا تھا، اُس کا جب انتقال ہوگیا تو اس نے چند لڑکے وارث چھوڑے، جب پھلوں اور کھیتیوں کے کاٹنے کا وقت آیا تو ان لڑکوں نے آپس میں کہا: "ہمارا باپ تو بہت ہی بے وقوف تھا کہ اپنی یہ کثیر دولت فقراء و مساکین میں لٹا دیتا تھا، ہم ایسے پاگل نہیں ہیں کہ اپنی محنت کو اس طرح رائیگاں کردیں اور صلاح یہ ٹھہری کہ پھل اُتارنے اور کھیتی کاٹنے کے لیے مُنہ اندھیرے چلو اور اتنی عجلت کرو کہ فقراء اور مساکین کو معلوم ہی نہ ہوسکے کہ وہ کھیتوں پر آکر ہم کو تنگ کریں۔

یہاں تو یہ خدا نا ترس بخیل یہ مشورہ کر رہے تھے کہ ساری دولت کو ذخیرہ کرکے "کنز" بنالیں اور اس میں سے نہ خدا کا حق ادا کریں اور نہ خدا کے بندوں کا اور دوسری جانب خدا کے حکم سے رات ہی میں اُن کی تمام سرسبز و شاداب کھیتی اور باغ تیز اور گرم ہوا سے جل کر خاک ہوگئے اب جو مشورہ کے مطابق یہ منہ اندھیرے وہاں پہنچے تو معاملہ دگرگوں پایا تو کچھ نہ سمجھے اور آگے نکل گئے کہ شاید یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے مگر دوسرے نشانات دیکھ کر چونکے اور اب سمجھے کہ یہ ہمارے بخل اور مشورہ کا نتیجہ ہے جو ہم نے شب گذشتہ میں حکم الٰہی کے خلاف غریبوں اور مسکینوں کا حق تلف کرنے کے لیے کیا تھا۔ اب حسرت سے بدقسمتی کا شکوہ کرنے اور خدا کو پکارنے لگے، مگر وقت نکل جانے اور پاداش عمل پالینے کے بعد یہ پکار بے سود ثابت ہوئی

تشریح | یہ مثال ہو یا واقعہ قرآن عزیز نے اس کے بیان میں تذکیر و تنذیر کا جو پہلو رکھا ہے وہ بہرحال اپنی جگہ ہے۔ اس لیے کہ ان آیات سے قبل قریش مکہ کی نافرمانیوں اور رسول اللہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۃ القلم [2] ایضاً

صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے انکار اور کفران کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ان کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کی بداعمالیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اب اُن کو ایک مثال دے کر یا واقعہ سُنا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور خدا کی نعمت (قرآن) کے خلاف باہم سرگوشیاں کرنے، قرآن کی عطا کردہ تعلیم متعلق حقوق اللہ و حقوق العباد سے گریز کر کے اپنی قوت و شوکت پر اترانے اور گھمنڈ کرتے ہوئے پیغمبر معصوم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تحقیر کرنے کا انجام وہی ہونے والا ہے جو "باغ والوں" کا ہوا۔ اور یہ اس لیے کہ اوّل خدا کی جانب سے قانونِ امہال (مہلت دینے کا قانون) متکبروں کو ڈھیل دیتا اور اصلاحِ حال کے لیے موقعہ عطا کرتا ہے مگر جب کوئی قوم اُس سے فائدہ نہیں اُٹھاتی بلکہ خدا کی اس مہلت کو اپنی باطل پرستی کے لیے صداقت کی دلیل ٹھہرا کر صادقین اور اُن کی صداقت کی تحقیر و تذلیل پر آمادہ ہو جاتی ہے تو پھر اچانک قانونِ گرفت اپنا سخت پنجہ اُن پر جما دیتا اور اُن کو ہلاک و برباد کر کے کائنات کی عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کر دیتا ہے، پھر اس وقت نہ حسرت کام آتی ہے نہ ندامت اور اس گھڑی نہ ایمان لانا مفید ہوتا ہے اور نہ خدا کی انقیاد و اطاعت کا اعلان۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِكَ — اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو ایسا ہوتا ہے کہ

قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا — اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (یعنی وحی کے ذریعہ

فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ — پیغامِ حق پہنچا دیتے ہیں)، پھر وہ بجائے اس کے کہ اس کی تعمیل کریں

عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا — نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں، پس ان پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی

تَدْمِيرًا ۝ (نحل) — ہے اور (پاداشِ عمل) میں ہم انہیں برباد و ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

موعظت اللہ تعالیٰ نے اس کائناتِ ہست و بود میں انسان کو اجتماعی حیات کے لیے پیدا کیا ہے اور حاجاتِ انسانی کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ یہ کارخانہ باہمی اشتراک و اعانت کے بغیر نہیں چل سکتا اور چونکہ اجتماعی زندگی افراد ہی سے بنتی اور سنورتی ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ اُن کی نشو و نما اور بقاءِ حیات کا ایسا قانون مقرر کیا جائے

جس کی بدولت افرادِ انسانی کے درمیان رشتۂ اخوت و مودت قائم ہو سکے اور کسی قسم کی رقابت اور تنافس پیدا نہ ہونے پائے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے اس نظام کی تکمیل کے لیے معاشی زندگی سے متعلق دو حقوق مقرر فرمائے ایک حقِ معیشت اور دوسرا درجاتِ معیشت

حقِ معیشت کا قانون یہ ہے کہ اس عالم میں ایک جاندار بھی ایسا نہیں رہنا چاہیے کہ جو حقِ معیشت سے محروم ہو، یہ ہر شخص کا انفرادی حق ہے کہ وہ زندہ رہے اس لیے حقِ معیشت میں یہاں سب مساوی ہیں اور کسی کو کسی پر تفوق و برتری حاصل نہیں۔

دوسرا درجاتِ معیشت کا مسئلہ ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ معاشی زندگی کے لیے سب کو ملے، مگر یہ ضروری نہیں کہ سب کو برابر ملے واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق لیکن درجاتِ معیشت کی اس کمی و بیشی اور تفاضل کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب اُس کا انفرادی حق ہے، نہیں، بلکہ جو جس قدر زیادہ کمائیگا اُسی قدر اُس کی دولت میں اجتماعی حق زیادہ ہوگا اور پھر یہ اجتماعی حق دو قسم پر تقسیم ہو جاتا ہے ایک حق اللہ اور دوسرا حق العباد۔ پس جو شخص اپنی دولت و ثروت کو صرف انفرادی ملک سمجھتا اور اُس میں حق اللہ اور حق العباد دونوں کا انکار کرتے ہوئے اُس کے نشہ میں مست ہو کر احکام الٰہی سے بے پروا ہو جاتا ہے اُس کا انجام کبھی بخیر نہیں ہوتا اور وہ خدا کے غضب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ	اور جو لوگ چاندی سونا اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے
الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ	رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اُسے خرچ نہیں کرتے
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ	تو ایسے لوگوں کو عذاب دردناک کی خوش خبری
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝	سُنا دو!

ولید بن مغیرہ اور قریشی سرداروں کو خدا نے ہر قسم کی نعمتیں عطا فرمائی تھیں اور پھر ان مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرما کر اُن کی روحانی نعمت کو بھی کامل و مکمل کر دیا تھا، لیکن اُن بدبختوں نے شکر ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کیا آخر

نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح باغ والے اپنے باغ کی نعمتوں سے محروم ہوگئے اسی طرح کفارِ مکہ بھی مادی اور روحانی نعمتوں سے محروم ہو کر ابدی ذلت و خسران کے ماسوا اور کچھ نہ پا سکے فاعتبروا یا اولی الابصار

مؤمن وکافر

سورۂ کہف اور مومن وکافر کا مذاکرہ، واقعہ کی تشریح

بصائر

سورۂ کہف اور مومن وکافر کا واقعہ

اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں اصحابِ کہف کے واقعہ کے بعد ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، یہ واقعہ دو انسانوں کے درمیان مناظرانہ گفتگو کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی اُس کا نتیجہ اور ثمرہ بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک کا طریقِ زندگی مآل کے اعتبار سے کامیاب رہا اور دوسرے کو ندامت و حسرت کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

اس کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو مثال کے طور پر کفارِ مکہ اور مسلمانوں کی جماعت کے حالات کو سامنے رکھ کر تذکیر اور نصیحت کے لیے بیان کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس طرح کا واقعہ درحقیقت دو آدمیوں (مؤمن وکافر) کے درمیان زمانۂ ماضی میں پیش آیا تھا۔

اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ جس طرح اصحابِ کہف کا واقعہ پیش آیا ہے اسی طرح نزولِ قرآن سے قبل دو انسانوں کے درمیان یہ واقعہ بھی پیش آیا ہے اور قرآن نے ان دونوں واقعات کو مشرکینِ مکہ کی تذکیر و تنذیر کے لیے بیان کیا ہے۔

قرآنِ عزیز نے جس انداز میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کتبِ احادیث و سیر اور تاریخ میں اس سے زیادہ کچھ اور موجود نہیں ہے لہٰذا وہی قابلِ مراجعت ہے۔

اور (اے پیغمبر) لوگوں کو ایک مثال سنا دو۔ دو آدمی تھے	وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ
ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ مہیا	جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ
کر دیے، گرداگرد کھجور کے درختوں کا احاطہ تھا، بیچ کی	مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا
زمین میں کھیتی تھی۔ پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے	بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝
لدگئے اور پیداوار میں کسی طرح کی بھی کمی نہ ہوئی ہم نے	كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا
ان کے درمیان (آبپاشی کے لیے) ایک ندی جاری	وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا
کر دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آدمی دولتمند ہو گیا۔ تب ایک دن	خِلَالَهُمَا نَهَرًا ۝ وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ
گھمنڈ میں آکر اپنے دوست سے (جسے خوشحالیاں میسر نہ تھیں)	فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ
باتیں کرتے کرتے بول اٹھا "دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار	أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَأَعَزُّ
ہوں، اور میرا جتھا بھی بڑا طاقتور جتھا ہے" پھر وہ (یہ باتیں	نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ
کرتے ہوئے) اپنے باغ میں گیا، اور وہ اپنے ہاتھوں	ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ
اپنا نقصان کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ	أَنْ تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا ۝ وَمَا أَظُنُّ
ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے۔ مجھے توقع نہیں	السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُدِدْتُ
کہ قیامت کی گھڑی برپا ہو گی اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں	إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِنْهَا
اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو میرے لیے کیا کھٹکا	مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ
ہے، مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانا ملیگا" یہ	وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي
سن کر اس کے دوست نے کہا، اور باہم گفتگو کا سلسلہ	خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ
جاری تھا "کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں	نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ۝
پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا، اور پھر آدمی بنا کر	لَٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ
نمودار کر دیا؟ لیکن میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ	بِرَبِّي أَحَدًا ۝ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ
میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک	جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ

لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ إِنْ تَرَنِ
أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا
فَعَسٰى رَبِّيْ أَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا
مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ
عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ أَوْ
يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ
تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝ وَأُحِيْطَ
بِثَمَرِهٖ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ
عَلٰى مَآ أَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ
خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ
يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ أُشْرِكْ
بِرَبِّيْٓ أَحَدًا وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ
فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝
هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ
هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝

نہیں کرتا۔ اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اُس کی
شادابیاں دیکھیں) تو کیوں تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے
جو اللہ چاہتا ہے۔ اُس کی مدد بغیر کوئی کچھ نہیں کرسکتا؟ اور
اور یہ جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے کہ میں تم سے مال اور اولاد
کمتر رکھتا ہوں، تو (اس پر مغرور نہ ہو) کیا عجب ہے میرا پروردگار
مجھے تمہارے اس باغ سے بھی بہتر باغ (جنت) دے دے
اور تمہارے باغ پر آسمان سے ایسی اندازہ کی ہوئی بات
اُتار دے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے۔ یا پھر (بربادی
کی کوئی اور صورت نکل آئے۔ مثلاً) اس کی نہر کا پانی
بالکل نیچے اُتر جائے اور تم کسی طرح بھی اُس تک نہ پہنچ
سکو" اور پھر (دیکھو) ایسا ہی ہوا کہ اُس کی دولت (بربادی
کے) گھیرے میں آگئی، وہ (ہاتھ مل مل کر افسوس کرنے لگا کہ ان
باغوں کی درستگی پر میں نے کیا کچھ خرچ کیا تھا وہ سب برباد
ہوگیا) اور باغوں کا یہ حال ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر
ہوگئیں۔ اب وہ کہتا ہے "کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ
کسی کو شریک نہ کرتا"، اور دیکھو کوئی جتھا نہ ہوا کہ اللہ کے سوا اس
کی مدد کرتا، اور نہ خود اس نے یہ طاقت پائی کہ بربادی سے جیت
سکتا۔ یہاں سے معلوم ہوگیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی
کے لیے ہے۔ وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا ہے اور اسی کے ہاتھ
بہتر انجام ہے۔

واقعہ کی تشریح | ان آیات سے قبل یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جو لوگ منکر ہیں اُن کے لیے جہنم کی آگ ہے

اور جو مومنین ہیں اُن کے لئے ہمہ قسم کی خوش عیشیاں اور ابدی باغ (جنت) ہی، اس کے بعد آیاتِ زیرِ بحث میں یہ کہا جا رہا ہی کہ جو منکرین ہیں اُن کے لیے صرف آخرت ہی کی محرومیاں نہیں ہیں بلکہ وہ اس دنیا میں بھی عنقریب ناکامیوں اور بدبختیوں سے دوچار ہونے والے ہیں۔ اُن کا یہ گھمنڈ" کہ اُن کو ہر قسم کی رفاہیت اور خوش عیشی حاصل ہی اور وہ مال و دولت کے مالک ہیں اور اُن کا جتھا بھی بہت طاقتور ہی" بہت جلد خاک میں ملجانے والا ہی اور مومن اپنی موجودہ تنگ حالی پر دلگیر اور بددل نہ ہوں کہ وقت آپہنچا ہی کہ اُن کی یہ بیچارگی و بے بسی ہمہ قسم کی عزت و طاقت سے بدل جائیگی۔ نیز یہ کہ دنیا کی خوش عیشی چلتی پھرتی چھاؤں ہی اس پر بھروسہ بے کار ہی وہ جب مٹنے پر آتی ہی تو لمحوں کی بھی دیر نہیں لگتی اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اُس کو نہیں بچا سکتی۔

چنانچہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے یہ مثال دی کہ یوں سمجھو، کسی جگہ دو آدمی تھے ایک کو خدائے تعالیٰ نے دنیوی عیش و عشرت کے کل سامان دے رکھے تھے اور دوسرا تنگدست اور پریشان حال تھا، مگر جو مالدار تھا وہ خدا کا منکر اور دولت کے نشہ میں چور اپنے نادار دوست سے غرور و نخوت کے ساتھ یہ کہتا رہتا کہ میری یہ دولت و حشمت پائدار ہی کوئی طاقت نہیں کہ اس کو مجھ سے چھین لے، اور ایک تو ہی کہ افلاس اور تنگی میں بسر کر رہا ہی۔ مفلس دوست اگرچہ تنگدست تھا مگر خدائے برتر کا سچا پرستار تھا، اُس نے جواب میں کہا" اپنی دولت کے نشہ میں اس درجہ مغرور نہ ہو، کون جانتا ہی کہ لمحوں میں کیا سے کیا ہو جائے اور کس کو خبر ہی کہ وہ مجھ کو اُن بخشائشوں سے نواز دے جس پر آج تو غرور کر رہا ہی؟ آخر کار یہی ہوا کہ اُس کے وہ تمام باغ جن کی شادابیوں اور عطر بیزیوں پر اُس کو گھمنڈ تھا اچانک جل بھن کر خاک ہو گئے اور کل جہاں چمن زار تھا آج وہاں ویرانی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔

اس مثال میں حق تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کی جماعت سے متعلق وہی نقشہ

کھینچا ہے جو عرب کے ماحول کے ٹھیک ٹھیک مطابق تھا، کیونکہ اُن کے یہاں اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہ تھی کہ تاکستان کے بہتر سے بہتر باغ ہوں، اُن کے چاروں طرف کھجور کے گنجان درخت لگے ہوں، درمیان میں نہر ہو اور نہر کے اردگرد سرسبز و شاداب کھیتیاں ہوں اور یہ سب کچھ مشرکینِ مکہ کو میسر تھا اور مسلمان اُس وقت ان ظاہری نعمتوں سے محروم تھے

بہرحال یہ واقعہ ہو یا مثال، تذکیر و تنذیر کے جس مقصد کی خاطر بیان کی گئی ہے اُس کے پیشِ نظر مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کے باہمی تقابل کا نہایت ہی جامع اور کامل نقشہ ہے، قریشِ مکہ کے غرور و نخوت کا یہ حال تھا کہ اوّل تو پیغامِ ہدایت پر کان ہی نہ دھرتے تھے اور اگر کبھی سُننے پر آمادگی ظاہر بھی کرتے تو یہ شرط لگاتے کہ جب تک ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھیں اُس وقت تک ان خستہ حال مسلمانوں میں سے کوئی ہمارے برابر آکر نہ بیٹھے کیونکہ ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری سخت توہین ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری یہ دولت و حشمت غیر فانی اور ہمارا یہ کرّو فر ابدی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو کمزور اور تنگ دست دیکھ کر اُن کا مضحکہ کرتے اور حقیر و ذلیل سمجھتے تھے

پس قرآن عزیز نے لطیف اور معجزانہ اسلوب کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں ایسے ناسازگار حالات کے وقت اُن کی کامرانی اور مشرکین کی ناکامی کے اُس انجام کی خبر دی ہے، جو کچھ عرصہ بعد ہونے والا تھا، چنانچہ جو سعید روحیں تھیں اُنہوں نے سمجھا اور حق کی آغوش میں خود کو سپرد کر دیا اور جن کی شقاوت و بدبختی پر مہر لگ چکی تھی اُن کا تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ حسرتناک انجام ہوا جس کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے "خسر الدنیا والاخرۃ ذٰلک ھو الخسران المبین"

اور شاہ عبدالقادر (رحمہ اللہ) ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں

"پہلے وقت میں ایک شخص مالدار مرگیا، دو بیٹے رہے برابر مال بانٹ لیا۔ ایک نے زمین خریدی دو طرف میووں کے باغ لگائے بیچ میں کھیتی اور ندی کاٹ کر ان میں لاڈالی کہ مینہ نہ ہو تو بھی نقصان

دادے اور عمدہ جگہ بیاہ کیا، اولاد ہوئی اور نوکر رکھے، تدبیرِ دنیا درست کرکر آسودہ گذران کرنے لگا۔ دوسرے نے سب مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا، آپ قناعت سے بیٹھ رہا"[1]

معلوم نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے واقعہ کی یہ تفصیل کہاں سے اخذ فرمائی ہے کتبِ سیر و روایات اور تاریخ کے اوراق تو اس بارہ میں خاموش ہیں اور "چھوٹا منہ بڑی بات" حضرت شاہ صاحب نے اس واقعہ میں جس طرح دونوں کا تقابل ظاہر فرمایا ہے قرآن کا ظاہر سیاق اُس کی تائید نہیں کرتا، اس لیے کہ مردِ مومن نے کافر کے غرور کا جو جواب دیا اور کافر نے جو اُس کے افلاس پر طعنہ دیا وہ ہرگز اس صورتِ حال کے مناسب نہیں ہیں کہ مومن حقیقۃً مالدار تھا مگر اُس نے اپنا سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو مومن کافر کے سوال وجواب کا اسلوب دوسرا ہی ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب!

بصائر (۱) دنیوی نعمتیں دو گھڑی کی دھوپ اور چار دن کی چاندنی ہیں، ناپائدار اور فانی، پس عقلمند وہ ہی جو ان پر گھمنڈ نہ کرے اور ان کے بل بوتہ پر خدا کی نافرمانی پر آمادہ نہ ہو جائے اور تاریخ کے اُن اوراق کو پیشِ نظر رکھے جن کی آغوش میں فرعون، نمرود، ثمود، اور عاد کی قاہرانہ طاقتوں کا انجام آج تک محفوظ ہے۔

سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝ — زمین کی سیر کرو اور پھر دیکھو کہ نافرمانوں کا انجام کیا ہوا؟

(۲) حقیقی عزت ایمان باللہ اور عمل صالح سے بنتی ہے، دولت و ثروت اور سطوت و حشمتِ دنیوی سے حاصل نہیں ہوتی، قریش مکہ کو ثروت و سطوت دونوں حاصل تھیں مگر بدر کے میدان میں ان کے انجامِ بد اور دین و دنیا کی رسوائی کو کوئی روک نہ سکا، مسلمان دنیا کے ہر قسم کے سامانِ عیش سے محروم تھے مگر ایمان باللہ اور عمل صالح نے جب ان کو دینی و دنیوی عزت و حشمت عطا کی تو اُس میں کوئی حائل نہ ہو سکا۔

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ — حقیقی عزت اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کے لیے

[1] موضح القرآن

الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ ہی ہے مگر منافقین اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔

(۳) مومن کی شان یہ ہے کہ اگر اُس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نعمتوں سے نوازا ہے تو غرور اور تکبر کی بجائے درگاہِ الٰہی میں جبینِ نیاز جھکا کر اعترافِ نعمت کرے اور دل و زبان دونوں سے یہ اقرار کرے کہ خدایا! اگر تو یہ عطا نہ فرماتا تو ان کا حصول میری اپنی قوت و طاقت سے باہر تھا یہ سب تیرے ہی عطا و نوال کا صدقہ ہے۔ ولولا اذ دخلت جنتك قلت ماشاء الله لا قوة الا بالله ۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ الکنز من کنوز الجنة لا حول ولا قوة الا بالله ۔ جنت کے پوشیدہ خزانوں میں سے ایک خزانہ یہ ہے کہ بندہ اعتراف کرے کہ بھلائی کرنے کی طاقت اور بُرائی سے بچنے کی قوت اللہ کی مدد کے بغیر ناممکن ہے" یعنی جس شخص نے زبان سے اس کا اقرار کیا اور دل میں اس حقیقت کو جاگزین کر لیا اُس نے گویا جنت کے مستور خزانوں کی کنجی حاصل کر لی۔

اس کے برعکس کافر کی حالت یہ ہے کہ اُس کو جب دولت و ثروت اور جاہ و جلال میسر آجاتے ہیں تو خودی میں آکر مغرور ہو جاتا ہے اور جب کوئی خدا کا نیک بندہ اُس کو سمجھاتا ہے کہ یہ سب خدا کا فضل ہے اُس کا شکر ادا کر تو وہ اکڑ کر کہتا ہے" اوتیتہ علی علم من عندی ۔ یہ خدا کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ میری اپنی دانائی اور علم کا نتیجہ ہے"

پس مؤمن اور کافر کے لیے خدا کی جانب سے بھی الگ الگ جواب ملتا ہے۔ جن کو سورۂ مومنون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ	کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم مال اور اولاد سے اس لیے اُن
مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ	کی امداد کر رہے ہیں کہ بھلائی پہنچانے میں سرگرمی دکھائیں انہیں
لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا	مگر وہ شعور نہیں رکھتے (کہ ان کے بارہ میں حقیقت حال دوسری
يَشْعُرُوْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ	ہے یعنی قانون امہال کام کر رہا ہے) اور جو لوگ اپنے پروردگار کے
مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ	خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، جو اپنے پروردگار کی نشانیوں

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ	پر یقین رکھتے ہیں جو اپنے پروردگار کے ساتھ کسی ہستی
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝	کو شریک نہیں ٹھہراتے، جو اس کی راہ میں جتنا کچھ
وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ	دے سکتے ہیں، بلا تامل دیتے ہیں اور پھر بھی ان کے
وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝	دل ترساں رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور لوٹنا
اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ	ہے، تو بلاشبہ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لیے تیز گام ہیں
وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝	اور یہی ہیں جو اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں۔

(۴) سعید وہ ہے جو انجام سے قبل حقیقتِ انجام کو سوچ لے اور انجام کار سعادتِ ابدی و سرمدی پائے اور شقی و بدبخت وہ ہے جو انجام پر غور کیے بغیر اول غرور و نخوت کا اظہار کرے اور اس انجام بد کو دیکھنے کے بعد ندامت و حسرت کا اظہار کرے اور یہ ندامت و حسرت اس وقت کچھ کام نہ آئے۔ چنانچہ اس واقعہ یا مثال میں بھی منکر کو وہی شقاوت پیش آئی۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ	اور اس کی دولت (ثمرات) گھیرے میں آگئی اور جبکہ اس کے
يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ	باغ کی ٹٹیاں زمین پر گر کے برابر ہوگئیں تو ہاتھ مل مل کر کہتا
فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا	رہ گیا "افسوس میں نے ان پر کتنی کثیر دولت صرف کی تھی وہ
وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ	سب برباد ہوگئی" اور حسرت کے ساتھ کہتا تھا "کاش کہ میں
بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝	اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا۔

اور یہی روز بد فرعون کو دیکھنا پڑا کہ وقت گذرنے پر اس نے وہی کہا کہ اگر عذاب کے مشاہدہ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت مان لیتا تو اس دردناک عذاب کی نذر نہ ہوتا۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ	یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے اب کہا میں
قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا	اقرار کرتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں ہے سوا اس ایک ذات کے
الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَ	جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے
اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ آٰلْئٰنَ	ہوتا ہوں۔ (اللہ نے جواب دیا) اور اس سے پہلے نافرمانی

وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ؟ کرتا رہا اور تو فسادیوں میں سے تھا۔

اصحابُ القریہ (یا) اصحابِ یٰسین

اصحابِ قریہ اور قرآن عزیز، واقعہ، واقعہ سے متعلق اقوال،
نقد و تبصرہ، موعظت

اصحابِ قریہ اور قرآنِ عزیز قرآنِ عزیز (سورۂ یٰسین) میں ایک بہت ہی مختصر واقعہ مذکور ہے جو آیت "واضرب لھم مثلاً اصحاب القریۃ" سے شروع ہو کر "فاذا ھم خامدون" پر ختم ہوتا ہے اور سورۃ کی نسبت سے اس کو "واقعہ اصحابِ یٰسین" اور آیات کے اسلوبِ بیان کے مطابق "واقعہ اصحابِ قریہ" کہتے ہیں۔

واقعہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کے متعلق صرف اس قدر بتایا ہے کہ گذشتہ زمانہ میں ایک بستی میں کفر و شرک اور شر و فساد کو دور کرنے اور رشد و ہدایت کا سبق دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو پیغمبروں کو مامور کیا، انہوں نے اہلِ قریہ کو حق کی تلقین کی اور صراطِ مستقیم کی جانب دعوت دی لیکن بستی والوں نے ان دونوں کو جھٹلایا تب ہم نے ایک ہادی کا اور اضافہ کر دیا اور وہ تین مل کر ایک جماعت ہو گئے۔ اب ان تینوں نے ان کو یقین دلایا کہ بے شبہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے ہیں مگر انہوں نے نہ مانا اور ان کا مذاق اڑایا کہ تم بھی آدمی اور ہم بھی آدمی پھر تمہارے اندر وہ کونسی عجیب بات ہے کہ تم پیغمبر بنا دیے گئے، یہ سب تمہارا جھوٹ اور تمہاری سازش ہے، انہوں نے کہا کہ خدا اس کا شاہد ہے کہ ہم جھوٹے نہیں وہ دانا و بینا اس کو خوب جانتا ہے مگر تم پھر بھی نہیں مانتے تو ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیں اور راہِ حق دکھا دیں۔ بستی والے کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں کہ تم نے خواہ مخواہ ہمارے یہاں آکر گڑبڑ پیدا کر دی اور اگر تم اس سے باز نہ آئے تو ہم تم تینوں کو مار ڈالیں گے

یا سخت قسم کی تکالیف میں مبتلا کر دینگے۔ اُنھوں نے جواب دیا: خدا کی نافرمانی کر کے نحوست تو تم خود اپنے اوپر لا چکے ہو، اس سے زیادہ نحوست اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم نصیحت اور خیر خواہی تک کو قبول نہیں کرتے بلکہ اور زیادہ حد سے گذرتے جاتے ہو!

بستی کے آخری کنارے پر ایک نیک مرد رہتا تھا اُس نے جب سُنا کہ بستی والے خدا کے رسولوں کو جھٹلا رہے اور طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے ہیں تو عجلت کے ساتھ وہاں آپہنچا جس جگہ یہ گفتگو ہو رہی تھی، اور کہنے لگا: اے قوم! خدائے تعالیٰ کے پیغمبروں کی پیروی کر ان مقدس لوگوں کی پیروی سے کیوں منہ موڑتی ہے جو تجھ سے اس خدمتِ حق کا کوئی معاوضہ تک نہیں طلب کرتے اور جو خدا رسیدہ اور ہدایت مآب انسان ہیں، بتاؤ میں کیوں اُس ایک خُدا کی ہی پرستش نہ کروں جس نے مجھ کو نیست سے ہست کیا ہے۔ اور مرنے کے بعد میں اور تم سب اُسی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔ تم جو ان برگزیدہ انسانوں کی تکذیب کر رہے ہو تو میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا مجھ کو خدائے واحد کے سوائے معبودانِ باطل کو اپنا خدا مان لینا چاہیے کہ اگر وہ ذاتِ واحد، جو نہایت ہی مہربان اور رحم والا ہے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ارادہ کرلے تو اِن معبودانِ باطل کی نہ سفارش کارگر ہو سکے اور نہ وہ اُس نقصان سے مجھ کو بچا سکیں؟ اگر تمہارا مقصد یہ ہے تو ایسی صورت میں بلاشبہ میں تو سخت گمراہی میں پھنس جاؤنگا، لہذا کان کھول کر سن لو کہ تم ان مقدس انسانوں کی بات مانو یا نہ مانو میں تو اُس ذات پر ایمان لے آیا جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔

قوم نے اپنی تکذیب اور مقدس رسولوں کی تصدیق میں نیک مرد کی یہ پُر از ہدایت گفتگو سُنی تو غیظ و غضب میں آگئی اور اُس کو شہید کر ڈالا۔

واقعہ کا اس حد تک ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے جرأتِ حق کی جزا میں اُس کو جنت عطا کی اور جب اُس نے اپنا پاک مقام آنکھوں سے دیکھ لیا تو وجد آفریں انداز میں کہنے لگا: کاش کہ میری قوم کے لوگ یہ جان سکتے کہ میرے پروردگار

نے مجھ کو مغفرت کا کیسا بیش بہا تحفہ عطا فرمایا اور میرا کس درجہ اعزاز و اکرام کیا" پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس مردِ نیک کی قوم کی بدکرداری پر اُن کو ہلاک کرنے اور سزا دینے کے لیے ہمیں آسمان سے کسی لشکر بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی فقط ایک ہولناک چیخ نے اُن سب کا کام تمام کر دیا اور وہ جہاں کے تہاں بجھ کر رہ گئے یہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید ان بدبختوں نے خدا کے رسولوں کو بھی شہید کر ڈالا تھا، جیسا کہ اُنھوں نے ان کو دھمکی دی تھی، اور اگرچہ قرآنِ عزیز میں یہ مذکور نہیں ہے مگر اس مردِ شہید کے ذکر کے بعد چونکہ ان رسولوں کا کوئی مذکور نہیں ہے اس لیے قرینہ یہی شہادت دیتا ہے

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ	(اے پیغمبر!) ان (مشرکینِ مکہ) سے بستی والوں کا واقعہ
الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ	بیان کر جبکہ اُن کے پاس خدا کے رسول آئے، جب یہ
إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ	صورت ہوئی کہ ہم نے اوّل اُن کے پاس دو بھیجے تھے
فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ	تو اُنھوں نے اُن کو جھٹلایا تب ہم نے ان دونوں کو
فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُمْ مُرْسَلُونَ	تیسرے کے ذریعہ سے قوت و عزت عطا کی، اب ان تینوں
قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا	نے بستی والوں سے کہا: "ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو خدا
وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِنْ شَيْءٍ	نے تمھارے پاس بھیجا ہے" بستی والوں نے کہا "بجز اس
إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝	بات کے کہ تم بھی ہماری طرح ایک انسان ہو کونسی ایسی
قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ	خوبی ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور رحمٰن نے تم پر کچھ بھی نازل
لَمُرْسَلُونَ ۝ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا	نہیں کیا اس لیے تم صاف جھوٹے ہو۔ ان تینوں نے کہا:
الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ قَالُوا إِنَّا	ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم یقیناً خدا کے فرستادہ ہیں
تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهُوا	اور ہمارے ذمہ صرف واضح اور صاف طور پر خدا کا پیغام
لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِنَّا	پہنچا دینا ہے زبردستی قبول کرا دینا ہمارا کام نہیں ہے بستی
عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ قَالُوا طَائِرُكُمْ	والے کہنے لگے ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں پس اگر تم اس تبلیغ

مَّعَكُمْ أَئِنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ أَنْتُمْ
قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ وَجَآءَ مِنْ
أَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى
قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ
اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا
وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ وَمَا لِيَ لَآ
أَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَإِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَأَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ
اٰلِهَةً إِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ
بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ
شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۝ إِنِّيْٓ
إِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝
إِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ
قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ
يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا
غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ
الْمُكْرَمِيْنَ ۝ وَمَآ أَنْزَلْنَا
عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ
جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا
مُنْزِلِيْنَ ۝ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً
وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝

سے باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دینگے اور سخت قسم کا
عذاب چکھائینگے۔ اُنہوں نے کہا: تمہاری نحوست تو
خود تمہارے ساتھ وابستہ ہے کہ تم کو جو نصیحت کی جاتی ہے
اُس کو نحوست کہتے ہو بلکہ تم تو حد سے گزر رہے ہو۔ اور
شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا
اور اُس نے کہا: "اے قوم! تم خدا کے رسولوں کی
پیروی کرو، اُن کی پیروی کرو جو تم سے اپنی نیک ہدایت
پر کوئی [illegible] اُجرت طلب نہیں کرتے۔ اور مجھے
کیا بات مانع ہے کہ میں صرف اپنے پیدا کرنے والے
ہی کی پرستش نہ کروں اُس کی پرستش جس کی جانب ہم
تم کو لوٹ جانا ہے، کیا میں اُس ذاتِ واحد کے سوائے
باطل معبودوں کو خدا بنالوں کہ اگر رحمان مجھ کو کوئی نقصان
پہنچانا چاہے تو اُن باطل معبودوں کی کچھ سفارش چل
سکے اور نہ وہ اس مضرت سے بچا سکیں۔ میں اگر ایسا
کروں تو کھلا گمراہ ہوں بیشک میں تو اپنے اور تمہارے پروردگار
پر ایمان لے آیا۔ تم خوب کان لگا کر سن لو! (تب اُس کو
ہماری جانب سے) کہا گیا جنت میں بے خطر داخل ہو جا!
اُس نے کہا: "کاش کہ میری قوم جان لیتی کہ میرے پروردگار
نے مجھے مغفرت کا کیسا اچھا تحفہ دیا اور مجھ کو ان لوگوں میں
شامل کر لیا جن کو اُس نے اعزاز و اکرام سے نوازا ہے۔ اور ہم
نے اُس کی موت کے بعد اُس کی قوم پر آسمان سے کوئی

لشکر سزا دینے کے لیے نہیں اتارا اور ہم کو ایسا کرنے کی قطعی
ضرورت نہیں تھی (ان کی سزا کے لیے) اور کچھ نہیں تھا مگر ایک
ہولناک چیخ، پس وہ وہیں بجھ کر رہ گئے (یعنی ہلاک ہو گئے)

مفسرین اور ارباب سیرت اس واقعہ کے زمانہ اور تفصیلات میں اس درجہ مشکوک اور متردد نظر آتے ہیں کہ اُن کے بیانات اور روایات سے واقعہ کی تعیین ناممکن ہو جاتی ہے اس لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے اپنے مقصدِ عظمیٰ "موعظت و عبرت" کے پیش نظر جس قدر بیان کیا ہے وہ ایک صاحبِ بصیرت کے لیے کافی و شافی ہے، خدا کی اس سرزمین پر حق و باطل کے جہاں بہت سے واقعات ہو گزرے ہیں اور اس پیرِ فلک نے اس سلسلہ میں جتنے ورق بھی اُلٹے ہیں اُن میں ایک یہ واقعہ بھی اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر ہو گذرا ہے، بستی، نیک مرد اور مقدس رسولوں کے نام معلوم ہوئے تب اور نہ ہوئے تب نفسِ واقعہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ تاریخ کے جن اوراق نے نوحؑ اور قومِ نوحؑ، ہودؑ اور عاد، صالحؑ اور ثمود، ابراہیمؑ، لوطؑ اور قومِ لوط، موسیٰؑ اور فرعون، عیسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے معرکۂ حق و باطل کے تفصیلی حالات و واقعات کو اپنے سینہ میں آج تک محفوظ رکھا ہے، اس میں اگر اس واقعہ کا بھی اضافہ ہو جائے جس کا مختصر و مجمل ذکر قرآنِ عزیز نے کیا ہے تو کون سی حیرت کی بات اور تعجب کا مقام ہے۔

واقعہ کا حاصل یہی تو ہے کہ چند مقدس پیغمبروں نے ایک بے راہ رو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی اور اُس نے از راہ عناد و گمراہی اُن کی بات ماننے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ خدا رسیدہ ہادیوں کو قتل کر دینے سے بھی باز نہ رہے، تو اس قسم کے واقعات کو تاریخ نے صرف بنی اسرائیل ہی میں اتنی بار دُہرایا ہے کہ تاریخِ اقوام و مِلل کا حق آگاہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے متعلق تردد نہیں کر سکتا۔

واقعہ سے متعلق اقوال | ابن اسحٰقؒ بروایت کعبِ احبارؓ، وہب بن منبہؒ و عبداللہ بن عباسؓ

نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ شہر انطاکیہ (شام) کا ہو اس شہر کے لوگ بت پرست تھے اور ان کے بادشاہ کا نام انطیخس بن انطیخس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے تین پیغمبروں صادق، صدوق اور شلوم کو بھیجا اور شہر کی آخری سمت سے جو نیک مرد اُن کی تائید کے لیے آیا اُس کا نام حبیب تھا۔ پھر کوئی کہتا ہو کہ یہ عابد و زاہد اور مرتاض تھا اور شہر کے کنارے عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ اور کسی کا قول ہو کہ وہ ریشمی یا سوتی کپڑا بننے کا کام کرتا تھا اور صاحب صدقات و خیرات تھا[1]۔ غرض ان کے نزدیک یہ واقعہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے بہت قدیم زمانہ کا ہے، اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ واقعہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے زمانہ کا ہو اور شہر انطاکیہ ہی کا واقعہ ہو، حضرت مسیح (علیہ السلام) نے اپنے تین حواری شمعون، یوحنا اور پولس کو وہاں بھیجا تھا کہ جا کر اُن کو حق کی دعوت دیں اور پیغام الٰہی سُنائیں مگر اہلِ شہر نے قبول نہ کیا اور اُن کی ہی بستی کے ایک نیک مرد نے جب اُن کو قبولِ حق کی ترغیب دی تو اُنہوں نے اُس کو قتل کر ڈالا اور پاؤں سے کچل کر اُس کی نعش کی توہین کی اس شخص کا نام حبیب تھا اور یہ نجاری (بڑھئی) کا پیشہ کرتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس بستی پر چیخ کا عذاب مسلط کر دیا کہتے ہیں کہ جبرئیل فرشتے نے ایسی ہولناک چیخ کی کہ اہل بستی اُس کو سُن کر جس حالت میں بھی تھے اسی حالت میں مر کر رہ گئے[2]۔

نقد و تبصرہ یہ روایات یا اقوال کعب احبار اور وہب بن منبہ کی اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں حتیٰ کہ ابن اسحٰقؒ کے پاس ان کے لیے مکمل و مسلسل سند بھی نہیں ہو اس لیے بلغنی کہہ کر بیان کرتا ہو اور اس قسم کی روایات میں خواہ مخواہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کا نام آجانا اور تفسیری قصص و حکایات کو بغیر سند اُن کی جانب منسوب کر دینا تو ایک عام بات ہو گئی ہو۔

یہ ہم نے اس لیے کہا کہ ہر دو واقعات اپنے تفصیلی جزئیات کے لحاظ سے غیر تاریخی

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ و تاریخ ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۲۹ [2] ایضاً، ص ۲۳۰-۲۲۹

ہیں بلکہ بعض تاریخی مسلمات کی تردید کرتے ہیں اور قرآن عزیز کے ظاہر سیاق کے بھی خلاف ہیں۔ چنانچہ مشہور محدث و مورخ حافظ عماد الدین بن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے واقعہ پر تو یہ مشترک اعتراض واقع ہوتا ہے کہ شہر انطاکیہ اُن چار مسیحی شہروں میں سے ہے جن کے متعلق باتفاق علماء سیر و تاریخ یہ ثابت ہے کہ وہ دعوتِ مسیح کے مرکز شمار کیے جاتے ہیں اس لیے کہ باختلاف زمانہ ان شہروں میں جس وقت دعوت مسیح (علیہ السلام) پہنچی ہے اُنھوں نے برضا و رغبت اس پر لبیک کہا ہے اور وہ مسیحی پیغام کے لیے مدد معاون ثابت ہوئے ہیں، حتیٰ کہ مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ چار مقامات مقدس مقامات ہیں اور بطریق (پاپائے اعظم) کا دارالخلافہ القدس (بیت المقدس)، انطاکیہ، اسکندریہ اور روما (اٹلی)۔ بیت المقدس اس لیے کہ وہ مسیح علیہ السلام کا وطن ہے، اور انطاکیہ اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کی کل آبادی ایک ہی وقت میں حضرت مسیح پر ایمان لائی۔ اور اسکندریہ اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کے باشندوں نے صلح و آشتی کے ساتھ یہ منظور کیا کہ مسیحی مقدسین بطریق (پوپ)، مطران، اسقف، قسیس، شماس، اور راہب[ف] یہاں اپنے اختیارات کے ساتھ قیام کریں گے۔ اور روما اس لیے کہ قسطنطین اعظم کا دارالسلطنت تھا کہ جس نے عیسائی مذہب کو نئے سانچے میں ڈھال کر فروغ دیا۔ اور دعوت مسیح (علیہ السلام) سے قبل بھی کسی تاریخی شہادت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انطاکیہ کسی زمانہ میں غضب الٰہی سے برباد و تباہ کر دیا گیا تھا، اور بعد میں پھر بارونق شہر بن گیا۔ لہٰذا ہر دو اقوال کے مطابق اس واقعہ کو انطاکیہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

اور قتادہ کی روایت پر مسطورہ بالا اعتراض کے علاوہ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کا ظاہر سیاق یہ بتا رہا ہے کہ معذب بستی کی ہدایت کے لیے جو برگزیدہ انسان بھیجے گئے تھے وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) یا کسی دوسرے نبی کے فرستادہ یعنی رسولِ خدا کے قاصد و ایلچی نہ تھے بلکہ

[ف] پادریوں کے مناصب اور عہدے ہیں۔

براہِ راست خدا کے پیغمبر اور نبی تھے اس لیے کہ اگر وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے فرستادہ ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب کوئی اشارہ کرتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ تمام آیات میں اُن کے متعلق لفظ ارسلنا (ہم نے اُن کو بھیجا) استعمال کیا گیا ہے بلکہ رسولوں اور شہر کے باشندوں کے مکالمے کے جملے تو جب ہی بغیر کسی تاویل کے واضح مطلب ادا کرتے ہیں جبکہ اُن کو براہِ راست خدا کا رسول مانا جائے۔

وہ یہ کہ ان برگزیدہ انسانوں نے جب خود کو رسول ظاہر کیا تو اہلِ شہر اُن پر وہی پرانا اعتراض وارد کرنے لگے جو ہمیشہ منکرینِ رسول کہتے چلے آئے ہیں۔ اُنہوں نے کہا: تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو پھر رسول کیسے ہو سکتے ہو اور رحمان نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا تم جھوٹ کہتے ہو کہ تم پر خدا کا پیغام نازل ہوتا ہے۔ پس اگر وہ خود خدا کے رسول نہیں تھے بلکہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے حواری تھے تو بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جواب میں یہ نہ کہتے: "اللہ خوب جانتا ہے کہ ہم تمہاری جانب رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں" بلکہ جواب یہ دیتے کہ "ہم تو خدا کے پیغمبر عیسیٰ (علیہ السلام) کے قاصد ہیں اور تم کو دعوتِ حق دینے آئے ہیں۔ رہا انسان ہونے کا معاملہ تو اللہ کے پیغمبر انسان ہی ہوتے ہیں۔ فرشتے یا اور کسی مخلوق میں سے نہیں ہوتے"

ابن کثیر نے اس موقع پر ایک تیسرا اعتراض بھی کیا ہے مگر وہ چونکہ ہمارے نزدیک خود محلِ نظر ہے اس لیے نظر انداز کر دیا گیا۔

طبرانی نے معجم میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تین ہستیاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی نقیب کہلاتی ہیں۔ ایک موسیٰ علیہ السلام کے نقیب یوشع (علیہ السلام) دوسرے اصحابِ یٰسین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نقیب اور تیسرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقیب علی (رضی اللہ عنہ)

تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے

۱؎ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ سورۂ یٰسین و فتح الباری جلد ۶ ۲؎ فتح الباری جلد ۶ ۳؎ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ و فتح الباری جلد ۶

بھی وابستہ ہو مگر محدثین کے نزدیک یہ حدیث ضعیف بلکہ ناقابلِ اعتماد ہو اس لیے کہ اس کی سند میں ایک راوی حُسین الاشقر ہو اور یہ کذاب اور متروک الحدیث ہو۔[1]

امام بخاری نے اگرچہ اس واقعہ سے متعلق کوئی روایت نہیں بیان فرمائی مگر انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں اس واقعہ کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے مقدم رکھا ہو اور آیت کو نقل کرکے صرف حلِ لغات کر دیا ہو، اس سے معلوم ہوتا ہو کہ ابن کثیر اور امام بخاری کا رجحان یہ ہو کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل کا ہو[2] اور غالباً یہی صحیح ہو۔

الحاصل واقعہ کی جزئی تفصیلات کچھ بھی ہوں قرآن نے اس سلسلہ میں جو حصہ نقل کیا ہو وہ اس کے مقصدِ عظمیٰ کو پورا کرتا اور اہلِ مکہ اور ارباب بصیرت کو عبرت وبصیرت کی دعوت دیتا ہو کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رشد و ہدایت سے اصحاب قریہ کی طرح مُنہ موڑ کر خسر الدنیا والآخرہ کا سبب نہ بنیں "ان فی ذٰلک لعبرۃ لاولی الالباب"

رحمان | اصحاب قریہ اگرچہ مشرک اور بت پرست تھے مگر اُن میں مذہب حق کی کچھ جھلک موجود تھی اور اُن کے یہاں رحمان کا تصور پایا جاتا تھا، کیا عجب ہو کہ بمصداق آیت "وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر" کوئی قوم ایسی نہیں کہ جہاں ہمارا نذیر نہ پہنچا ہو' وہ اس دعوت سے قبل عرصہ تک کسی پیغمبر صادق کے پیرو رہے اور آہستہ آہستہ زمانہ دراز کے بعد شرک میں مبتلا ہو گئے ہوں۔

موعظت | (۱) ہدایت وضلالت کے معاملہ میں ہمیشہ سے اہل باطل کا یہ عقیدہ رہا ہو کہ خدا کا پیغمبر انسان نہیں ہونا چاہیے بلکہ کسی مافوق الفطرۃ ہستی کو "رسول اللہ" ہونا چاہیے اسی لیے قومِ نوح علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمتِ دعوت تک ہر ایک گروہ نے سب سے پہلے اسی پر تعجب یا نفرت کا اظہار کیا کہ یہ کیسے ممکن ہو کہ ہماری ہی طرح

---

[1] فتح الباری جلد ۶ و تفسیر ابن کثیر جلد ۳ [2] ایضاً

کا انسان اور لوازمات بشری کا محتاج انسان خدا کا پیغمبر ہو۔ چنانچہ اصحاب قریہ کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین مکہ نے بھی یہی کہا: ومالھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق۔ یہ کیسا رسول ہو کہ ہماری ہی طرح کھاتا پیتا اور ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہو" ابشر یھدوننا۔ کیا انسان ہماری ہدایت کرینگے؟" وما منع الناس ان یومنوا اذجاءھم الھدی الا ان قالوا ابعث اللہ بشرا رسولا۔ اور حقیقت یہ ہو کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ متعجب ہو کر کہنے لگے: کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیجدیا ہو؟" مگر ان کے اس جاہلانہ سوال کا قرآن عزیز نے یہ فیصلہ کن جواب دے کر ہمیشہ کے لیے اس بحث کا خاتمہ کر دیا۔" قل لوکان فی الارض ملئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا۔ اے پیغمبر کہہ دے کہ اگر ایسا ہوا ہوتا کہ زمین میں انسانوں کی جگہ فرشتے بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے" یعنی اس سوال کی بنیاد ہی بے وقوفی پر مبنی ہے اس لیے کہ جب دنیا میں انسان بس رہے ہیں اور فرشتوں کی آبادیاں نہیں ہیں تو پھر ان کی ہدایت کے لیے رسول و پیغمبر بھی انسان ہی ہونا چاہیے نہ کہ فرشتہ۔

(۲) جہاں شر و فساد اور فتنہ و گمراہی کے جراثیم بہ کثرت موجود ہوتے ہیں وہاں خیر و سعادت کی بھی کوئی روح ضرور نکل آتی ہو اور وہ کلمۂ حق کی تائید میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتی، چنانچہ جس طرح اصحاب یسین کی حمایت میں شہر کے آخری حصہ سے ایک نیک مرد نکل آیا اور اس نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور اس صلہ میں جان دی، اسی طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قیام مصر کے زمانہ میں بھی شہر کے دور دراز سے ایک نیک مرد بھاگ کر آیا تھا اور اس نے موسیٰ علیہ السلام کی حفاظتِ جان کے لیے نیک صلاح دے کر اپنا فرض ادا کیا تھا۔" ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو

الفضل العظیم؟

(۲) حق و باطل کے معرکہ میں حق کی حقانیت اور باطل کی بطالت کا ایک کھلا ہوا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ حق جوں جوں دلائل و براہین کی روشنی میں اپنی صداقت کو جلوہ گر کرتا جاتا ہے باطل اُسی درجہ زیادہ مشتعل ہو کر اور حق کی روشنی سے خیرہ ہو کر دلائل کی جگہ جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر حق کے پرستار اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتے بلکہ وفورِ جوش اور والہانہ شوق کے ساتھ حق پر جان قربان کر دیتے ہیں، چنانچہ اصحابِ قریہ کا واقعہ اس کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔

(حضرت) لقمان (رضی اللہ عنہ)

(سنہ ۳ ق-م)

لقمان؟ ، قرآن عزیز اور حضرت لقمان ، نبوت یا حکمت ؟
چند تفسیری مطالب ، حکمتِ لقمان ، مواعظ۔

لقمان لقمان یا حکیم لقمان، اہل عرب کے یہاں ایک مشہور شخصیت ہے لیکن اس کے باوجود اُن کے حالات اور خاندان و نسب سے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، اور اس اتفاق کے علاوہ کہ وہ ایک بہت بڑے دانا (حکیم) تھے اور اُن کے حکیمانہ اقوال صحیفہ لقمان کے نام سے اُن کے درمیان معروف و مشہور تھے اُن سے متعلق باقی امور میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔

اور یہ اس لیے کہ تاریخ قدیم میں لقمان نام کی ایک اور شخصیت کا پتہ چلتا ہے جو عاد ثانیہ (قوم ہود علیہ السلام) میں ایک نیک بادشاہ ہو گزرا ہے اور خالص عرب نژاد ہے، ابن جریر، ابن کثیر، سہیلی جیسے مؤرخین کی رائے یہ ہے مشہور لقمان حکیم افریقی النسل تھا اور عرب میں ایک

غلام کی حیثیت میں آیا تھا چنانچہ یہ حضرات اُس کا نسب نامہ اور حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ھو لقمان بن عنقا بن سندون او لقمان بن ثار بن سندون[1] (وہ لقمان بن عنقا یا ثار بن سندون ہے)

اور کہتے ہیں کہ وہ سوڈان کے نوبی قبیلہ سے تھا اور پست قد، بھاری بدن سیاہ رنگ تھا ہونٹ موٹے اور ہاتھ پیر بھدے تھے، مگر نہایت نیک، عابد و زاہد، صاحب حکمت اور دانا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُس کو حکمت سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ میں عہدۂ قضا پر مامور ہو گیا تھا۔

عن ابن عباسؓ قال کان عبداً حبشیاً نجاراً وعن جابر بن عبداللہؓ قال کان لقمان قصیراً افطس من النوبۃ

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے فرماتے تھے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے، اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لقمان پستہ قد موٹے ہونٹ والے نوبہ کے قبیلے سے تھے۔

وعن سعید بن المسیبؓ کان لقمان من سودان مصر ذو مشافر اعطاہ اللہ الحکمۃ ومنعہ النبوۃ[1]

اور سعید بن مسیبؓ فرماتے ہیں کہ لقمان مصری سوڈانی تھے اور اُن کے ہونٹ بہت موٹے تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کو اگرچہ نبوت نہیں عطا کی مگر حکمت و دانائی سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔

عن عبدالرحمٰن بن حرملہ قال جاء اسود الی سعید بن المسیبؓ یسألہ فقال لہ سعید لاتحزن من اجل انک اسود فانہ کان من اخیر الناس ثلثۃ من السودان بلال ومھجع مولی عمرؓ ولقمان الحکیم

اور عبدالرحمٰن بن حرملہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حبشی سعید بن مسیبؓ کے پاس آنکلا اور کچھ سوال کیا، اُنھوں نے فرمایا تو اس بات سے دلگیر نہ ہو کہ کالا حبشی ہے اس لیے کہ سوڈانیوں میں تین آدمی دنیا کے بہترین انسان ہوئے ہیں بلالؓ، حضرت عمرؓ کا غلام مہجع اور لقمان حکیم جو

[1] روض الانف جلد ۱ و ابن کثیر جلد ۲ و تفسیر ابن کثیر جلد ۳۔

کان اسود نوبیاً ذا شافر(۱) سودانی نوبی تھے اور اُن کے لب بہت موٹے اور بھدے تھے اور مشہور مورخ اور صاحب مغازی محمد بن اسحٰق رح کہتے ہیں کہ لقمان حکیم عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے یعنی عرب بائدہ کی نسل سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے

قال وھب فلما مات شداد بن عاد صار الملك الى اخیه لقمان بن عاد وکان اعطى الله لقمان مالم یعط غیره من الناس فی زمانه اعطاه حاسة مائة رجل وکان طویلاً لایقارب اهل زمانه.

وہب بن منبہ رح کہتے ہیں جب شداد بن عاد کا انتقال ہو گیا تو حکومت اُس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ تعالیٰ نے لقمان کو وہ چیز عطا فرمائی تھی جو اس زمانہ کے انسانوں میں کسی کو نہیں عطا کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کو سو انسانوں کی برابر ادراک و حاسہ عطا فرمایا تھا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ طویل قامت تھے۔

قال ابن وھب قال ابن عباس رض کان لقمان بن عاد بن الملطاط بن السلك بن وائل بن حمیر نبیاً غیر مرسل(۲)

وہب کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رض فرماتے تھے کہ لقمان بن عاد کا نسب نامہ یہ ہے: بن ملطاط بن سلک بن وائل بن حمیر اور وہ نبی تھے مگر رسول نہیں تھے۔

اور لطف یہ ہے کہ ابن جریر اور ابن کثیر بھی اپنی تائید میں حضرت عبداللہ بن عباس رض ہی کا قول نقل کرتے ہیں اور ابن اسحٰق بھی اُن ہی کے قول کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اور معاصر مؤرخین میں سے مصنف ارض القرآن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لقمان حکیم اور لقمان بادشاہ ایک ہی شخصیت ہے اور وہ بلاشبہ عادِ ثانیہ کے نیک بادشاہوں میں اور بہت بڑے حکیم و دانا تھے اور عرب میں لقمان کے نام سے جو "صحیفہ" منسوب تھا وہ ان ہی لقمانِ عاد کا ہے اور وہ اپنے اس دعوے کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ شاعر

(۱) تاریخ ابن کثیر جلد ۲ (۲) کتاب التیجان - ص ۷۰ -

جاہلی سلمی بن ربیعہ کے یہ اشعار اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں

اھلکن طسماً و بعدہ   غذی بھم وذا جدون

واھل جاش ومارب   وحی لقمانُ والتقون

"حوادث زمانہ نے قبیلۂ طسم کو اور اس کے بعد ذاجدون شاہِ یمن کو اہلِ جاش و مارب کو اور قبیلۂ لقمان کو مٹا دیا"

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے بلکہ ایک قبیلہ کا مالک، یمن کا باشندہ اور عظمت و شوکت میں سبا کا مقابل، اور یہ تمام باتیں لقمانِ عاد پر صادق آتی ہیں۔

"عاد کا ایک کتبہ جو ۱۸۳۴ء میں ملا تھا اس میں چند حسب ذیل فقرے ہیں۔

ہم پروہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں جو کمینہ خیالات سے بہت دور، اور شریروں کو سزا دینے والے تھے اور ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے۔ اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے"

کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کا غذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفۂ لقمانُ لقمان کے "اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے"[1]

قرآن عزیز اور حضرت لقمان

حضرت لقمان کا ذکر قرآنِ عزیز نے بھی کیا ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام اسی تقریب سے سورۂ لقمان ہے اور اگرچہ اس نے اپنے پیشِ نظر مقصد کی خاطر اس کے نسب و خاندان کی بحث میں جانا پسند نہیں کیا تاہم اس کے حکیمانہ مقولات کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے لقمان کی شخصیت پر ایک حد تک روشنی ضرور پڑتی ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس کو بیان کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ مسطورۂ بالا ہر دو رایوں میں سے کون سی رائے صحیح یا قرین قیاس ہے۔

[1] ارض القرآن جلد ۱ ص ۱۸۱-۱۸۲۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ
اشْكُرْ لِلّٰهِ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ
لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ
حَمِيْدٌ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ
هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ
الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۰ وَوَصَّيْنَا
الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا
عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ
اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ وَ
اِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ
مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا
وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا
وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ
ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۰ يٰبُنَيَّ اِنَّهَا اِنْ
تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ
فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ
اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ
اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۰ يٰبُنَيَّ
اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ
وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى

اور بلا شبہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی ۔ اور کہا کہ اللہ
کا شکر ادا کر پس جو شخص اُس کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے
نفس کے فائدہ کے لیے کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے تو اللہ
بے پرواہ ہے لائق حمد ہے اور جس وقت لقمان نے اپنے
بیٹے سے نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے بیٹے اللہ
کا شریک نہ ٹھہرا بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔
اور ہم نے حکم کیا انسان کو اس کے ماں باپ کے
بارے میں کہ اُٹھاتی ہے اس کو اُس کی ماں تکلیف پر
تکلیف جھیل کر اور دو برس کے اندر دودھ پلاتے رہنا
یہ کہ میرا شکر گزار بن اور اپنے والدین کا شکر گزار رہو آخر
میری ہی جانب لوٹنا ہے اور اگر تیرے ماں باپ تجھ
پر سختی کریں اس بارہ میں کہ میرا شریک ٹھہرا کہ جس
کے متعلق وہ نادانی اور جہالت میں ہیں تو اس
میں ان دونوں کی پیروی نہ کر اور دنیوی زندگی
میں اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور پیروی اُس
شخص کی کر جو صرف میری ہی جانب رجوع کرتا ہے
پھر میری ہی جانب تم سب کو لوٹنا ہے پس میں اُس
وقت تم کو تمہارے کیے کی خبر دونگا ۔ اے میرے بیٹے
بلا شبہ اگر رائی کے دانہ کی برابر بھی کوئی خبر چھوٹی ہوتی
ہے اور وہ پتھر کے اندر یا آسمانوں یا زمینوں میں کہیں
بھی ہو اللہ اس کو لے آتا ہے بیشک اللہ [illegible]

مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ	کرنے والا خبردار ہو۔ اے میرے بیٹے! قائم کر نماز کو اور حکم
عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۔ وَلَا تُصَعِّرْ	کر بھلائی کا اور برائی سے منع کر اور جو تجھ پر پڑے اس پر
خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ	صبر کر، بلاشبہ یہ عزائم امور میں سے ہے اور تو اپنے رخسار کو
فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ	لوگوں سے (ازراہ تکبر) نہ پھیر اور زمین پر اترا کر نہ چل
لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۔	بے شبہ اللہ تعالیٰ کسی تکبر اور شیخی کرنے والے کو دوست
وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَ	نہیں رکھتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر
اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ	اور اپنی آواز کو نرم و پست کر۔ بے شبہ گدھے کی آواز
اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ	بہت ہی ناپسندیدہ آواز ہے۔

ان آیات میں لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں اور حکمت و دانائی کی باتیں بتائی ہیں اُن میں ان باتوں پر بھی زور دیا ہے کہ (۱) لوگوں کے ساتھ حُسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہیے یہ نہ ہو کہ ازرہِ غرور مُنہ موڑ لیا جائے (۲) اور نہ خدا کی زمین پر اکڑ کر چلو یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خدائے تعالیٰ مغرور اور اکڑنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (۳) ہمیشہ رفتار میں متواضعانہ میانہ روی قائم رہنی چاہیے (۴) اور آواز گفتگو میں نرم رکھو اس لیے کہ چیخنا چلّانا انسانوں کا کام نہیں ہے اگر کرخت اور بے وجہ بلند آواز پسندیدہ چیز ہوتی تو گدھے کی آواز قابلِ ستائش سمجھی جاتی حالانکہ اُس کی آواز بدترین آواز شمار ہوتی ہے۔

لقمان حکیم لقمان اگر غلام ہوتے تو اپنے بیٹے غلام زادہ کو یہ نصائح نہ کرتے اس لیے کہ غرور و نخوت، خود بینی و شیخی، کرختگی و خشونت ایسے اوصاف ہیں جو بادشاہوں، شاہزادوں، متموّل و صاحبِ اقتدار انسانوں کے اندر ہی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور یہ نا خداترس اور نشۂ دولت میں چور دولتمندوں ہی کا شیوہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ وہ تمام اوصاف و عادات ہیں جو عموماً متکبرین اور جبابرہ کے لیے مخصوص ہیں۔ غلام اور غلام زادہ کے لیے

نہ ان کا موقع ہے اور نہ فرصت کیونکہ اُن کا وقتِ عزیز تو دوسروں کی نیازمندی اور خدمتگذاری ہی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اسی لیے یہ فرمایا ہے

تواضع زگردن فرازاں نکوست گدا ار تواضع کند خوئے اوست

اس تفصیل کے بعد جو کہ قرآنِ عزیز سے ماخوذ ہے اب ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ لقمان حکیم اور لقمانِ عاد ایک ہی شخصیت ہے اور وہ عادِ ثانیہ کے نیک نفس بادشاہ اور حضرت ہود علیہ السلام کے پیرو تھے اور حبشی الاصل نہیں بلکہ عربی الاصل تھے اور صاحبِ سیرت محمد بن اسحٰق کی نقل اور شاعر جاہلی سلمٰی بن ربیعہ کی شہادت اس مسئلہ میں صحیح اور راجح ہیں ۔ اور عادِ ثانیہ کے زمانہ کے حجری کتبہ میں جو کہا گیا ہے اُس سے مُراد وہی حکیم لقمان ہے جو عرب میں مشہور و معروف تھا۔

ممکن ہے کہ اس موقعہ پر اُن مرفوعہ روایات کو پیش کر کے ہمارے دعوے کی تردید کی جائے جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول ہے کہ لقمان حکیم حبشی الاصل تھے مگر واضح رہے کہ صاحب جرح و تعدیل محدثین نے ان روایات کے رفع کو صحیح تسلیم نہیں کیا اور ان میں سے بعض کو ضعیف اور منکر قرار دیا ہے یعنی محدثین کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول نہیں ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے۔

نبوت یا حکمت

اگرچہ محمد بن اسحٰق کی روایت "عن ابن عباسؓ" میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت لقمان نبی تھے لیکن قرآن عزیز کا اسلوب بیان اس کی موافقت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ سورۂ لقمان میں باوجود اس امر کے کہ اُن کی بعض حکیمانہ نصائح اور بلیغانہ وصایا کا ذکر بصراحت مذکور ہے لیکن کسی ایک جملہ میں بھی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جو اُن کی نبوت پر دلالت کرتا ہو، اسی لیے جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے بلکہ خود حضرت ابن عباسؓ سے بھی دوسرا قول اس قول کے خلاف مذکور ہے چنانچہ ابن کثیر اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں

والمشهور عن الجمهور انه كان حكيما اور جمہور کا مشہور قول یہ ہے کہ لقمان خدا کے ولی

ولیا ولم یکن نبیا وقد ذکرہ اللہ	اور حکیم و دانا تھے نبی نہیں تھے، اور اللہ تعالیٰ نے
تعالیٰ فی القرآن فاثنی علیہ و	اُن کا قرآن میں ذکر کیا ہے اور اُن کی تعریف کی اور
حکی من کلامہ فیما وعظ بہ ولدہٗ	اُن کے اُس کلام کو بیان کیا جس میں انہوں نے
الذی ھو احب الخلق الیہ الخ	اپنے بیٹے کو" جو کہ خدا کی مخلوق میں اُن کے لیے سب سے
	زیادہ محبوب تھا" نصیحت کی ہے۔
"ولقد اتینا لقمان الحکمۃ" قال یعنی	"ولقد اتینا لقمان الحکمۃ" یعنی دانائی اور
الفقہ والاسلام ولم یکن نبیا و	اسلام اور وہ نبی نہیں تھے اور نہ اُن پر وحی نازل
لم یوح الیہ وھکذا نص علی ھذا غیر	ہوئی اور بہت سے سلف سے یہی ثابت ہے
واحد من السلف منھم مجاھد و سعید	مثلاً مجاہد، سعید بن مسیب اور ابن عباس وغیرہ۔
بن المسیب و ابن عباس واللہ اعلم	

چند تفسیری مطالب (۱) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے جو اہم نصیحت کی وہ شرک باللہ سے اجتناب اور توحید کا التزام ہے کیونکہ "دین حق" میں یہی وہ حقیقت ہے جو حنیف کو مشرک سے ممتاز کرتی ہے اور شرک ہی ایسا گناہ ہے جو کسی حالت میں بھی قابلِ بخشش نہیں مگر یہ کہ اُس سے تائب ہو جائے۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہٖ و	بیشک جو خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے اُس کو خدائے تعالیٰ
یغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء	نہیں بخشیگا اور کفر و شرک کے علاوہ گناہ جس کے لیے چاہیگا بخش دیگا۔

(۲) حضرت لقمان نے شرک کو "ظلم عظیم" فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں بخاری کی ایک مشہور روایت ہے وہ یہ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم" خدا کی مغفرت اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور اُنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ غلط ملط نہیں کیا" تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ بات بہت شاق گذری اور اُنہوں نے خدمتِ

ف۱ جلد ۲ صفحہ ۱۲۵ ف۲ ایضاً

اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) میں عرض کیا کہ یارسول اللہ ایسا تو کوئی شخص بھی نہ ہوگا جس نے خدائے تعالیٰ کے احکام کے پیش نظر کچھ نہ کچھ ظلم نہ کیا ہو، تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انہ لیس بذلک الم تسمع الی قول لقمان "یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔" آیت کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کیا تم نے لقمان کا یہ قول نہیں سنا "اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا، بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آیت "لم یلبسوا ایمانھم بظلم" میں ظلم سے مراد "شرک" ہے نہ کہ معصیات صغائر و کبائر۔

(۳) سورۂ لقمان میں "واذ قال لقمان لابنہ" سے "لظلم عظیم" تک اور پھر یٰبُنَیَّ سے لصوت الحمیر تک حضرت لقمان کے مقولات بیان کیے گئے ہیں اور درمیان میں "ووصینا الانسان" سے "انبئکم بما کنتم تعملون" تک بطور جملہ معترضہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے تو اس کے لیے وجہ مناسبت یہ ہے کہ جبکہ قرآن نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا جس میں باپ نے بیٹے کو پند و نصائح کیے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اُمت مرحومہ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھا کہ جب کہ باپ اور ماں کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیوی اور اُخروی کسی معاملہ میں بھی اولاد کو بے راہ رو دیکھنا نہیں چاہتے تاکہ انجام کار اولاد کو دُکھ جھیلنا نہ پڑے تو اولاد کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ خدا کی صحیح اور حقیقی معرفت کے بعد سب سے زیادہ والدین کی خدمت اور ان کی رضا جوئی کو مقدم سمجھے حتیٰ کہ اگر والدین کافر و مشرک ہوں تب بھی اُس کا فرض ہے کہ اُن کی خدمت اور اُن کے ساتھ حسن سلوک، تواضع اور نیازمندی کو ہاتھ سے نہ دے، البتہ اگر وہ دین حق سے اعراض اور شرک کے اختیار پر اصرار کریں تو اُس کو قبول نہ کرے اس لیے کہ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت بھی درست نہیں ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے "لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" لیکن اس مکالمہ میں بھی اپنے انکار

۱؎ بخاری کتاب التفسیر۔

کے وقت نرمی اور حسنِ خطابت کو نہ چھوڑیے اور درشت کلامی اختیار نہ کریے۔

(۴) سورۂ لقمان میں جو نصائح مذکور ہیں اُن میں حسنِ خلق اور تواضع کی ترغیب اور کبر و شیخی اور بدخلقی کی مذمت کی گئی ہے۔ حضرت لقمان نے امر و نہی میں ان باتوں کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے انتخاب فرمایا ہے کہ کائنات میں جس قدر بھی بھلائی اور برائی پیش آتی ہے اُن سب کی جڑ اور بنیادی یہی امور ہیں۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُمت مرحومہ کو ان امور کی اہمیت پر بہت زیادہ توجہ دلائی ہے۔

حسن خلق

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت لاتمم حسن الاخلاق [1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شبہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ محاسنِ اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچاؤں۔
عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قیل یا رسول اللہ ای المومن افضل قال احسنهم خلقاً [2]	حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کونسا مسلمان سب سے زیادہ صاحبِ فضیلت ہے؟ آپ نے فرمایا: جو اُن میں سب سے زیادہ حسنِ اخلاق رکھتا ہو وہی سب سے زیادہ افضل ہے۔
عن انس قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان العبد لیبلغ بحسن خلقه درجات الآخرة وشرف المنازل وانه لضعیف العبادة۔ وانه لیبلغ بسوء خلقه درك جهنم وهو عابد [3]	حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ ایک بندہ باوجود عبادت میں کمزور ہونے کے اپنے حسنِ اخلاق کی وجہ سے آخرت کے بلند درجات اور منازلِ علیا کو حاصل کر لیتا ہے اور عابد ہونے کے باوجود بدخلقی کی وجہ سے جہنم پاتا ہے۔
وقال میمون بن مهران عن رسول	میمون بن مہران، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل

[1] موطا امام مالک [2] بیہقی [3] معجم طبرانی (مجمع الزوائد جلد ۸ ص ۲۵)

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ما من ذنب اعظم عند اللہ من سوء الخلق[1]
کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک بدخلقی سے زیادہ کوئی بڑا گناہ نہیں ہے۔

تواضع
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طوبیٰ للاتقیاء الاتقیاء الذین اذا حضروا الم یعرفوا و اذا غابوا الم یفتقدوا اولئک مصابیح مجردون من کل فتنة غبراء مشتقة[2]
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بشارت ہے نکوکار بے نفس لوگوں کے لیے جن کی حالت یہ ہے کہ مجلس میں موجود ہوں تو کوئی تعارف نہ کرے اور جب غائب ہو جائیں تو کوئی تلاش نہ کرے یہی ہیں روشن چراغ اور ہر تاریک پراگندہ فتنہ سے محفوظ۔

کبر و غرور
عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنة من کان فی قلبہ مثقال ذرة من کبر[3]
عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں وہ شخص ہرگز داخل نہ ہوگا جس کے قلب میں ذرہ کی مقدار بھی غرور و کبر ہوگا۔

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان فی قلبہ مثقال ذرة من کبر اکبہ اللہ علی وجہہ فی النار[4]
حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہے اُس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اوندھے مُنہ گرادیگا۔

عن بریدةؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ[5]
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے لباس کو از رہ غرور زمین پر کھینچتا ہوا چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُس کی جانب نظر رحمت سے نہ دیکھیگا۔

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ [2] ایضاً [3] مسلم [4] اصحاب السنن [5] مسلم

(۵) حضرت لقمان نے درشت اور کرخت آواز سے بات چیت کرنے کو بھی منع فرمایا ہے اور یہ بہت واضح بات ہے اس لیے کہ نرم گفتاری حُسنِ خلق کا شعبہ اور درشت و کرخت لہجہ بدخلقی کا جزء ہے اور اسی بنا پر اس طرزِ گفتگو کو "صوتِ حمار" سے مشابہ بتایا گیا اور نہیقِ حمار کے متعلق یہ حدیث بہت معروف و مشہور ہے۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه عن	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ
النبی صلی الله علیه وسلم قال :	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم مرغ
اذا سمعتم صیاح الدیکة فاسئلوا	کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے فضل طلب کرو،
الله من فضله واذا سمعتم نهیق	اور جب گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے
الحمیر فتعوذوا بالله من الشیطان	پناہ مانگو اس لیے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر آواز
فانها رأت شیطانا [۱]	کرتا ہے۔

یعنی مرغ کی آواز ملائکۃ اللہ کے نزول کی دلیل ہے کیونکہ وہ سحر میں تسبیح کا عادی ہے اور حمار کی آواز نزولِ شیاطین کا پتہ دیتی ہے اس لیے کہ ہر مکروہ اور فطرتِ سلیم کو ناگوار شے شیطان کے لیے محبوب ہے۔

(۶) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں اُن میں یہ بھی کہا ہے کہ "زمین پر اکڑ کر نہ چلو" اس مضمون کو قرآن عزیز نے دوسری جگہ عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ	اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل تو اپنے اس اندازِ رفتار
لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ	سے نہ زمین کو پھاڑ سکیگا اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں
الْجِبَالَ طُوْلًا ۔	تک طویل ہو جائیگا۔

مغرور انسان کے اندازِ رفتار کو کس معجزانہ بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے گویا وہ اس طرح چلتا ہے کہ اپنی اکڑی ہوئی بلند گردن کے ذریعہ پہاڑوں کی بلندی سے بھی اونچا ہو جانا چاہتا ہے

[۱] نسائی کتاب التفسیر

اور قدم کو اس طرح زمین پر رکھتا ہے کہ گویا اُس کو پھاڑ ڈالیگا مگر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ کرسکیگا پھر بلا وجہ اکڑ کر چلنے کے کیا معنی؟

اور اس کے برعکس متواضع اور با اخلاق انسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی	اور جو رحمان کے بندے (یعنی حکم بردار بندے) ہیں وہ
الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ	زمین پر وقار اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ٥	اُن سے جاہل لوگ مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (جہالت
(فرقان)	سے بچنے کے لیے) سلام کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔

حکمتِ لقمان گزشتہ سطور میں یہ ذکر آچکا ہے کہ عرب میں حکمتِ لقمان کا کافی چرچا تھا اور وہ اکثر مجالس میں اُن کے حکیمانہ اقوال کو نقل کرتے رہتے تھے چنانچہ تابعین، صحابہ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ کے بعض اقوال منقول ہیں اور اُن میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(۱) حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے (۲) جب کسی مجلس میں داخل ہو تو اول سلام کرو پھر ایک جانب بیٹھ جاؤ اور جب تک اہلِ مجلس کی گفتگو نہ سُن لو خود گفتگو شروع نہ کرو پس اگر وہ خدا کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی اُس میں سے اپنا حصہ لے لو اور اگر وہ فضولیات میں مشغول ہوں تو وہاں سے علیحدہ ہو جاؤ اور دوسری کسی عمدہ مجلس کو حاصل کرو۔ (۳) اللہ تعالیٰ جب کسی کو امانتدار بنائے تو امین کا فرض ہے کہ اُس امانت کی حفاظت کرے (۴) اے بیٹے! خدائے تعالیٰ سے ڈر اور ریاکاری سے خدا کے ڈر کا مظاہرہ نہ کر کہ لوگ اس وجہ سے تیری عزت کریں اور تیرا دل حقیقۃً گنہگار رہے (۵) اے بیٹے جاہل سے دوستی نہ کر کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ تجھ کو اُس کی جاہلانہ باتیں پسند ہیں اور دانا کے غصہ کو بے پرواہی میں نہ ٹال کہ کہیں وہ تجھ سے جدائی نہ اختیار کر لے (۶) واضح رہے کہ داناؤں کی زبان میں خدا کی طاقت ہوتی ہے اُن میں سے کوئی کچھ نہیں بولتا مگر یہ کہ اُس بات کو اللہ تعالیٰ اُسی طرح کرنا چاہتا ہو۔

(۷) اے بیٹے خاموشی میں کبھی ندامت اٹھانی نہیں پڑتی اور اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا ہے۔ (۸) بیٹا! ہمیشہ شر سے دور رہو تو شر تم سے دور رہیگا اس لیے کہ شر سے ہی شر پیدا ہوتا ہے۔ (۹) بیٹا! غیظ و غضب سے بچو اس لیے کہ شدتِ غضب دانا کے قلب کو مردہ بنادیتی ہے۔ (۱۰) بیٹا! خوش کلام ہو، طلاقت وجہ اختیار کرو تب تم لوگوں کی نظروں میں اس شخص سے بھی زیادہ محبوب ہوجاؤگے جو ہر وقت اُن کو داد و دہش کرتا رہتا ہو۔ (۱۱) نرم خوئی دانائی کی جڑ ہے (۱۲) جو بوؤگے وہی کاٹوگے (۱۳) اپنے اور اپنے والد کے دوست کو محبوب رکھو۔ (۱۴) کسی نے لقمان سے دریافت کیا: سب سے زیادہ صابر کون شخص ہے؟ کہا: جس کے صبر کے پیچھے ایذا، نہ ہو۔ پھر دریافت کیا: سب سے بڑا عالم کون ہے؟ جواب دیا: جو دوسروں کے علم کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے پھر سوال کیا: سب سے بہتر آدمی کونسا ہے؟ فرمایا: "غنی" سائل نے پھر کہا غنی سے مالدار مراد ہے؟ جواب میں کہا: نہیں بلکہ غنی وہ ہے جو اگر اپنے اندر خیر کو تلاش کرے تو موجود پائے ورنہ خود کو دوسروں سے مستغنی رکھے (۱۵) کسی نے دریافت کیا بدترین انسان کونسا ہے؟ فرمایا: جو اس کی پرواہ نہ کرے، کہ لوگ اس کو برائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے۔ (۱۶) بیٹا! تیرے دسترخوان پر ہمیشہ نکوکاروں کا اجتماع رہے تو بہتر ہے اور مشورہ صرف علماءِ حق ہی سے لینا۔[۱]

مواعظ (۱) انسان اگر نبی معصوم اور پیغمبر بھی نہ ہو مگر حکمت و دانائی سے مشرف ہو تب بھی خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ عظیم الشان ہے اسی لیے حضرت لقمان کو یہ عزت ملی کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن عزیز میں اُن کی ثنا و توصیف فرمائی اور اُمت مرحومہ کے لیے اُن کی بعض اُن نصائح اور وصایا کو نقل فرمایا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں حتیٰ کہ قرآن کی ایک سورۃ اُن کے نام سے منسوب ہو دئی۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ماخوذ از امام احمد

(۲) شرک باللہ تمام بھلائیوں کو مٹا کر انسان کو خدا کے سامنے خالی ہاتھ لیجاتا ہے اس لیے ہمیشہ اس سے پرہیز لازم ہے۔

شرک جلی کی طرح شرکِ خفی بھی اعمال انسانی کو اس طرح کھالیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھالیتی ہے اور شرک خفی میں ریاء، نمائش اور شہرت پسندی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

(۳) والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک اور اُن کی عظمت کو اسلام میں اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ قرآن عزیز نے اُن کو ربِّ مجازی کہا ہے اور اُن کی خدمت اور اُن کے سامنے سرِ نیاز جھکا دینے کو والدین کے اسلام وکفر دونوں حالتوں میں ضروری قرار دیا ہے اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر جگہ جگہ اپنے حق یعنی توحید باللہ کے ساتھ ساتھ حقوقِ والدین کا ذکر کیا اور اُن کو تمام حقوق پر مقدم رکھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ	اور حکم کر چکا تیرا رب کہ اُس کے سوا کسی کو نہ پوجو،
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ اِمَّا يَبْلُغَنَّ	اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو، اگر پہنچ جائے
عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا	تیرے سامنے بڑھاپے کو اُن میں سے ایک یا دونوں
فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا	تو اُن کو "اُف" بھی نہ کہو اور نہ اُن کو جھڑکو اور
تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا	اُن سے ادب کے ساتھ بات کرو اور اُن کے سامنے
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ	عاجزی کے ساتھ کاندھے جھکا دو نیازمندانہ طریقہ
مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا	پر۔ اور کہہ اے رب! اُن پر رحم کر جس طرح پالا انہوں
كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ	نے مجھ کو چھوٹا سا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے
بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۚ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ	جی میں ہے۔ اگر تم نیک نفس ہوگے تو وہ رجوع ہونے
فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝	والوں کو بخشتا ہے۔

اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک سے متعلق احادیث تو بہت کثرت سے ذخیرۂ حدیث

میں پائی جاتی ہیں، حتیٰ کہ یہ کہا گیا ہی کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اصحابِ سبت

۱۰۰۰ ق م (تخمیناً)

قرآنِ عزیز اور اصحاب سبت، سبت اور اُس کی حرمت، واقعہ کی تفصیلات، تعیینِ مقام، زمانۂ حادثہ، چند تفسیری حقائق، حقیقتِ مسخ، مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی، حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا مکالمہ، بصائر

قرآنِ عزیز اور اصحابِ سبت

قرآنِ عزیز میں اصحابِ سبت کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ اور اعراف میں کیا گیا ہی جس کی تفصیل ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتی ہی

شمار	سورۃ	آیات	عدد
۱	بقرہ	۶۵-۶۶	۲
۲	نساء	۴۷	۱
۳	مائدہ	۶۰	۱
۴	اعراف	۱۶۳-۱۶۶	۴
			۸

سبت اور اس کی حرمت

قصص القرآن کے گذشتہ مباحث میں یہ واضح ہو چکا ہی کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ سے "دینِ حنیف" یعنی خدا کے سچے دین کی تعلیم کا سلسلہ اُن کی دو شاخوں بنو اسمٰعیل اور بنو اسحٰق کے ذریعہ قوموں اور ملکوں میں پھیلا ہی اس لیے ان دونوں سلسلوں میں "شعائر اللہ" کے متعلق یکساں اصول پائے جاتے ہیں مگر حضرت اسحٰق (علیہ السلام) کے صاحبزادہ اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کی اولاد نے جو کہ بنی اسرائیل کہلاتی ہی اپنے زمانہ کے انبیاء

علیہم السلام سے اختلاف اور جھگڑے کر کے بعض معاملات میں تشدد اور سختی کے احکام اور بعض معاملات میں ملتِ ابراہیمی سے جُدا احکام کا بار اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی اُمت میں عبادت الٰہی کے لیے ہفتہ کے سات دنوں میں سے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے میں یہود بنی اسرائیل نے اپنی روایتی کجروی کی بناء پر حضرت موسیٰؑ سے یہ اصرار کیا کہ اُن کے لیے ہفتہ (سنیچر) کا دن "عبادت و برکت کا دن" مقرر کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے پہلے تو اُن کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آجائیں اور ملتِ ابراہیمی کے اس امتیاز کو "جو خدائے برتر کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے" ہاتھ سے ضائع نہ ہونے دیں لیکن جب اُن کا اصرار حد سے متجاوز ہو گیا تو وحی الٰہی نے موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ اطلاع دی کہ خدائے تعالیٰ اُن کے اصرارِ بیجا کے نتیجہ میں جمعہ کی سعادت و برکت کو اُن سے واپس لیے لیتا اور اُن کے مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے اُن کے لیے ہفتہ (سنیچر) کو جمعہ کا قائم مقام بنائے دیتا ہے۔ لہٰذا اب آپ ان کو مطلع کر دیں کہ وہ اپنے اس مطلوبہ دن کی عظمت کا پاس و لحاظ کریں اور اُس کی حرمت کو قائم رکھیں، ہم اس دن میں ان کے لیے خرید و فروخت، زراعت و تجارت اور شکار کو حرام کرتے اور اُس کو صرف عبادت کے لیے مخصوص کیے دیتے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے بھی مختصر الفاظ میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے جو اُنہوں نے ہفتہ میں عبادت کے لیے ایک دن مخصوص کرنے کے متعلق اپنے پیغمبر (موسیٰ) علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَی الَّذِیْنَ	بیشک سبت کا دن اُن لوگوں کے لیے (عبادت کا دن)
اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَاِنَّ رَبَّكَ لَیَحْكُمُ	مقرر کیا گیا جو اُس کے متعلق جھگڑا کرتے تھے اور یقیناً تیرا
بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ	رب ضرور قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ

يَخْتَلِفُوْنَ ٥ (نحل) کر دیگا کہ جس کے متعلق وہ اختلاف کرتے تھے اُس میں حق کیا تھا اور باطل کیا؟۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے تقرر سبت (سنیچر) کے بعد بنی اسرائیل سے عہد میثاق لیا کہ وہ اس کی حرمت کو برقرار رکھینگے اور عبادتِ الٰہی کے سوا اُن باتوں کو اس دن میں اختیار نہیں کرینگے جن کو اللہ تعالیٰ نے اُن پر حرام کر دیا ہے۔

وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (آل عمران) اور ہم نے اُن (بنی اسرائیل) سے کہا: سبت (ہفتہ) کے بارہ میں حد سے نہ گزرنا (خلاف ورزی نہ کرنا) اور ہم نے اُن سے اس کے متعلق بہت سخت قسم کا عہد پیمان لیا۔

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہم دنیا میں سب سے آخر آنے والے آخرت میں سب سے مقدم ہونگے خصوصًا اہلِ کتاب سے جو کہ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ (جمعہ کا دن) ہم سب سے پہلے ان اہل کتاب پر فرض کیا گیا تھا مگر اُنھوں نے اس کے متعلق اختلاف ظاہر کیا اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس (جمعہ کے دن) کو قبول کر لینے کی ہدایت و توفیق دی سو دنیا میں بھی وہ اس معاملہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے اس لیے کہ یہود کا روز عبادت جمعہ سے ایک دن بعد (سنیچر) ہے اور نصاریٰ کا اُس کے بعد (اتوار) کا دن ہے۔[1]

عن ابی هريرة وحذيفة (رضی الله عنهما) قالا قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: اضل الله عن الجمعة من كان قبلنا فكان لليهود يوم السبت وكان للنصاریٰ يوم الاحد حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو جو ہم سے پہلے گزر چکے جمعہ کے دن سے محروم کر دیا سو یہود کے لیے سبت (سنیچر) کا دن ٹھہرا اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا

---

[1] بخاری۔ شاہ ولی اللہ نے اس حدیث کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ منجانب اللہ تو یہ حکم ہوا تھا کہ ہفتہ میں سے ایک روز عبادت کے لیے مقرر کر لو اور تعیین امم کی فطرت پر چھوڑ دی گئی تھی چنانچہ تمام امم کے مقابلہ میں صرف ہم نے ہی جمعہ کا انتخاب کیا۔

فجاء اللہ بنا فھدانا اللہ لیوم الجمعۃ فجعل الجمعۃ والسبت والاحد و کذالک ھم تبع لنا یوم القیمۃ نحن الآخرون من اھل الدنیا والاولون یوم القیمۃ والمقضی بینھم قبل الخلائق [1]	پھر اللہ تعالیٰ نے ہم کو دنیا میں بھیجا اور جمعہ کے دن کے متعلق ہماری راہنمائی فرمائی اور اس طرح جمعہ سنیچر اور اتوار علیحدہ علیحدہ امتوں کے لیے مقرر ہو گئے۔ لہذا اسی طرح یہ سب امتیں قیامت کے دن ہماری تابع ہونگی اور ہم جو دنیا میں آخر ہیں ہم قیامت میں پاداش عمل کے اعتبار سے مقدم ہونگے۔ اور تمام مخلوق سے قبل ہمارا ہی فیصلہ ہوگا۔

سبت کی حرمت کے متعلق موسوی قانون میں بنی اسرائیل کو کیا ہدایات تھیں وہ تورات کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

پھر خداوند نے موسیٰ سے ہمکلام ہوکے کہا تو بنی اسرائیل کو فرما اور ان کو کہہ کہ تم میرے سبتوں کو مانو اس لیے کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان تمہارے قرنوں میں نشانی ہے تاکہ تم جانو کہ میں خداوند تمہارا پاک کرنے والا ہوں۔ پس تم سبت کو مانو اس لیے کہ وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اُس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے جو اس میں کچھ کام کرے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے۔ چھ دن کام کرنا لیکن ساتواں دن آرام کے لیے سبت ہے وہ خداوند کے لیے مقدس ہے۔ پس بنی اسرائیل سبت کو مانیں اور اُسے اپنی پشت در پشت عہد ابدی جان کے اس میں آرام کریں۔ میرے اور بنی اسرائیل کے درمیان یہ علامت ابدی ہے۔[2]

واقعہ کی تفصیلات غرض ایک طویل مدت تک یہود بنی اسرائیل اپنے مطلوبہ روزِ عبادت (سبت) کی عزت و حرمت میں خدا کے لیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جن باتوں کو اس دن میں حرام کر دیا گیا تھا اُن سے بچتے رہے مگر آہستہ آہستہ اُن کی کجروی اور متمردانہ سرکشی بروئے کار آتی گئی اور اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے اُن احکامات کی "جو کہ حضرت موسیٰ

---

[1] مسلم [2] خروج باب ۳۱ آیات ۱۲ - ۱۷

علیہ السلام کی معرفت سبت سے متعلق اُن پر لازم کیے گئے تھے" خلاف ورزی شروع کردی اور اگرچہ شروع میں یہ خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طریق پر ہوتی رہی مگر شدہ شدہ اُس نے علی الاعلان جماعتی حیثیت اختیار کرلی اور بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اُس کو کیا جانے لگا بلکہ بہلانے حیلے تراش کر اپنی اس بدعملی پر فخر کیا جانے لگا، تب خدا کے عذاب نے اُن کو آپکڑا اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد مبارک سے عرصہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی، چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے مچھلی اُن کا قدرتی شکار تھا اور وہ اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے اور اُس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ لوگ ہفتہ کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادتِ الٰہی میں صرف کرتے اس لیے قدرتی طور پر مچھلیاں چھ روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی خدائے تعالیٰ نے اس طریقہ سے اُن کو آزمایا اور اُن کی قوتِ ایمانی کا امتحان لیا حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا اور چھ دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام و نشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے پانی پر تیرتی نظر آتیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے بآسانی گرفت میں آسکتی تھیں۔

کچھ دنوں تک تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے آخر نہ رہ سکے اور اُن میں سے بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کر لیے کہ جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور سبت کے دن مچھلیوں کی کثرتِ آمد سے بھی فائدہ اُٹھالیں۔

چنانچہ بعض تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے اُن گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڈھوں میں چلا جائے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے اُن میں چلی جائیں اور جب سبت کا دن گذر جاتا تو یکشنبہ (اتوار) کی صبح کو اُن مچھلیوں کو گڈھوں میں سے نکال کر کام میں لاتے۔

اور بعض یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے لگا آتے تاکہ سبت کے روز اُن میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو اُن جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بیحد مسرور نظر آتے تھے۔ چنانچہ جب اُن کے علماءِ حق اور مخلصینِ اُمت نے ان کو اس حرکت سے روکا تو اُنہوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ سبت کے دن شکار نہ کرو، لہٰذا ہم اُس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ اتوار کے روز کرتے ہیں۔ باقی یہ ترکیبیں منع نہیں ہیں اور اگرچہ اُن کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا مگر کجروی یہ جواب دے کر اُن کو مطمئن کر دیتی تھی کہ ہمارا یہ حیلہ خدا کے یہاں ضرور چل جائیگا۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دین کے احکام پر صداقت و سچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے اور اسی لیے شرعی حیلے نکال کر اُن کے امتثال سے بچنا چاہتے تھے، گویا خود فریبی میں بھی مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان چند حیلہ جو انسانوں کی ان حرکات کا علم دوسرے حیلہ ساز افراد کو بھی ہوا اور اُنہوں نے بھی اُن کی تقلید شروع کر دی اور آخر کار بستی کی ایک بہت بڑی جماعت ببانگ دہل ان حیلوں کی آڑ میں سبت کی حرمت کی خلاف ورزی کرنے لگی۔

اس جماعت کی یہ ذلیل حرکات دیکھ کر بستی ہی میں سے ایک سعادتمند جماعت

نے مگر بہت چست کی اور اُن کے مقابل آکر اُن کو اس بدعملی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا مگر اُنہوں نے کچھ پرواہ نہیں کی اور اپنی حرکت پر قائم رہے تب سعادتمند جماعت کے دو حصے ہو گئے ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان لوگوں کو نصیحت کرنا اور سمجھانا بیکار ہے یہ باز آنے والے نہیں کیونکہ یہ اس کام کو اگر گناہ سمجھ کر کرتے تب تو یہ توقع تھی کہ شاید کسی وقت باز آکر تائب ہو جائیں۔ لیکن جبکہ یہ شرعی حیلے تراش کر اپنی بدعملی پر نیکی کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں تو ہم کو یقین ہوتا جاتا ہے کہ اس جماعت پر بہت جلد خدا کا عذاب آنے والا ہے، یا یہ ہلاک کر دیے جائینگے اور یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کیے جائینگے - لہذا اب ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔

یہ سُن کر سعادتمند جماعت کے دوسرے حصہ نے کہا کہ ہم اس لیے ان کو برابر نصیحت کرتے رہنا چاہتے ہیں کہ فردائے قیامت میں اپنے پروردگار کے سامنے یہ عذر پیش کر سکیں کہ ہم نے آخر وقت تک ان کو سمجھایا اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا، لیکن اُنہوں نے کسی طرح نہیں مانا۔ نیز ہم مایوس نہیں ہیں بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ عجب نہیں کہ ان کو توفیق نصیب ہو جائے اور یہ اپنی بدعملی سے باز آجائیں۔

بہرحال حیلہ جو جماعت اپنے حیلوں پر قائم رہی اور سبت کی حرمت اور اس دن میں شکار کی ممانعت کے احکام سے قطعاً غافل اور بے پرواہو کر نڈر اور بے باک ہو گئی تب اچانک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور مہلت کے قانون نے گرفت کی صورت اختیار کر لی یعنی خدائے تعالیٰ کا حکم ہو گیا کہ جس طرح تم نے میرے قانون کی اصل صورت و شکل کو حیلوں کے ذریعہ مسخ کر دیا قانونِ پاداش کے مطابق اُسی طرح تمہاری صورت و شکل بھی مسخ کر دی جاتی ہے تاکہ "پاداشِ عمل از جنسِ عمل" کے مظاہرے سے دوسرے لوگ بھی عبرت و بصیرت حاصل کریں چنانچہ حضرتِ حق جل مجدہٗ نے "کُن" کے اشارہ سے اُن کو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ کر دیا اور وہ انسانی شرف سے محروم ہو کر ذلیل و خوار حیوانوں میں تبدیل

ہو گئے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ سعادتمند جماعت کا جو حصہ امر بالمعروف، ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا رہا اُس نے جب یہ دیکھا کہ متمرد اور سرکش جماعت کسی طرح حق پر کان نہیں دھرتی تو مجبور ہو کر اُس نے اُن سے ترک تعاون کر لیا اور کھانا پینا اور خرید و فروخت غرض ہر قسم کا اشتراکِ عمل ختم کر دیا حتیٰ کہ اپنے مکانوں کے دروازوں تک کو اُن پر بند کر دیا تاکہ کسی قسم کا بھی اشتراک باقی نہ رہے، چنانچہ جس دن بدکرداروں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تو اُن کے معاملہ کی اس جماعت کو گھنٹوں خبر نہ ہوئی، لیکن جب کافی وقت گذر گیا اور اُس جانب سے کسی انسان کی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی تب اُن کو خیال ہوا کہ معاملہ دگرگوں ہے لہذا وہاں جا کر دیکھا تو صورتِ حال اس درجہ عجیب تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے یعنی وہاں انسانوں کی جگہ بندر اور خنزیر تھے جو اپنے ان عزیزوں کو دیکھ کر قدموں پر لوٹتے اور اپنی حالتِ زار کا اشاروں سے اظہار کرتے تھے۔ سعادتمند جماعت نے باحسرت و یاس اُن سے کہا کیا ہم تم کو بار بار اس خوفناک عذاب سے نہیں ڈراتے تھے؟ اُنھوں نے یہ سُنا تو حیوانوں کی طرح سر ہلا کر اقرار کیا اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنی ذلت و رسوائی کا دردناک نظارہ پیش کیا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۚ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (بقرہ)	اور (اے گروہ یہود!) تم بلاشبہ اپنے پیشروؤں میں سے ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جو سبت کے بارہ میں احکام الٰہی کی حدود سے متجاوز ہو گئے تھے اور ہم نے اُن کے لیے کہہ دیا: تم ذلیل بندر ہو جاؤ پس ہم نے اُس بستی کے ان بدبخت لوگوں کو گرد و پیش کے لوگوں کے لیے عبرت اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نصیحت و موعظت بنا دیا۔
وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ	اور (اے پیغمبر!) بنی اسرائیل سے اُس شہر کے بارہ میں پوچھو

كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ
يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ
تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ
سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا
يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ
نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝
وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِنْهُمْ
لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ
أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا
قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَ
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا
نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنْجَيْنَا
الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ
وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا
بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا
يَفْسُقُونَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا
عَنْ مَا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ
كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝

(اعراف)

جو سمندر کے کنارے واقع تھا، اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے سبت کے دن اُن کی (مطلوبہ) مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی اُن کے پاس آجاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے، نہ آتیں۔ اِس طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے بہ سبب اُس نافرمانی کے جو وہ کیا کرتے تھے۔

اور جب اُس شہر کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے (ان لوگوں سے جو نافرمانوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے) کہا تم ایسے لوگوں کو (بیکار) نصیحت کیوں کرتے ہو جنہیں (اُن کی شقاوت کی وجہ سے) یا تو خدا ہلاک کر دیگا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلا کریگا؟ انہوں نے کہا "اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا) اور اس لیے بھی کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں۔ پھر جب ایسا ہوا کہ اُن لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو انہیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا، ہم نے اُن لوگوں کو تو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے، مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی و نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا بہ سبب اُن نافرمانیوں کے جو وہ کیا کرتے تھے! پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا، تو ہم نے کہا "بندر ہو جاؤ ذلت و خواری سے ٹھکرائے ہوئے"!

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ

(اے پیغمبر) کہہ دیجیے کیا میں تم کو بتاؤں کہ قیامت کے دن اللہ

ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۔ کے نزدیک جزا کے اعتبار سے کون سب سے بدتر ہوگا

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ وہ شخص ہوگا جس پر خدا نے لعنت کی اور اُس پر غضبناک ہوا

عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ اور وہ جس میں سے اُس نے بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ

وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ کردے اور جس نے اُن میں سے شیطان (یا بت) کی پوجا کی،

اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ یہی ہیں بدترین مرتبہ والے اور سیدھے راستہ سے بہت دور

اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ بھٹکے ہوئے (یعنی اے بنی اسرائیل ہم بدترین جزا کے مستحق نہیں

(مائدہ) ہیں بلکہ تم ہو جن کے یہ کچھ اعمال و اطوار ہیں)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اے اہل کتاب! تم اُس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے تم پر

اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا اُتاری ہو جو اُس کی تصدیق کرنے والی ہو جو تمہارے پاس

لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ ہے (یعنی تورات) اس سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہروں کو

نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا مٹا ڈالیں اور اُن کی پیٹھ پر اُن کو لگا دیں یا ہم اُن پر لعنت

عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ

كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ کا حکم پورا ہو کر رہنے والا ہو۔

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ (نساء)

تعیین مقام | جس بستی پر یہ حادثہ گذرا اُس کا نام کیا ہے؟ قرآنِ عزیز، سورۂ اعراف میں صرف یہ بیان کرتا ہو کہ وہ ساحلِ بحر پر واقع تھی "القریۃ التی کانت حاضرۃ البحر" مگر مفسرین نے اس کی تعیین میں متعدد نام لیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہو کہ یہ مدین کا واقعہ ہو اور ابن زیدؒ کہتے ہیں کہ اس کا نام منتنا تھا اور یہ مدین اور عینونا کے درمیان واقع تھا۔[1]

اور عکرمہؒ، مجاہدؒ، قتادہ، سُدّی کبیرؒ اور ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ۔

(رضی اللہ عنہما) سے یہ منقول ہو کہ اس بستی کا نام اَیلہ تھا اور یہ بحرِ قلزم کے ساحل پر واقع تھی،
عرب جغرافیہ داں کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص طورِ سینا سے گزر کر مصر کو روانہ ہو تو طورِ سینا کی
جانب ساحلِ بحر پر یہ بستی ملتی تھی، یا یوں کہیے کہ مصر کا باشندہ اگر مکہ کا سفر کرے تو راہ
میں یہ شہر پڑتا تھا، یہی قول راجح ہو۔[1]

زمانۂ حادثہ | شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہٗ) اور اُن کے اتباع میں بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں
کہ یہ واقعہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ میں پیش آیا ہی، لیکن ابن جریر، ابن کثیر، ابو حیان،
اور امام رازی (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر مفسرین کے طرزِ بیان اور خود قرآن عزیز کے
اسلوب سے یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ اعراف
میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہو اور وہاں یہ بتایا ہو کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اہل بستی
تین جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور اُن میں سے ایک جماعت سرکش اور جبلہ جو نافرمانوں کو
راہِ ہدایت پر قائم رکھنے کی سعی کر رہی تھی پس اگر یہ واقعہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ میں
پیش آتا تو یہ بات، بعید از قیاس اور بعید از اسلوب قرآن بھی کہ وہ ایسے موقعہ پر جبکہ انسانوں
کی ایک بہت بڑی جماعت پر مسخ کا عذاب مسلط ہونے کا ذکر کر رہا ہو اُس زمانہ کے پیغمبر کا
اس سلسلہ میں قطعاً کوئی ذکر نہ کرے اور یہ نہ بتائے کہ نافرمان قوم کے اور اُن کے درمیان
کیا معاملہ پیش آیا، نیز سلف صالحین سے بھی کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہو کہ جس
سے یہ واضح ہوتا ہو کہ یہ واقعہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ میں پیش آیا اور نہ تاریخ ہی
اس کے لیے کوئی مواد بہم پہنچاتی ہو۔ اس لیے مذکورۃ الصدر جلیل المرتبت مفسرین نے بھی اس
واقعہ سے متعلق چاروں مقامات میں سے کسی ایک مقام کی تفسیر میں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ واقعہ
حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ میں پیش آیا ہو۔ پھر نہیں معلوم کہ حضرت شاہ صاحب نور
اللہ مرقدہٗ نے یہ کس جگہ سے اخذ فرمایا کہ یہ واقعہ داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ کا ہی ممکن ہو کہ اُنھوں نے

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ و فتح الباری جلد ۶۔

سورۂ مائدہ کی اس آیت سے یہ اندازہ لگایا ہو۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ	داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی بنی اسرائیل میں
عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ	سے وہ لوگ لعنت کیے گئے جنھوں نے کفر کیا
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ؀	اس لیے کہ وہ نافرمانی کے خوگر تھے اور حد سے
(مائدہ)	گذرے ہوئے تھے۔

مگر اس آیت سے استدلال صحیح نہیں ہی اس لیے کہ اول تو اس مقام پر بنی اسرائیل کی عام گمراہی کا تذکرہ ہی۔ خاص سبت کا واقعہ زیرِ بحث نہیں ہی دوسرے اس میں صرف داؤد (علیہ السلام) ہی کا ذکر نہیں ہی بلکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا بھی تذکرہ ہے چنانچہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

يخبر تعالىٰ انه لعن الكافرين	اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہی کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں
من بني اسرائيل من دهر	پر داؤد (علیہ السلام) کی زبانی زبور میں عرصۂ دراز کے
طويل فيما انزل على داؤد نبيه	بعد لعنت کی گئی اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی بھی انجیل میں
عليه السلام وعلىٰ لسانِ	اس لیے کہ وہ خدا کی نافرمانیوں، مسلسل سرکشیوں اور
عيسىٰ بن مريم بسبب عصيانهم	مخلوقِ خدا پر ظلم کرنے کی وجہ سے اسی قابل تھے کہ ان
لله واعتدائهم على خلقه۔	پر لعنت ہوتی رہے (تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں)
قال العوفي عن ابن عباس	عوفی کہتے ہیں کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہی
لعنوا في التوراة والانجيل وفي	وہ آیت کی تفسیر میں فرمایا کرتے تھے کہ بنی اسرائیل میں سے
الزبور وفي الفرقان الخ[۱]	کفر کرنے والوں پر توراۃ انجیل زبور اور قرآن سب ہی کتابوں

الحاصل قرآن کے اسلوبِ بیان اور جلیل القدر مفسرین کی شرح و تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہی کہ اصحاب سبت کا یہ واقعہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت داؤد (علیہ السلام) کے درمیانی زمانہ میں کسی ایسے وقت پیش آیا جبکہ ایلہ میں کوئی نبی موجود نہیں تھے اور امر بالمعروف

[۱] جلد ثانی۔

ونہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علماءِ حق ہی کی سپرد تھا اس لیے قرآنِ عزیز نے صرف اُن ہی کا تذکرہ کیا اور کسی نبی یا پیغمبر کا ذکر نہیں کیا۔

چند تفسیری حقائق (۱) سورۂ بقرہ میں اصحابِ سبت کے تذکرہ میں ہے "نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا" تو ما بین یدیھا وما خلفھا سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں مفسرین کے متعدد اقوال میں سے بہتر قول حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے یعنی اس سے وہ بستیاں مراد ہیں جو ایلہ کے گرد و پیش آباد تھیں۔ اور مشہور تابعی سعید بن جبیرؒ کے اقوال سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

عن ابن عباس لما بین یدیھا من القریٰ وما خلفھا من القریٰ[1]	ابن عباس فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ایلہ کے سامنے اور پیچھے جو بستیاں ہیں اُن کے لیے ہم نے اس کو عبرت بنا دیا
وقال سعید ابن جبیر ای من بحضرتھا من الناس یومئذٍ[1]	اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ تھے ایلہ کو ہم نے اُن کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا۔

(۲) اسی واقعہ سے متعلق سورۂ اعراف میں ہے "کذلک نبلوھم بما کانوا یفسقون" یعنی اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہم نے اُن کو امتحان آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے جمعہ کو یوم عبادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور سبت (سنیچر) کے یوم عبادت بنائے جانے پر موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑا کیا تو ہم نے اگرچہ اُن کی بات مان لی لیکن سبت کے معاملہ میں ہم نے اُن کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا اور آزمائش کا یہ معاملہ مچھلی کے شکار سے متعلق تھا جس کی تفاصیل تم سُن چکے ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے

اِن اللہ انما افترض علی بنی اسرائیل الیوم الذی افترض علیکم فی[2]	اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں بنی اسرائیل کی عبادت کے لیے اسی طرح جمعہ کو فرض کیا تھا جس طرح ہم پر فرض

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ [2] ایضاً جلد ۲

کیا ہر مگر اُنہوں نے مخالفت کرکے اُس کو سنیچر کے دن   عید کو۔ الیوم الجمعۃ فخالفوا

سے بدل لیا اور اُس کی عظمت کرنے لگے اور جمعہ کے بارہ   الی السبت فعظموہ وترکوا ما

میں جو حکم اُن کو ملا تھا اُس کو نہ مانا پس جب وہ سبت پراڑ   اُمروا بہ فلما ابوا الا لزوم السبت

گئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس سلسلہ میں آزمائش میں   ابتلاھم اللہ فیہ[1]

(۳) اسی سورہ میں ہے "بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون" اس آیت کی تفسیر میں دو احتمال بیان کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ یہ اجمال ہے اُس تفصیلی عذاب کا جو اگلی آیت "کونوا قردۃ خاسئین" میں بیان ہوا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اول اہل بستی پر ایک نوع کا عذاب آیا تا کہ اُن کی آنکھیں کھلیں اور وہ یہ سمجھیں کہ وہ ان حیلوں سے خدا کے حکم کی تعمیل نہیں کر رہے بلکہ اُس کے حکم کو منسوخ کر رہے ہیں مگر اُنہوں نے اُس عذاب سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی تب اُن پر "مسخ" کا عذاب آگیا جمہور پہلے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۴) سورۂ مائدہ میں ہے "جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ معذب گروہ کے نوجوان ...... "بندر" کی شکل میں مسخ کیے گئے اور بوڑھے "خنزیر" کی صورت میں مسخ ہوئے[2]

حقیقتِ مسخ | (۵) سورۂ بقرہ، مائدہ اور اعراف میں ہے "کُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" "وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ" تو انسان کے بندر یا خنزیر ہو جانے کے کیا معنی ہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے مسخ حقیقی (صوری) مراد ہے اور مشہور تابعی مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مسخ معنوی مراد ہے یعنی وہ حقیقۃً بندر کی شکل میں تبدیل نہیں ہو گئے تھے بلکہ اُن کے قلوب مسخ ہو گئے تھے،

مجاہد کہتے ہیں کہ اُن کے قلوب مسخ ہو گئے تھے اور وہ واقعی   قال مُسخت قلوبھم ولم

بندر نہیں بن گئے تھے اور دراصل یہ ایک مثل ہے جیسا کہ   یمسخوا قردۃ وانما ھی

قرآن میں یہ مثل ہے "مثلھم کمثل الحمار یحمل   مثلٌ ضربہ اللہ "کمثل الحمار

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱   [2] ابن کثیر جلد ۱۔

یحمل اسفارا" وھذا	اسفارا" یعنی اہل کتاب کے تورات و انجیل پڑھنے اور پھر اُس
سند جید من مجاھد	کے مطابق عمل نہ کرنے کی مثال ایسی ہو کہ گویا گدھے پر کتابیں
وقول غریب خلاف	لدی ہوئی ہیں۔ مجاہد کا یہ قول اُن کی جانب صحیح سند سے ثابت
الظاھر من السیاق	ہو مگر یہ غریب (انوکھا) اور اوپرا قول ہو اور قرآن کے ان تمام
فی ھذا المقام وفی غیرہ[1]	مقامات کے ظاہر کے خلاف ہو جو مختلف سورتوں میں اس سلسلہ میں بیان

کیے گئے ہیں۔

جمہور کے خلاف مجاہد اپنے اس قول میں منفرد ہیں اور یہ قول ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہو اس لیے کہ سورۂ بقرہ میں واقعہ مسخ کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہو کہ یہ عذاب جس طرح سرکش اور نافرمان لوگوں کی پاداشِ عمل کے لیے ضروری تھا اسی طرح اس میں یہ بھی حکمت و مصلحت تھی کہ یہ لرزہ بر اندام کر دینے والا واقعہ گرد و پیش کے رہنے والوں کے لیے بھی سامانِ عبرت بن جائے چنانچہ ارشاد ہو "فجعلنٰھا نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا" پس اگر مسخ کا یہ عذاب صرف مسخِ قلوب تک محدود تھا تو پھر گرد و پیش کے بسنے والوں کے لیے یہ کس طرح سامانِ عبرت و خوف بن سکتا تھا کیونکہ قلب کے مسخ ہو جانے کا مطلب تو یہ ہوتا ہو کہ وہ رشد و ہدایت کے قبول سے محروم ہو جائے اور یہ بات دوسروں کی نگاہ میں مشاہد اور محسوس نہیں ہوا کرتی بلکہ ایک معنوی شے ہے جس کو دوسرا انسان ثمرہ یا نتیجہ اور یا کافی تجربہ کے بعد ہی معلوم کر سکتا ہے۔ نیز عدم قبولِ ہدایت اور انکارِ ہدایت کا معاملہ تو کچھ ان ہی لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہو یہ تو ہر پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کے وقت پیش آتا رہتا ہو، لہٰذا اگر اصحابِ سبت کی پیہم سرکشی کی وجہ سے ان کے قلوب مسخ کر دیے گئے یعنی اُن سے قبولِ ہدایت سلب کر لی گئی تو ان میں وہ کیا خاص بات پیدا ہو گئی تھی کہ جس کی وجہ سے مسخِ قلوب کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی "کونوا قردۃ خاسئین"

---

[1] ابن کثیر جلد۱ سورہ بقرہ۔

علاوہ ازیں اگر اس تعبیر سے صرف مسخ قلوب ہی مراد ہوتا تو بلحاظ بلاغت یہ کہہ دینا کافی تھا کہ "کونوا قردۃ۔ تم بندر کی طرح ہو جاؤ" یعنی جس طرح "بندر" انسان نما شریر و خبیث حیوان ہے اسی طرح تم بھی ہو کہ صورت انسانوں کی مگر قلب میں شرارت و خباثت بندر کی سی ہے اور قردۃ کی صفت "خاسئین۔ ذلیل و رسوا بندر" کے اضافہ کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس لیے کہ جب اُن کی صورتیں بندر کی شکل میں مسخ ہو کر تبدیل نہیں ہو گئی تھیں تو پھر یہ حکمت صحیح نہیں ہو سکتی کہ اگر فقط قردہ (بندر) کہا جاتا تو ممکن تھا کہ کسی کے دل میں یہ شبہ باقی رہ جاتا کہ جبکہ بعض پالتو بندر پالنے والوں کی نظروں میں پیارے لگتے ہیں تو کسی انسان کے لیے صرف یہ کہہ دینا کہ وہ بندر سا لگتا ہے مذمت کے موقع پر کافی نہیں ہے اس لیے ضروری ہوا کہ "خاسئین" کہہ کر یہ بتا دیا جائے کہ وہ محبوب بندر نہیں بلکہ ذلیل و رسوا بندر بنا دیے گئے۔

یہ حکمت تو جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ اُن انسانوں کو حقیقی طور پر بندر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہو اور چونکہ بعض لوگ بندر کی حرکات سے خوش ہو کر اُن کو پالتے اور محبوب رکھتے ہیں لہٰذا ان معذب انسانوں کو بندر کی شکل میں بھی اس طرح مسخ کیا گیا کہ دیکھنے والا اُن سے گھن کھائے اور اُن کا اپنے قریب آنا بھی گوارا نہ کرے۔

مجاہدؒ کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ اُسی طرح ایک مثل ہے جس طرح "کمثل الحمار یحمل اسفارا" عالم بے عمل کے لیے مثل ہے، یہ قول اس لیے درست نہیں ہے کہ قرآن عزیز نے بعض مواقع میں جو مثالیں بیان کی ہیں یا تو وہ "مثل" کہہ کر ہی بیان ہوئی ہیں مثلاً مسطورہ بالا مثال یا "مثلھم کمثل الذی استوقد نارا" منافقین کی مثال یا "مثلا ما بعوضۃ فما فوقھا" جیسی مثال۔ اور یا وہاں ایسا صاف اور واضح قرینہ موجود ہوتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس جگہ حقیقت حال کو "مثل" کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے مثلاً آیت "ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ" میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو شخص ہدایت

کو ہدایت سمجھنے کے باوجود قبول نہیں کرتا، کانوں سے سنتا ہے مگر اُس پر توجہ نہیں کرتا، وہ حق کو آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر اُس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے اور اپنی زندگی کو مسلسل ایسی کجروی اور بغاوت پر قائم رکھتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے گویا اللہ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ پس یہاں یہ واضح قرینہ موجود ہے کہ مشرکین مکہ کے نہ کانوں پر مہر لگی ہوئی تھی اور نہ دلوں پر اور نہ اُن کی آنکھوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ عادت اللہ یہ جاری ہے کہ جو سمجھ رکھنے کے باوجود ناسمجھ بنا، شنوا ہونے کے باوجود ناشنوا ہو جاتا اور بینا ہونے کے باوجود حق سے نابینا بنا ہے اور اس حالت پر مُصر رہتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی پاداشِ عمل کا قانون اُس کے قلب، سمع اور بصر کی اُس استعداد کو سلب کر لیتا ہے جو قبولِ حق کے لیے اُس کو خلقت و پیدائش کے وقت عطا ہوئی تھیں۔

لیکن زیرِ بحث مقام پر "کونوا قردۃ" کو نہ صاف الفاظ میں "مثل" کہا گیا ہے اور نہ یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جو "مسخ معنوی" پر دلالت کرتا ہو۔ بلکہ "خاسئین" کو "قردۃ" کے لیے صفت لانا اس کا قرینہ ہے کہ یہاں بلاشبہ "مسخ حقیقی" مراد ہے۔

نیز یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے اگر اصحاب سبت کا معاملہ محض مسخ معنوی کی حیثیت رکھتا ہے تو اُس سے متعلق مثل بیان کرنے کے لیے قردہ (بندر) اور خنزیر (خوک) میں سے کسی ایک حیوان کا ذکر کافی تھا اور ان دونوں میں سے شرارت اور خباثت میں جو زیادہ سمجھا جاتا ہو مثال کے طور پر صرف اُسی کو بیان کر دینا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ سورۂ مائدہ میں یہ بتایا کہ اصحاب سبت میں سے کچھ تو بندر بنا دیے گئے اور کچھ خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے "وجعل منھم القردۃ والخنازیر"

یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر ابن کثیر، ابن جریر، ابن حیان، ابن تیمیہ، رازی آلوسی (رحمہم اللہ) جیسے متقدمین و متاخرین جلیل القدر مفسرین، مجاہدؒ کے انفرادی قول

کو قرآنِ عزیز کے سیاق و سباق کے خلاف قرار دیتے ہوئے جمہور کے قول کی تائید کرتے اور اصحابِ سبت سے متعلق آیات میں مسخ حقیقی مُراد لیتے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) قتادہؒ، ربیع بن انسؒ، ابوالعالیہؒ، ضحاکؒ اور جمہور کے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں۔

(قلت) والغرض من ھذا السیاق عن ھؤلاء الائمۃ بیان خلاف ما ذھب الیہ مجاھد رحمہ اللہ من ان مسخھم انما کان معنویا لا صوریا بل الصحیح انہ معنوی صوری (واللہ اعلم)	(میں کہتا ہوں) ان ائمۂ تفسیر کے بیانات کو ذکر کرنے سے یہ مقصد ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ تمام بالاتفاق مجاہد کے اس قول کے مخالف ہیں "کہ بنی اسرائیل کی زیرِ بحث جماعت کا مسخ صرف معنوی تھا حقیقی نہ تھا" کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسخ معنوی اور حقیقی دونوں حیثیت سے تھا۔

مسئلہ کا یہ پہلو نقل سے تعلق رکھتا ہے رہا عقلی نقطۂ نظر سو اس کے پیشِ نظر بھی بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہو جانا عقلاً ناممکن اور محال نہیں ہے اس لیے کہ اس مسئلہ میں اگر عقلی استعجاب ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ایک حقیقت کس طرح دوسری حقیقت میں تبدیل ہو سکتی ہے؟ لیکن تبدیل حقائق کا یہ مسئلہ قدیم و جدید فلسفہ کے مسلمات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ اور جدید فلسفہ کے نظریۂ ارتقاء (the theory of evolution) کی اساس و بنیاد تو صرف اسی پر موقوف ہے کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں تبدیل ہو جانا نہ صرف ممکن بلکہ کائناتِ ہست و بود میں واقع اور درجاتِ ارتقاء کے لحاظ سے ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر نظریۂ ارتقاء کے اصول پر ایک گوریلا یا شمپانزی قسم کا بندر اپنی حقیقت سے منتقل ہو کر انسانی حقیقت میں بدل جا سکتا ہے تو انسان کا بندر کی حقیقت میں بدل جانا کیوں محال نظر آتا ہے۔

کیا وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہر شے کا ردِّ عمل (Reaction) ممکن بھی ہے اور واقع و مشاہد بھی تو اس اصول پر اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جس طرح ایک ادنیٰ حقیقت، اعلیٰ حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح کبھی خصوصی حالات و ناموافق اثرات کی بناء پر اعلیٰ حقیقت، ادنیٰ حقیقت میں منقلب ہو جاتی ہے تو عقلاءِ جدید کے پاس اس نظریہ کے انکار کے کون سے دلائل ہیں اور یہاں ردِّ عمل (ری ایکشن) کیوں اپنا اثر نہیں کر سکتا؟

آج کی دنیا میں ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں بدل جانا نہ صرف نظریہ اور تھیوری تک محدود ہے بلکہ روزمرہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتا رہتا اور مشاہدہ میں آتا رہتا ہے اور یہ اس طرح کہ یہ مسئلہ صدیوں تک پیچیدہ رہا ہے کہ انسان کی پیدائش کا ابتدائی تخم (نطفہ) کن کن مدارج سے گذر کر انسان کی شکل اختیار کرتا ہے اور قرآنِ عزیز نے اس سلسلہ میں جن مدارج کا ذکر کیا ہے مفسرینِ قدیم اُن مدارج کے حقائق بیان کرنے میں یا اجمال سے کام لیتے رہے ہیں اور یا وقت کی تحقیقاتِ علمی جہاں تک قرآن کا ساتھ دیتی رہی ہیں، اس کے مطابق کچھ تفصیلات دیتے رہے ہیں لیکن چونکہ یہ سب کچھ نظری اور علمی حدود میں محدود تھا اس لیے قرآنِ عزیز کے بیان کردہ حقائق کی پوری تشریح سامنے نہیں آتی تھی لیکن اب اس مسئلہ میں نظریات سے آگے بڑھ کر علمی تحقیقات نے مشاہدہ تک ترقی کر لی ہے اور رحمِ مادر میں انسانی تخم پر انسان بننے تک جو تطورات و تحولات گذرتے ہیں ان کو سائنس اور علمِ طب کے جدید آلات کے ذریعہ مشاہدہ کر کے صحیح طور پر معلوم کر لیا گیا ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ قرآنِ عزیز نے اس سلسلہ میں نطفہ، علقہ، مضغہ، فکسونا العظام لحماً — ثم انشاناہ خلقاً اٰخر کی جو تعبیرات ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت سنائی تھیں حرف بحرف وہی صحیح اور حقیقتِ نفس الامر کے مطابق ہیں گویا علمی تحقیقات کو صدیوں تک اپنی جگہ سے حرکت کرتے کرتے مشاہدہ کی حد میں پہنچ کر آخر اسی جگہ ٹھیرنا پڑا جو قرآن واضح کر چکا تھا اور اس طرح علمی تحقیق کو اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا۔ اور جب تک قرآن کے دیئے ہوئے علم الیقین کے ساتھ مطابقت

نہ کرلی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکی۔

"پیدائشِ جنین" کا یہ مسئلہ نشو وارتقار کے جن نظریات پر قائم اور عالم مشاہدہ میں آچکا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نطفہ جب علقہ، مضغہ اور اسی طرح کے درجات طے کرتا ہے تو یہ اپنے ہر درجۂ ادنیٰ میں ایک خاص حقیقت ہوتا ہے اور درجۂ عالی میں منتقل ہوکر بالکل دوسری حقیقت بن جاتا ہے اور اسی طرح حقائق کا تحول وانقلاب ہوتا رہتا ہے لیکن یہ تمام انقلابات ایک مہینہ کے اندر اندر اس طرح ہوتے ہیں کہ گویا اس ابتدائی دور میں ایک انسان کا جنین بھی درجات کے لحاظ سے ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ نباتات کا جنین، ایک مچھلی کا، ایک چارپائے کا اور ایک بندر کا اور اس دور کے آخر میں وہ بندر کی اعلیٰ قسم گوریلا اور شمپانزی کے جنین کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے مہینہ کے شروع میں ان تمام درجاتِ نباتاتی وحیوانی میں ایک ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا ہوجاتا ہے کہ کل تک جو جنین حیوانات کی اعلیٰ قسم کے جنین کے مشابہ تھا یک بیک انسانی حقیقت میں تبدیل ہونے لگتا اور "ثم انشأناہ خلقاً اٰخر" کا مظاہرہ کرکے اعلان کرتا ہے "فتبارک اللہ احسن الخالقین" اور پھر پورے سات مہینہ تک اس جنین میں قدرت مختلف قسم کی نقاشیاں کرتی رہتی اور اس انسانی ڈھانچہ کو مکمل انسان بناتی رہتی ہے۔

اور جنین انسانی میں جو انقلاباتِ حقائق ہوتا رہتا ہے اور وہ ادنیٰ حقیقت چھوڑ کر اعلیٰ حقیقت اختیار کرتا رہتا ہے اگر بعض مرتبہ قدرتِ الٰہی اپنے مصالح کی بنا پر "خلقاً اٰخر" کا پورا مظاہرہ نہیں کرتی تو آپ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کے ایسا بچہ پیدا ہوا ہے جو بیل یا بندر یا بن مانس کی شکل ہی بلکہ بعض مرتبہ بعینہ ان حیوانات کی ہی شکل کا بچہ عالم وجود میں آجاتا ہے تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ قدرت کی صناعی نے اس کو اس لئے ادھورا چھوڑ دیا اور مکمل انسانوں کی شکل میں اس حقیقت کو تبدیل نہیں کیا کہ چشم عبرت اس سے عبرت حاصل کرے اور خدا کا شکر ادا کرے کہ اس نے ہم کو انسان بنایا اور عقل وخرد عطا فرما کر کائنات سے ممتاز ومشرف فرمایا ورنہ خدا چاہتا تو ہم بھی رحمِ مادر میں اسی طرح ہوکر رہ جاتے۔ نیز اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہوسکے کہ خود انسان کا

جنین بھی کن کن جامہائے حقائق کو ترک کر کے انسانی جامہ پہنتا اور تب "انسان" کہلانے کے قابل بنتا ہے
پس اگر تبدیلیِ حقائق کا یہ مظاہرہ روز و شب کائناتِ بحر و بر میں ہوتا رہتا ہے تو اگر ایک انسان کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ خاص حالات و تاثرات نے اس میں یہ ردِ عمل (ری ایکشن) پیدا کر دیا کہ وہ انسانی شکل و صورت کو چھوڑ کر جو کہ اس کی تخلیق کا سب سے بلند اور آخری انقلاب تھا اپنی خلقت کے اس پچھلے درجہ میں منقلب ہو گیا جو کہ حیوانی شکل سے متعلق ہے تو عقل و فلسفہ کا کونسا نظریہ اس کی تردید کر سکتا ہے؟

بہر حال ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا عقلاً کوئی مستبعد بات نہیں ہے جو "مسئلۂ مسخ" پر وارد ہو سکے۔ البتہ یہ امر کہ یہ واقعہ درحقیقت پیش آیا یا نہیں، سو اس کا تعلق عقل سے نہیں ہے بلکہ علمِ تاریخ اور نقلِ صحیح سے متعلق ہے اور جبکہ قرآن کے علمِ یقین نے اس واقعہ کا بصراحت اظہار کیا ہے اور جمہور سلف و خلف اس واقعہ کی تفسیر میں "مسخ حقیقی" کا اعتراف کرتے چلے آتے ہیں تو محض اس لئے کہ عام طور پر ہم ایسے واقعات کا مشاہدہ نہیں کرتے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی شے کے مشاہدہ نہ کرنے یا اس کے زیرِ نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں وہ شے موجود نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں مشہور طبیب اور ماہرِ فن زکریا رازی نے جذام (Leprosy) پر بحث کرتے ہوئے اس کی مختلف اقسام میں سے سب سے ردی اور خراب قسم یہ بتائی ہے کہ جسم میں زہر پھیل کر خون اس درجہ فاسد ہو جاتا ہے کہ وہ اعصاب اور شرائین میں تشنج پیدا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے مریض کا جسم ایک گھنونے اور مکروہ صورت بندر کی طرح نظر آنے لگتا ہے اور اس درجہ پر پہنچ کر مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔

زکریا نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مرضِ جذام کے متعلق ان کی یہ تحقیق ذاتی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اطبائے یونان اور قدیم اہلِ فن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

لہٰذا کیا عجب ہے کہ بنی اسرائیل کی اس جماعت پر خدائے تعالیٰ کا عذاب اس طرح نازل ہوا

کہ ایک جانب تو ان کے قلوب مسخ ہو کر قلوبِ انسانی کے خواص سے محروم کر دیئے گئے۔ اور دوسری جانب ان کے جسم بدترین جذام کے ذریعہ اس درجہ خراب کر دیئے گئے کہ وہ بندر اور خنزیر کی شکل میں تبدیل نظر آنے لگے۔ "کونوا قردۃ خاسئین۔"

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صحیح احادیث میں یہ آتا ہے کہ جو قومیں حیوانات کی شکل میں مسخ ہوئی ہیں وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہیں[۱] یعنی مسخ کا عذاب ان کے اندرونظام کو اس درجہ فاسد اور گندہ کر دیتا ہے کہ وہ پھر جانبر نہیں ہو سکتیں اور جلد ہی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ پیدا نہیں کرنا چاہئے کہ اگر مسخ کو معنیً اور صورتاً دونوں حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو اس سے تناسخ (آواگون) لازم آجاتا ہے حالانکہ یہ باطل اور فاسد عقیدہ ہے یہ شبہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ تناسخ میں روح (جیو) ایک قالب (کالبد) کو چھوڑ کر دوسرے قالب میں چلی جاتی ہے اور انسانی اعمالِ نیک و بد کی پاداش میں جون بدلنے کا یہ سلسلہ ازل کر ابد تک یونہی قائم ہے اور رہیگا لیکن مسخ کی صورت میں نہ روح بدلتی ہے اور نہ قالب بدلتا ہے بلکہ وہی قالب (جسم) ایک خاص ہیئت اور حقیقت سے دوسری حقیقت و ہیئت میں تبدیل ہو کر موت کی نذر ہو جاتا اور دوسرے مردہ انسانوں کی طرح مالکِ حقیقی کے سامنے اپنے اعمال کے جوابدہ ہونے کے لئے عالم برزخ کی سپرد کر دیا جاتا ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ اور عکرمہؒ کا مکالمہ

عکرمہؒ جو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کے شاگردِ رشید، ذکی و فہیم اور جلیل القدر تابعی ہیں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ابنِ عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ ان کی گود میں قرآنِ عزیز کھلا ہوا رکھا ہے اور اُن پر گریہ طاری ہے، یہ دیکھ کر کچھ دیر تو میں ان کی عظمت کی وجہ سے دور بیٹھا رہا مگر جب اس حالت میں ان پر کافی وقت گذر گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے قریب جا کر بعد سلام عرض کیا: اللہ تعالیٰ مجھ کو آپ پر قربان

---

[۱] مسند احمد

کرے یہ تو فرمائیے کہ آپ کس لئے اس طرح رو رہے ہیں؟ ابنِ عباسؓ فرمانے لگے میرے ہاتھ میں جو یہ ورق ہیں مجھ کو رُلا رہے ہیں، میں نے دیکھا تو سورۂ اعراف کے ورق تھے، پھر مجھ سے فرمایا تم ایلہ کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا جانتا ہوں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس بستی میں بنی اسرائیل رہتے تھے ان کے یہاں سبت کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر آجاتی تھیں اور سبت کے بعد پانی کی تہ میں بیٹھ جاتی تھیں اور بمشکل ایک دو ہاتھ آتی تھیں کچھ دن گذرنے پر شیطان نے ان میں سے بعض کو یہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ نے سبت میں مچھلی کھانے کو منع فرمایا ہے۔ مچھلی کے شکار کو نہیں منع فرمایا اس لئے انھوں نے یہ کیا کہ سبت کے دن خاموشی کے ساتھ مچھلیاں پکڑ لیتے اور دوسرے دن کھا لیتے۔ جب یہ حیلہ عام ہوگیا تو اہلِ حق نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ سبت کے دن مچھلی پکڑنا، شکار کرنا اور کھانا سب منع ہے لہٰذا تم اس حیلہ جوئی کو چھوڑو ورنہ خدا کا عذاب تم کو برباد کر ڈالے گا۔ مگر جب انھوں نے نہ مانا تو اس دوسری جماعت میں سے ایک جماعت لگے ہفتہ ان سے جدا ہوگئی اور وہ مع اپنے اہل و عیال ان سے دور جا بسے اور ایک جماعت نے سبت کی خلاف ورزی کو بُرا تو جانا مگر مخالفین کے ساتھ ہی رہتے رہے اور ان سے ترکِ تعلق نہیں کیا چنانچہ داہنے بلنو (المیمنون) یعنی ترکِ تعلق کرنے والوں نے جب نافرمانوں کو ڈانٹا اور عذاب الٰہی سے ڈرایا تو بایاں بانو (الیسرون) کہنے لگا "لِمَ تعظون قومًا اللہ مھلکھم او معذبھم" تب (المیمنون) نے جواب دیا "معذرۃ الی ربکم ولعلھم یتقون" بالآخر ایک روز امر بالمعروف کرنے والی جماعت نے مخالفین کو مخاطب کر کے کہا کہ یا تو تم باز آجاؤ ورنہ ہم یقین کرتے ہیں کہ کل تم پر ضرور کوئی عذاب نازل ہو کر رہے گا۔

اس کے بعد سرکشوں پر عذاب نازل ہونے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ میں دو جماعتوں کے مآل اور انجام کا تو ذکر فرمایا ہے ایک سرکش اور متمرد انسانوں کی جماعت جو ہلاک اور مسخ کردی گئی اور دوسری (المیمنون) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والی

لہ تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب حیل کے مختلف حیلوں میں کا ایک حیلہ یہ بھی تھا۔ مولف

جماعت کہ اس نے نجات پائی اور عذاب سے محفوظ رہی۔ لیکن تیسری جماعت یعنی ساکتین (الیسرون) کا کوئی ذکر نہیں فرمایا اور میرے دل میں ان کے متعلق ایسے خیالات آتے ہیں کہ میں ان کو زبان سے کہنا پسند نہیں کرتا (یعنی وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے چونکہ باز رہے اگرچہ خود خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے لہٰذا وہ بھی کہیں عذاب کے تو مستحق نہیں قرار دیئے گئے اور سرکشوں کے زمرہ میں تو داخل نہیں کر لیئے گئے ؟) تب میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں۔ آپ اس بارہ میں اس قدر پریشان نہ ہوں بلاشبہ یہ تیسری جماعت بھی نجات پانے والوں میں ہی رہی اس لیئے کہ خود قرآنِ عزیز ان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ انھوں نے نصیحت کرنے والوں سے یہ کہا "کہ تم ایسی جماعت کو کس لئے نصیحت کرتے ہو جس کی بداعمالیوں کی بنا پر خدائے تعالیٰ یا ان کو ہلاک کرنے والا ہے اور یا کسی سخت عذاب میں ڈالنے والا ہے" تو ان کے متعلق قرآنِ عزیز کی یہ تعبیر صاف صاف بتا رہی ہے کہ وہ ہلاک نہیں کئے گئے ورنہ تو ان کا ذکر بھی ہلاک ہونے والوں ہی کے ساتھ کیا جاتا نجات پانے والوں کے ساتھ نہ ہوتا۔ نیز یہ جماعت اس عملِ بد کے بدکرداروں کی حرکات سے مایوس ہو کر ایسا کہتی تھی اس لئے بھی مستحقِ عذاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سنا تو بیحد مسرور ہوئے اور آیات کی اس تفسیر پر مجھ کو خلعت بخشا۔

مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی

جو قومیں خدائے تعالیٰ کے عذاب سے مسخ کردی جاتی ہیں وہ زندہ باقی نہیں رکھی جاتیں بلکہ تین دن کے اندر اندر ان کو فنا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل کا سلسلہ جاری نہ ہو اور دنیا میں ان کا وجود خود ان کے لئے بھی عرصہ تک باعثِ ذلت و خواری نہ رہے چنانچہ صحیح روایات میں یہ بصراحت موجود ہے۔

عن ابن مسعود قال سألنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن القردۃ والخنازیر من نسل الیہود؟ فقال لا ان اللہ لم یلعن قوما قط	حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے دریافت کیا کہ یہ بندر و خوک مسخ شدہ یہود کی نسل میں سے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا نہیں اللہ تعالیٰ کسی قوم پر جب مسخ کی لعنت مسلط کرتا ہے

فمسخهم فکان لهم نسلٌ ولکن هذا	تو اس کی نسل نہیں چلاتا. لیکن یہ جانور خدا کی مستقل مخلوق
خلقٌ کان فلما غضب الله علی الیهود	ہیں لہذا جب خدا کا غضب یہود پر نازل ہوا تو ان کو ان
فمسخهم جعلهم مثلهم ؎۱	جانوروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

لم یمسخ قوماً فیجعل لهم نسلاً	اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جب مسخ کرتا ہے تو ان کو باقی چھوڑتا ہے
ولا عقباً وان القردة والخنازیر	اور نہ ان کی نسل چلتی ہے۔ اور بندر اور خوک تو مسخ کے
کانت قبل ذلك ؎۲	واقعہ سے قبل بھی موجود تھے۔
عن ابن عباس قال ولم یعش مسخ	حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسخ شدہ انسان تین
قط فوق ثلثة ایام ولم یاکل	دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور نہ انھوں نے اس درمیان
ولم یشرب ولم ینسل ؎۳	میں کھایا پیا اور نہ ان کی نسل کا سلسلہ چلا۔

بصائر (۱) امر بالمعروف ونہی عن المنکر ”عظیم الشان فریضہ ہے اور انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مقصدِ عظیم بھی اسی فرض کو پورا کرنا ہے اور جب کسی قوم اور امت میں کوئی نبی یا رسول موجود نہ ہو تو پھر علماءِ امت کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اس فرض کو انجام دیں. چنانچہ قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث نے بھی امتِ مرحومہ کو اس فرض کی جانب بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور تعمیل کرنے والے کو اجر و ثواب کی بشارت اور ترک کرنے والے کو مستحقِ عقاب و وعید قرار دیا ہے

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم دنیا کی بہترین امت ہو جو کائناتِ انسانی کے لئے
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئی ہے تاکہ ان کو بھلی باتوں کا حکم کرو اور بری
عَنِ الْمُنْکَرِ (الآیہ) آل عمران	باتوں سے باز رکھو۔
لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ	بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا اُن پر
عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ	داؤدؑ اور عیسیٰ بن مریمؑ کی زبانی لعنت کی گئی اس لئے کہ وہ

؎۱ و ؎۲ مسند احمد، ابو داؤد طیالسی، مسلم۔ ؎۳ ابن کثیر ج ۱

ذَالِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ	نافرمانی کرتے اور خدا کی حدود سے تجاوز کرتے تھے۔ وہ بری
كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ	باتوں سے لوگوں کو نہیں روکتے تھے اور ان کے یہ کردار
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ہ (مائدہ)	بہت ہی برے تھے۔
عن عدی بن عمیرۃ یقول سمعت	عدی بن عمیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان	فرماتے تھے: بلاشبہ اللہ تعالی خاص خاص لوگوں کی
اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ	بداعمالیوں پر عام لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرتا البتہ
حتی یروا المنکر بین ظہرانیھم وھم	جب ان لوگوں کے سامنے کہ جو ان برائیوں کے روکنے پر
قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکرونہ	قدرت رکھتے ہیں علی الاعلان معاصی ہونے لگیں اور
فاذا فعلوا ذلک عذب اللہ	وہ نہ روکیں تو بیشک اس وقت خدا اپنا عذاب عام وخاص
الخاصۃ والعامۃ ۔	سب پر نازل کر دیتا ہے۔
عن ابی سعید الخدریؓ ان رسول اللہ	حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم قال: من رای	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی کو برا عمل کرتا دیکھے تو
المنکر فلیغیرہ بیدہ ومن لم یستطع	اس کو چاہئے کہ ہاتھ سے روک دے اور جو اس کی طاقت نہ
فبلسانہ ومن لم یستطع فبقلبہ	رکھتا ہو وہ زبان سے روکے اور جو اس کی بھی طاقت نہ
وذلک اضعف الایمان۔	رکھتا ہو وہ دل ہی میں اس کو برا جانے اور یہ ایمان
مسلم	کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) کی حدیث اس جانب بھی توجہ دلاتی ہے کہ مسلمانوں میں اتنی قوت اور حاکمانہ اقتدار ضرور ہونا چاہئے کہ وہ اگر کسی کو برے عمل اور بدکرداری میں مبتلا دیکھیں تو طاقت وقوت سے اس کو روک دیں اور اگر انھوں نے یہ درجہ اپنی کوتاہیوں کی بدولت کھو دیا ہے تو پھر اس درجہ قوتِ ایمانی ضروری ہے کہ وہ زبان سے اس عملِ بد کے خلاف جہاد کر سکے۔

اور اگر اس درجہ سے بھی محروم ہے تو اس کے بعد سوائے اس کے ایمان کا کوئی اور درجہ نہیں ہے کہ وہ کم از کم اس عملِ بد کو برا سمجھے اور اس پر اظہارِ رضا نہ کرے۔ لہٰذا اس حدیث کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ جب ایک شخص کو پہلا یا دوسرا درجہ حاصل ہی نہیں تو پھر دوسرا یا تیسرا جو درجہ بھی حاصل ہے اس کے اختیار کر لینے پر وہ ضعیف یا اضعف الایمان کیوں قرار پاتا ہے

(۳) انسان کی مختلف گمراہیوں میں سے بہت بڑی گمراہی یہ بھی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی سے بچنے کے لئے حیلے اور بہانے تراش کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی سعی کرے کیونکہ اس طرح وہ شریعتِ حقہ کے اوامر و نواہی کو مسخ کرنے کا مرتکب ہوتا ہے، قرآن اور توراۃ دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اس گمراہی میں بھی پیش پیش اور اس اقدام پر بہت جری تھے اور اسی لئے ان پر مسخ کا عذاب نازل ہوا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی بیان کردہ اس واقعہ کی روشنی میں امتِ مرحومہ کو سخت تاکید فرمائی ہے کہ وہ ایسی گمراہی پر ہرگز اقدام نہ کریں اور اپنا دامنِ عمل اس سے بچائے رکھیں۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ترتکبوا ما ارتکبت الیھود فتستحلوا محارم اللہ بادنی الحیل ۔[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسی گمراہی کا ہرگز ارتکاب نہ کرنا جس کا یہود نے ارتکاب کیا کہ اللہ کی حرام کی ہوئی باتوں کو معمولی حیلوں کے ذریعہ حلال کر لیتے تھے۔ (حالانکہ وہ حلال نہیں ہو جاتی تھیں۔)

مگر افسوس کہ ہم نے آج اس کو بھی اپنا لیا اور یہود کی طرح ہم نے بھی اللہ کے فرائض سے بچنے کے لئے حیلے تراش لئے مثلاً ایسے تمول اور سرمایہ داری کے باوجود کہ جس پر خدا کا حکم "واتوا الزکوٰۃ" وارد ہوتا ہو صرف زکوٰۃ سے بچنے کے لئے یہ حیلہ نکال لیا کہ اس سرمایہ پر پورا ایک سال اپنی ملکیت میں نہ ہونے دیا جائے تاکہ "حولانِ حول" کی شرط پوری نہ ہونے پائے۔ اور چھ ماہ بعد اس کو اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیا اور اس سلسلہ کو برابر جاری رکھا اور اس طرح "الذین یکنزون الذھب

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱

والفضة" کا لطف اٹھاتے رہے (اعاذنا اللہ من ذلک)

البتہ فقہاءِ امت نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی غرض سے نہیں بلکہ امت کو کسی ضیق اور تنگی سے نکالنے کے لئے استنباط اور اجتہادِ صحیح کے ذریعہ جو بعض آسانیاں بہم پہنچائیں اور جو دراصل صاحبِ شریعت کے اوامر و نواہی کے مقاصد کو فوت نہیں ہونے دیتیں تو وہ اس وعید کا مصداق نہیں ہیں مگر ان مسائل کے لئے کتاب الحیل کی تعبیر صحیح نہیں ہے بلکہ ان کا عنوان کتاب التسہیل ہونا چاہیے تھا۔

(۳) قرآنِ عزیز کے مطالعہ سے یہ بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیشہ "پاداشِ عمل از جنسِ عمل" ہو جیسا کہ مسئلۂ زیرِ بحث میں بھی موجود ہے ۔ کہ اصحابِ سبت نے حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ سبت کے قانون کو مسخ اور محرف کر دیا تھا لہٰذا ان کیلئے سزا بھی "مسخ" ہی تجویز کی گئی ، حافظ ابن کثیرؒ اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں ۔

فلما فعلوا ذلک مسخهم الله الی صورة	پس جب یہود نے یہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بندروں کی شکل
القردة وهی اشبه شیٔ بالاناسی فی الشکل	میں مسخ کر دیا اور یہ اس لئے کہ ظاہر شکل میں بندر انسان سے
الظاهر ولیست بانسانٍ حقیقة فلذلک	زیادہ مشابہ ہے اگرچہ حقیقت میں وہ انسان نہیں ہے ۔
اعمال هؤلاء وحیلهم لما کانت مشابهة	پس جبکہ ان یہود کے یہ اعمالِ بد اور حیلے ظاہر میں حق کے
للحق فی الظاهر ومخالفة فی الباطن	مشابہ اور باطن میں اس کے مخالف ہیں تو ان کو سزا بھی جنسِ
کان جزاؤهم من جنس العمل [1]	عمل ہی سے دی گئی ۔

(۴) ادائے فرض میں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے کہ جن کے مقابلہ میں یہ فریضہ ادا کیا جا رہا ہے وہ اس کو قبول کرتے ہیں یا نہیں اس لئے کہ اس ادائے فرض کی جزا میں یہ کیا کم سعادت ہے کہ وہ شخص بہرحال اجر و ثواب اور رضائے الٰہی سے معزز و مفتخر ہوتا ہے "وذلک فضل الله یؤتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم"

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۰۵

اصحاب الرّس

تقریباً ۶۲۳ سنہ ق م - یا (مدتِ نامعلوم)

رس - قرآنِ عزیز اور اصحاب الرس - اصحاب الرس؟ قولِ راجح - موعظت -

رس لغت میں "رس" کے معنی پرانے کنویں کے ہیں اس لئے اصحاب الرس کے معنی ہوئے "کنویں والے" قرآنِ عزیز نے اس نسبت کے ساتھ ایک قوم کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں اس کی ہلاکت و بربادی کا ذکر کیا ہے۔

قرآنِ عزیز اور اصحاب الرس قرآنِ عزیز نے سورۂ فرقان اور ق میں ان کا ذکر کیا ہے اور جن قوموں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب و استہزاء کے سبب ہلاکت و تباہی مول لی ان کی فہرست میں صرف ان کا نام بیان کر دیا ہے اور حالات و واقعات سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ	اور عاد ثمود اور اصحاب الرس کو اور ان کے درمیانی زمانہ
قُرُوْنًا بَیْنَ ذٰلِكَ كَثِیْرًا ۝ وَكُلًّا ضَرَبْنَا	کی بہت سی (قوموں) کو (ہم نے ہلاک کر دیا) اور ہم نے ہر ایک
لَهُ الْاَمْثَالَ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا (فرقان)	کے واسطے مثالیں بیان کیں اور ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔
كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ	ان سے پہلے (بھی) نوح کی قوم نے اور کنویں والوں نے
وَثَمُوْدُ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ	اور ثمود عاد فرعون برادرانِ لوط اصحابِ ایکہ اور تبع کی قوم
وَّاَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ	نے (رسولوں کو) جھٹلایا، ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو
الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیْدِ ۔ (ق)	جھٹلایا پس ان پر عذاب لازم ہوا۔

اصحاب الرس؟ ان کو اصحابِ الرس کیوں کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں علماءِ تفسیر کے اقوال اس درجہ مختلف ہیں کہ حقیقتِ حال بجائے منکشف ہونے کے اور زیادہ مستور ہو گئی ہے۔

(۱) ابن جریرؒ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ رس کے معنی "غار" کے بھی آتے ہیں: اس لئے

اصحابِ اخدود (گڑھوں والے) ہی کو اصحاب الرس بھی کہتے ہیں۔

لیکن یہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ سورۂ قٓ میں اصحاب الرس کا ذکر ان قوموں کے ساتھ کیا گیا ہے جو حضرت عیسٰی (علیہ السلام) سے قبل ہوگذری ہیں اور سورۂ فرقان میں عاد ثمود اور اصحاب الرس کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے "وقرونًا بین ذلک کثیرا" اور ان کے درمیانی زمانہ کی بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا" اس کا تقاضا یہ ہے کہ اصحاب الرس کا زمانہ کم از کم حضرت عیسٰی (علیہ السلام) سے قبل ہونا چاہئے اور اصحاب الاخدود کا زمانہ عیسٰی (علیہ السلام) سے صدیوں بعد ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کے ان بیانات میں تصریح ہے کہ اصحاب الرس ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور اصحاب الاخدود کے متعلق قولِ صحیح یہ ہے کہ وہ اپنے مشہور ظلم کے بعد فوراً ہلاک نہیں کئے گئے اور ان کو مہلت اور ڈھیل دی گئی کہ وہ باز آجائیں ورنہ پاداشِ عمل کے لئے تیار رہیں جیسا کہ عنقریب واقعہ کی تفصیل سے ظاہر ہو جائے گا۔

(۲) ابنِ عساکرؒ نے تاریخ میں اپنا رجحان اس روایت کی جانب ظاہر کیا ہے کہ اصحاب الرس عاد سے بھی صدیوں پہلے کی ایک قوم کا نام ہے، یہ جس جگہ آباد تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبر حنظلہ بن صفوان کو مبعوث کیا تھا انھوں نے ان میں رہ کر تبلیغ اسلام کی مگر اصحاب الرس نے کسی طرح حق کو قبول نہیں کیا اور پیغمبرِ خدا کو قتل کر دیا اس پاداش میں وہ سب ہلاک کر دیئے گئے۔ [۱]

لیکن اس روایت سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ ان کو "کنویں والے" کیوں کہا گیا اور یہ نسبت واقعہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتی ہے؟۔

(۳) ابن ابی حاتمؒ بروایت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نقل کرتے ہیں کہ آذربیجان کے قریب ایک کنواں تھا یہ قصہ چونکہ اس سے تعلق رکھتا ہے اس لئے وہاں کے بسنے والوں کو اصحاب الرس کہتے ہیں۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ اس کنویں کے قریب آباد قوم نے اپنے نبی کو چونکہ مسطورہ بالا کنویں میں ڈال کر زندہ دفن کر دیا تھا اس لئے ان کو "اصحاب الرس" کہا گیا۔ [۲]

[۱] و [۲] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر ج ۱۔

(۴) اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ یمامہ کے علاقہ میں فَلج نام کی ایک بستی تھی اصحاب الرس وہیں آباد تھے اور یہ اور اصحاب یاسین (اصحاب القریہ) ایک ہی ہیں اور یہ مختلف نسبتوں سے پکارے جاتے ہیں[1]، ایک روایت عکرمہؓ سے بھی اس کی تائید میں موجود ہے لہذا معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی حاتم اور عکرمہ دونوں کی روایت کا ایک ہی مطلب ہے۔ مگر یہ دونوں رائیں بھی مشکوک ہیں اس لئے کہ قرآن عزیز نے اصحاب القریہ (اصحاب یٰسین) اور اصحاب الرس کا تذکرہ جدا جدا کیا ہے اور دونوں تذکروں میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ یہ طرز بیان اصول بلاغت کے خلاف ہے کہ ایک ہی معاملہ کو جدا جدا نسبتوں اور کیفیتوں کے ساتھ بیان کیا جائے اور ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ اشارہ موجود نہ ہو کہ یہ مختلف نسبتیں اور تعبیریں ایک ہی معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسی کوئی تفسیر مذکور ہے جو دونوں کو ایک ظاہر کرتی ہو۔ خصوصاً جبکہ قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ اصحاب الرس کا معاملہ قبل مسیح علیہ السلام ہے اور تاریخ اور تحقیق یہ ثابت کر چکی ہے کہ اصحاب القریہ کا معاملہ مسیح (علیہ السلام) کے بہت بعد کا ہے۔[2]

(۵) ابو بکر عمر بن حسن نقاش اور سہیلی کہتے ہیں کہ اصحاب الرس کی آبادی میں ایک بہت بڑا کنواں تھا جس کے پانی سے وہ پینے اور کھیتی سیراب کرنے دونوں کا کام لیتے تھے۔ اس بستی کا بادشاہ بہت عادل تھا اور لوگ اس سے بیحد محبت کرتے تھے۔ اس کا جب انتقال ہو گیا تو اہل شہر اس کی موت سے سخت غمگین اور حزین تھے کہ ایک دن شیطان بادشاہِ عادل کی شکل بنا کر پہنچا اور اہلِ شہر کو جمع کر کے تقریر کی کہ میں تم سے کچھ دنوں کے لئے جدا ہو گیا تھا مرا نہیں تھا اب آ گیا ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا، لوگوں نے انتہائے محبت میں یقین کر لیا اور اس کی آمد پر جشن منایا تب شیطان نے ان کو حکم دیا کہ وہ ہمیشہ مجھ سے پسِ پردہ باتیں کیا کریں چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور وہ پسِ پردہ بیٹھ کر گمراہی پھیلانے لگا۔ اس وقت بقول سہیلی صاحبِ

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر ج ۱۔ [2] یہ بحث عنقریب آنے والی ہے۔

• صاحبِ روض الانف" ایک شخص حنظلہ بن صفوان کو خواب میں یہ بتایا گیا کہ ان کو اس آبادی میں راہِ ہدایت دکھانے کے لئے پیغمبر بنا دیا گیا، صفوان نے ان کے پاس جا کر توحید کی تعلیم اور شرک سے اجتناب کی تلقین کی اور بتایا کہ یہ تمہارا بادشاہ نہیں ہے بلکہ پسِ پردہ شیطان ہے۔ لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار گذری اور قبولِ حق کی بجائے پیغمبرِ خدا پر حملہ کر کے ان کو قتل کر دیا، اس پاداش میں ان کو خدا کے عذاب نے تباہ و برباد کر دیا اور کل جس بستی میں چہل پہل تھی اور باغات اور نہروں سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا آج وہ جل بُھن کر چٹیل میدان نظر آنے لگا جس میں کتوں، بھیڑیوں اور شیروں کے مسکن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

یہ روایت اصولِ روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار ہے اور من گھڑت داستان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ [1]

(۶) محمد بن کعب قرظیؒ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا" ان اول الناس یدخل الجنۃ یوم القیمۃ العبد الاسود" (جنت میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہو گا وہ ایک سیاہ غلام ہو گا) اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی میں اپنا پیغمبر بھیجا مگر اس کالے کلوٹے غلام کے علاوہ کسی نے اس کو قبول نہیں کیا اور کوئی ایمان نہیں لایا، پھر اہلِ شہر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نبی کو ایک کنویں میں بند کر دیا اور کنویں کے منہ پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا تاکہ کوئی کھول نہ سکے مگر یہ سیاہ فام غلام جنگل سے لکڑیاں لاتا، بازار میں فروخت کرتا اور ان کی قیمت سے کھانا خرید کر روزانہ کنویں پر پہنچ کر پتھر کو ہٹاتا اور خدا کے پیغمبر کی خدمت میں کھانا پیش کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر جنگل میں نیند طاری کر دی اور یہ چودہ سال تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ یہاں تو یہ ہوا اور اُدھر قوم کو اپنی نازیبا حرکت پر افسوس آیا اور انھوں نے پیغمبرِ خدا کو کنویں سے نکال لیا اور توبہ کے بعد ایمان قبول کر لیا اور اسی مدت کے اندر پیغمبر کا انتقال ہو گیا۔ چودہ سال کے بعد جب غلام کی آنکھ کھلی تو اس نے سمجھا کہ میں چند گھنٹے سویا ہوں جلدی سے لکڑیاں چن کر شہر میں پہنچا

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان البدایہ والنہایہ ج ۱۔

دیکھا تو حالات بدلے ہوئے ہیں دریافت کیا تو سارا قصہ معلوم ہوا۔ اسی غلام کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے ایک سیاہ فام غلام جائے گا۔ [۵۱]

یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے بھی قابلِ جرح ہے اور درایت کے اعتبار سے بھی چنانچہ محدثین کہتے ہیں کہ یہ طویل داستان خود محمد بن کعب کی جانب سے ہے جس کو انھوں نے اسرائیلیات سے اخذ کر کے بیان کیا ہے، نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے کوئی تعلق نہیں [۵۲]۔ علاوہ ازیں قرآن عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اصحاب الرس بھی ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور یہ روایت اس کے خلاف ان کو نجات یافتہ بیان کرتی ہے اس لئے قطعاً غلط ہے اور روایت کا وہ جملہ جو تومین میں "عبد اسود" سے متعلق ہے اگر بسندِ صحیح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت بھی ہو جائے تو بھی اس کا اصحاب الرس کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابن جریرؒ نے بھی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس پر اسی قسم کی جرح وارد کی ہے۔

(۷) مشہور مورخ مسعودی کہتا ہے کہ اصحاب الرس حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں اور یہ دو قبیلے تھے ایک قیدمان (قیدماہ) اور دوسرا یامین یا رعویل اور یہ یمن میں آباد تھے [۵۳]۔

لیکن مسعودی نے صرف اسی قدر تعارف پر اکتفا کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے نہیں بتایا کہ وہ کن وجوہ کی بنا پر قیدماہ اور رعویل کو اصحاب الرس کہتا ہے اور ان کو "رس" سے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ یہ صحیح ہے کہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام قیدماہ بھی ہے۔ لیکن توراۃ اور تاریخ دونوں اس بات سے خاموش ہیں کہ اس کی اولاد کو اصحاب الرس بھی کہا جاتا ہے لہٰذا مسعودی کا قول دلیل کا محتاج ہے۔

مگر صاحب ارض القرآن نے صرف اس بنا پر کہ مسعودی نے اپنی رائے تذبذب اور تردد کے ساتھ بیان نہیں کی اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ [۵۴]

(۸) مصر کے ایک مشہور معاصر عالم فرج اللہ زکی کردی کہتے ہیں کہ لفظ "رس" "ارس" کی تخفیف ہے

---

[۵۱] و [۵۲] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان والبدایہ والنہایہ ج ۱۔ [۵۳] مروج الذہب ص ۵۶ حاشیہ الکامل ج ۱ [۵۴] ارض القرآن ج ۲ ص ۵۶۔

اور یہ اس مشہور شہر کا نام ہے جو قفقاز کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس وادی ارتن میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو مبعوث فرمایا جس کا نام ابراہیم زردشت تھا انھوں نے اپنی قوم کو دینِ حق کی دعوت دی مگر قوم نے انکار کیا اور ان کی دعوت وارشاد کے مقابلہ میں اور زیادہ سرکشی اور بغاوت اختیار کرلی چنانچہ قوم نے اس کی سزا پائی اور ہلاک کردی گئی۔ اس کے بعد ان کی دعوت کا میدانِ عمل اس مخصوص علاقہ قفقاز (آذربیجان وغیرہ) سے کل ایران تک وسیع ہوگیا۔ زردشت کا صحیفہ اگرچہ محرف ہوچکا ہے مگر اس کا ایک حصہ اب بھی قدیم فارسی میں مکتوب موجود ہے[۱]۔ اور اس صحیفہ میں اب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دینِ اسلام کی بشارت کا ذکر پایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔

عنقریب عرب میں ایک "نبیِ عظیم" مبعوث ہوگا اور جب اس کی شریعت پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذر جائے گا اور دوسرا ہزار شروع ہوگا تو اس دین میں ایسی باتیں پیدا ہوجائیں گی کہ یہ پہچاننا مشکل ہوجائے گا کہ کیا یہ دین وہی دین ہے جو اپنے قرنِ اول میں تھا (یعنی بدعات واہواء اور رسوم قبیحہ پیدا ہوجائیں گی)۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کی اصل اور حقیقی تعلیم "تعلیمِ حق" تھی اور اسی لئے انھوں نے بعثتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بشارت دی اور بعض ایسی تفصیلات کا بھی ذکر کیا جو آج حرف بحرف صحیح ثابت ہورہی ہیں مگر دوسرے ادیان وملل کی طرح ان کے متبعین نے بھی اس تعلیمِ حق کو مسخ ومحرف کرڈالا، ان کے متبعین مجوس (پارسی) اب بھی ایران وہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔[۲]

علامہ زکی کے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کتبِ تفسیر میں ایک قول ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب الرس، آذربیجان کے قریب ایک کنویں کی نسبت سے مشہور تھے۔ لہذا ممکن ہے کہ یہ "نہر ارس" ہی سے مراد ہو اور ابنِ کثیر میں ہے۔

---

[۱] اوستا کی جانب اشارہ ہے۔ [۲] حاشیہ تاریخ ابنِ کثیر ج ۲ ص ۴۳-۴۲ مختصراً

واصحاب الرس قال بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آذربیجان میں ایک پرانا کنواں "رس" تھا اس بیر باذر بیجان وادی میں رہنے والے اسی وجہ سے اصحاب الرس کہلاتے تھے۔

بلکہ خود ابن کثیر (رحمہ اللہ) نے اپنی تفسیر میں اس آیت "اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ" کے تحت میں زردشت کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے۔

والمجوس یقال انھم کانوا یؤمنون بنبی لھم یقال لہ زردشت ثم کفروا بشرعہ فرفع من بین اظہرھم۔[۲] واللہ اعلم۔

اور مجوس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر مبعوث پیغمبر زردشت پر اول ایمان لے آئے تھے اس کے بعد انھوں نے کفر کی راہ اختیار کرلی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس پیغمبر کو ان کے درمیان سے اٹھالیا۔ واللہ اعلم۔

ادیان وملل کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم زردشت کی اصل تعلیم انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم حق ہی کے مطابق تھی اور وہ یرمیاہ (علیہ السلام) یا دانیال (اکبر) علیہ السلام کے تلمیذ اور فیض یافتہ تھے ذوالقرنین کے واقعہ میں انشاء اللہ تعالیٰ قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

قول فیصل | اس مسئلہ میں قرآن کا ظاہر یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل ہو گذرا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ یہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان زمانہ کی کسی قوم کا تذکرہ ہے یا کسی قدیم العہد قوم کا تو قرآن نے اس سے تعرض نہیں کیا اور مسطورہ بالا تفسیری روایات سے اس کا قطعی فیصلہ ناممکن ہے البتہ میرا وجدان آخری قول کو راجح سمجھتا ہے۔

بہرحال قرآن کا جو مقصد موعظت وعبرت ہے وہ اپنی جگہ صاف اور واضح ہے اور یہ تاریخی تعینات ومباحث اس کیلئے موقوف علیہ نہیں ہیں بلکہ ایک عبرت نگاہ اور گوشِ حق نیوش کیلئے یہ کافی وشافی ہے کہ جو قومیں اس دنیا میں خدائے برتر کے پیغام حق کو ٹھکراتی اور اس کے خلاف بغاوت وسرکشی کا علم بلند کرتی ہیں اور مسلسل مہلت اور ڈھیل دینے کے باوجود وہ اپنی متکبرانہ اور مفسدانہ زندگی کو ترک کر کے صالح اور پاک زندگی بسر کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہوتیں تو پھر ان پر خدا تعالیٰ کی سخت گرفت "بطشِ شدید" آجاتی ہے اور وہ بے یار ومددگار ہلاک وبرباد کردی جاتی ہیں۔

موعظت | کائناتِ انسانی کے پاس جس وقت سے اپنی تاریخ کا ذخیرہ موجود ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ دنیا کی جس قوم نے بھی خدا کے پیغام حق کے ساتھ استہزار کا معاملہ کیا اور خدا کے پیغمبروں اور ہادیوں کے ساتھ سرکشی اور شرارت کو جائز رکھا ان کی زبردست طاقت وشوکت اور عظیم الشان تمدن کے باوجود قدرت کے ہاتھوں نے ہلاک وبرباد کرکے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا اور آسمانی یا زمینی عبرتناک عذاب نے صفحۂ عالم سے ان کو حرفِ غلط کی طرح محو کردیا مگر یہ عجیب بات ہے کہ اپنے پیشرووں کے ہیبتناک انجام کو دیکھنے اور سننے کے باوجود ان کی

[۱] منار۔ [۲] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۵۲

وارث قوموں نے پھر تاریخ کو دہرایا اور اسی قسم کی حرکات کو اختیار کیا جن کے انجام میں ان کے پیشرووں کو روزِ بد دیکھنا پڑا تھا "ان ھذا الشیٔ عجاب"

(۲) ایک حساس دل ودماغ کے لئے یہ تازیانۂ عبرت کافی ہے کہ اس دنیا میں جبکہ کسی شے کو بقا نہیں ہے اور ہر شے کے لئے فنا لازم تو پھر کبر ونخوت اور انانیت کے کیا معنی؟ اور جو مقدس ہستیاں اپنے اوصافِ کریمانہ اور اخلاقِ حسنہ کے ساتھ خدمتِ خلق اور ہدایت ورشد کو بغیر کسی دنیوی لالچ وتوقع کے انجام دیتی ہیں ان کے ساتھ تحقیر وتضحیک کا برتاؤ عقل کے کس فیصلہ کے مطابق ہے

اگر انسان اس زندگی میں ان دو حقیقتوں کی معرفت حاصل کرلے تو حیاتِ ابدی وسرمدی میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ اور یہی وہ رموزِ زندگی ہیں جن پر گامزن ہوکر قومیں "اصحاب الجنۃ" کہلائیں اور ان سے غافل رہ کر "اصحاب النار" کہلانے کی سزاوار ہوئیں۔

بیت المقدس اور یہود

سنہ ۶۰۴ ق م تا سنہ ۵۶۱ ق م و سنہ ۷۰ء تا سنہ ۱۸۰ء

تمہید۔ بیت المقدس (یروشلم)۔ قرآنِ عزیز اور شرارتِ یہود کے دو اہم معاملے۔ شرارتِ یہود کا پہلا دور۔ غلامی کے بعد نجات۔ شرارتِ یہود کا دوسرا دور۔ حضرت یحیٰی (علیہ السلام) کا قتل۔ پاداشِ عمل۔ تیسرا زریں موقعہ اور یہود کی روگردانی۔ ابدی ذلت وخسران۔ بصائر۔

تمہید جن اصحابِ ذوق نے قصص القرآن جلد اول ودوم کا مطالعہ فرمایا ہے ان کی نظر سے یہ پوشیدہ نہ رہا ہوگا کہ قرآنِ عزیز، اقوامِ ماضیہ کے تاریخی واقعات یعنی ان کے رشد وہدایات کے قبول وانکار اور اس کے نیک وبد نتائج وثمرات کے حالات پیشِ نظر لانے اور ان سے عبرت وبصیرت حاصل کرنے کی جگہ جگہ ترغیب دیتا ہے اور خود بھی اسی لئے گذشتہ قوموں کے ان واقعات کو بکثرت

بیان کرتا ہے جو اس مقصدِ عظمیٰ کے لئے مفید اور عبرت آموز ہیں اور اگر ان وقائع میں حقائق کے ساتھ غلط اور دور از کار داستانیں شامل ہوگئی ہیں تو ان کی اصلاح بھی کرتا جاتا ہے چنانچہ بہت سی وہ پیچیدگیاں جو گذشتہ اقوام وامم، ان کے مواطن ومساکن اور ان سے متعلق حالات میں صحیح اور غلط واقعات کے خلط ملط سے پیدا ہو چکی تھیں قرآنِ عزیز نے ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام پیچیدگیاں دور ہو کر حقیقتِ حال روشن سے روشن تر نظر آنے لگی چنانچہ ان واقعات سے متعلق اصل حقائق کا اظہار ہو جانے کے صدیوں بعد جب علم الآثار (Archaeology) علم طبقات الارض (Geology) اور تاریخی مشاہدات وتجربات کے ذریعہ ان اقوام وامم کے حالات ناقابلِ انکار درجہ تک روشنی میں آئے تو دنیا کو یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ قرآنِ عزیز نے ان سے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف صحیح نکلا اور اس کے بیان میں حقیقت سے سرِ مو تجاوز ثابت نہیں ہوا۔ رقیم (پیٹرا) کی تاریخِ ماضی، اصحاب الحجر کے واقعات، عاد وثمود کا تمدن اور مقامِ تاریخ۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل اور فرعونِ مصر کی آویزش کے واقعات، اور سدِ عرم کے حالات، غرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے تاریخی وقائع ہیں جو مسطورہ بالا حقیقت کے لئے زندۂ جاوید شہادت ہیں

پس کیا یہ قرآنِ عزیز کے کلام الٰہی ہونے کی ایک ناقابلِ تردید شہادت نہیں ہے کہ ایک "امّی" انسان ایک ایسے ملک میں جہاں ہر قسم کے علمی ذرائع مفقود و معدوم ہیں. دنیا کی قوموں کو رشد وہدایت کے سلسلہ میں اقوامِ ماضیہ اور امِم سابقہ کے ایسے تاریخی واقعات سناتا ہے جن کے ایک حرف کی بھی تردید نہیں ہو سکی اور صدیوں تک علماءِ تحقیق نے کروروں اور اربوں روپیہ اور اپنی قیمتی وقت اور عمر کو صرف کر کے جب ان حالات کو جدید "علومِ الکتشاف" کے ذریعہ مشاہدہ کی حد تک حاصل کیا تو ان کو بالآخر یہ اقرار کرنا پڑا کہ قرآن نے ان سے متعلق جو کچھ کہا اور جس قدر کہا بلاشبہ علمِ تحقیق اس کے آگے ایک شوشہ بھی اضافہ نہیں کر سکا چہ جائیکہ اس کے خلاف ثابت کر سکتا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر گذشتہ اقوام کے حالات

ظاہر کرکے عبرت آموز قلب اور بصیرت افروز نگاہ کے لئے بہت کچھ سامانِ رشد و ہدایت عطا فرمایا تاکہ موجودہ امم و اقوام سرکش اور مفسد قوموں کے نتائج بد اور ہولناک پاداشِ عمل سے عبرت حاصل کریں اور نکوکار و خیر اندیش قوموں کے حالات و واقعات اور ان کے ثمراتِ خیر کو اختیار کرکے دین و دنیا کی فوز و فلاح کو اپنا سرمایہ بنائیں اور چونکہ قرآنِ عزیز کا مقصد صرف موعظت و تذکیر ہے نہ کہ اقوام و امم کی مکمل تاریخ اس لئے اس نے نہ دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ بیان کی ہے اور نہ جن قوموں کی تاریخ سے تعرض کیا ہے ان کی پوری تاریخ کو پیش کیا ہے کیونکہ یہ اس کے موضوع اور مقصد سے خارج ہے وہ رشد و ہدایتِ اقوام کے لئے بلاشبہ ایک مکمل صحیفۂ قانون ہے مگر تاریخ و جغرافیہ یا فلسفہ و سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں وہ سب کچھ بھی موجود ہو جس کا فلسفہ و تاریخ کی کتابوں میں ہونا ضروری ہے۔

الحاصل۔ اممِ ماضیہ کے ان حالات و واقعات میں سے جو بدکردار اور نیک کردار انسانوں کے درمیان امتیاز پیدا کرتے اور قوموں کی انفرادی و اجتماعی اصلاح و انقلاب کے لئے سرمایۂ عبرت و بصیرت ثابت ہوتے ہیں۔ ایک اہم واقعہ وہ بھی ہے جو یہودِ بنی اسرائیل کی پیہم شرارتوں اور فساد انگیزیوں کی بنا پر دو مرتبہ مقدس ہیکل اور یروشلم (بیت المقدس) کی تباہی بربادی اور خود ان کی غلامی و رسوائی کی شکل میں ظاہر ہوا.... اور جس نے ان کی قومی ذلت اور اجتماعی ہلاکت پر ہمیشہ کے لئے مہر لگا دی۔

بیت المقدس بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے. یہ پاک جگہ اپنے ہیکل (مسجد) کی وجہ سے بنی اسرائیل کا قبلہ رہی ہے اور یہ مقدس مقام بے شمار انبیاء بنی اسرائیل کا مہبط و مدفن ہے اور اس کی عظمت نہ صرف یہود و نصاریٰ ہی کی نگاہ میں ہے بلکہ اس کو مسلمان بھی مقامِ مقدس مانتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ اسراء (معراج) نے اس کے تقدس کو اور بھی زیادہ چار چاند لگا دیئے ہیں اور جب بھی کوئی مسلمان سورۂ اسراء کو تلاوت کرتا ہے اس کے قلب میں

س مقام کا تقدس وجلال اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا — پاکی ہے اس ذات کے لئے جس نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا — کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی وہ مسجد اقصیٰ

الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا — جس کے اطراف کو ہم نے بڑی برکت دی ہے اور اس لئے سیر کرائی کہ

اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ — اپنی نشانیاں دکھائے بلاشبہ وہی ذات ہے جو دیکھنے والی سننے والی ہے

بیت المقدس کی اس مسجد کو "مسجد اقصیٰ" اس لئے کہتے ہیں کہ وہ مکہ (حجاز) سے بہت دور فاصلہ پر واقع ہے۔

معراج کے واقعہ میں جب قرآن نے "بیت المقدس" کا ذکر کیا تو ساتھ ہی اس جانب بھی توجہ دلائی کہ بنی اسرائیل کی دعوت و تبلیغ کا یہ مقام اور بنی اسرائیل کا قبلہ صلوٰۃ جو تمہارے نزدیک بھی عظمت و تقدیس سے معمور ہے یہود کی مفسدانہ سرگرمیوں اور احکام الٰہی کے خلاف مسلسل بغاوتوں اور شرارتوں کی وجہ سے دو مرتبہ تباہی و بربادی اور اہانت سے دوچار ہو چکا ہے اور نہ صرف یہ مقام بلکہ خود یہ بھی مشرکوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہو چکے ہیں مگر ان کو پھر بھی عبرت و بصیرت حاصل نہیں ہوئی اور آج جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ عامہ ان کو رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی عزت و عظمت کا پیغام سنا رہی ہے یہ اس کے ساتھ نفرت و حقارت ہی کا معاملہ کر رہے ہیں اور پہلے دو سانحوں کی طرح اب بھی غفلت اور سرکشی اختیار کر کے ابدی ذلت و خسران کو دعوت دے رہے ہیں۔

قرآن عزیز کہتا ہے کہ ہم نے کتاب (صحف انبیاء علیہم السلام) میں پہلے سے بنی اسرائیل کو آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ سخت فتنہ و فساد اور سرکشی و بغاوت کرو گے اور خدا کے اس مقدس مقام میں فتنہ ساماں بنو گے اور اس کی پاداش میں دونوں مرتبہ تم کو ذلت و ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑیگا اور جس سرزمین کو تم بہت زیادہ محبوب رکھتے ہو یہ بھی دو مرتبہ ظالموں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگی اس کے بعد ہم پھر ایک مرتبہ تم پر رحم کریں گے اور سعادت و فلاح کی طرف دعوت دیں گے پس اگر تم نے گذشتہ واقعات سے عبرت و موعظت حاصل کر کے اس دعوتِ حق پر

لبیک کہا اور اس کو بطیب خاطر قبول کیا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہاری اس سعادت کو نہیں سلب کرسکتی اور اگر تمہاری تاریخی کجروی اور سرکشی اور حق کے ساتھ بغاوت اور مخالفت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا اور گزرے ہوئے واقعات کی طرح اس مرتبہ بھی تم نے فساد وگمرہی کو اپنایا تو تمہاری جانب سے بھی پاداشِ عمل کا قانون اسی طرح پھر دُہرایا جائے گا اور اس کے بعد تم پر ابدی ذلت و رسوائی کی مہر لگادی جائے گی اور یہ سب کچھ تو دنیا کا معاملہ ہے اور ایسے سرکشوں کے لئے آخرت میں بہت بُرا ٹھکانا "جہنم" ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ	اور ہم نے کتاب (صحفِ انبیا) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر
لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ	دیدی تھی کہ تم ضرور ملک میں شر و فساد پھیلاؤ گے اور بڑی ہی
وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۔ فَاِذَا جَآءَ	سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔ پھر جب دو وقتوں میں سے پہلا
وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ	وقت آگیا تو (اے بنی اسرائیل) ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے بھیجدیئے
عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ	جو بڑے ہی خوفناک تھے پس وہ تمہاری آبادیوں کے اندر پھیل
فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا	گئے اور اللہ کا وعدہ تو اسی لئے تھا کہ پورا ہو کر رہے۔ پھر (دیکھو)
مَّفْعُوْلًا ۔ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ	ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے
عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ	موافق کردی اور مال و دولت اور اولاد کی کثرت سے تمہاری مدد
بَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۔ اِنْ	کی اور تمہیں پھر ایسا بنا دیا کہ بڑے جتھے والے ہوگئے۔ اگر تم نے
اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ	بھلائی کے کام کئے تو اپنے ہی لئے کئے اور اگر برائیاں کیں تو بھی اپنے
اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ	ہی لئے کیں۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے
لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ	اپنے دوسرے بندوں کو بھیجدیا تاکہ تمہارے چہروں پر رسوائی
كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا	کی کالک پھیر دیں اور اسی طرح (ہیکل) مسجد میں داخل ہوجائیں
مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۔ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ	جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر
وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ	برباد کر ڈالیں کچھ عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے

يٰلْكٰفِرِيْنَ   (اگر اب بھی باز آجاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی و فساد کی طرف لوٹ آؤ گے تو ہماری طرف سے

حَصِيْرًا ۝   پاداشِ عمل لوٹ آئے گی اور ہم نے منکرینِ حق کے لیے جہنم کا قید خانہ تیار کر رکھا ہے۔

اس مقام پر "الکتاب" سے مراد انبیاء بنی اسرائیل کے وہ صحیفے ہیں جن میں یہود کے دو مرتبہ سخت فساد اور سرکشی کرنے اور اس کی بدولت بیت المقدس کی بربادی اور ان کے ہلاک و غلام بن کر ذلیل و رسوا ہونے کے متعلق وہ پیشینگوئیاں کی گئی تھیں جو بذریعہ الہام و وحی ان کو خدا کی جانب سے معلوم ہوئی تھیں چنانچہ موجودہ توراۃ میں یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل اور زکریا[۵] (علیہم السلام) کے صحیفوں میں وہ اب بھی مذکور ہیں اور ان صحیفوں کا بیشتر حصہ اسی قسم کی پیشینگوئیوں پر مشتمل ہے اور ان تینوں صحیفوں میں دو مرتبہ کے ان فسادات اور فسادات سے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے سخت سزا کا جس تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اس سے حرف بہ حرف قرآن عزیز کے ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے۔

یسعیاہ کی کتاب میں یہود کی پہلی شرارت و فساد کا ذکر اس طرح شروع ہوتا ہے۔

رویا یسعیاہ بن اموص کی جو اس نے یہوداہ اور یروشلم کی بابت یہوداہ کے بادشاہوں عزیاہ اور یوتام اور آخز اور حزقیاہ کے دنوں میں دیکھی۔ سنو اے آسمانو اور کان لگا اے زمین کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ لڑکوں کو میں نے پالا اور پوسا پر انھوں نے مجھ سے سرکشی کی۔ بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدہا اپنے مالک کی چراگاہ کو۔ مگر بنی اسرائیل نہیں جانتے۔ میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ۔ خطا کار گروہ۔ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے، بدکاروں کی نسل، خراب اولاد کہ انھوں نے خداوند کو ترک کیا اسرائیل کے قدوس کو ہلاک جانا اور اس سے بالکل پھر گئے تھے[۵۲]

اور پھر ان کی بدکاریوں کی وجہ سے جو سزا ان کو ملنے والی تھی اس کا ذکر اسی مکاشفہ میں اس طرح ہے۔

تمہارا ملک اجاڑ ہے، تمہاری بستیاں جل گئیں پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں وہ ویران ہے گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اجاڑا ہے اور صیہون کی بیٹی چھوڑی گئی ہے۔[۵۳]

---

۵ یہ یحییٰ علیہ السلام کے والد نہیں ہیں دوسرے نبی ہیں۔ ۵۲ باب ۱۔ آیات ۴-۱

۵۳ صیہون، شام کے ملک میں مشہور پہاڑ ہے باب آیات ۸-۷۔

اور یرمیاہؑ کی کتاب میں یہ پیشینگوئی ان الفاظ کے ساتھ شروع کی گئی ہے۔

کیونکہ خداوند فرماتا ہے کہ دیکھ میں اتر کے بادشاہوں کے سارے خاندانوں کو بلاؤں گا اور وہ آئیں گے اور ہر ایک اپنا اپنا تخت یروشلم کے پھاٹکوں میں داخل ہونے کی راہ پر اور اس کی سب دیواروں کے گرداگرد اور یہوداہ کے تمام شہروں کے مقابل قائم کرے گا۔ اور میں ان (یہود) کی ساری شرارت کی بابت کہ انھوں نے مجھے چھوڑا ہے اور بیگانے خداؤں کے سامنے لوبان جلایا اور اپنے ہی ہاتھوں کے کاموں کو سجدہ کیا۔ اپنی عدالت ظاہر کر کے ان پر حکم دوں گا۔ ؎۱

دیکھو تم جھوٹی باتوں پر جو سود مند نہیں ہو سکتیں اعتماد کرتے ہو۔ کیا تم چوری کروگے، خون کروگے زناکاری کروگے، جھوٹی قسمیں کھاؤگے اور بعل (بت) کے آگے لوبان جلاؤگے اور غیر معبودوں کی جنھیں تم نہیں جانتے پیروی کروگے؟ اور میرے حضور اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے آکے کھڑے ہوگے اور کہوگے کہ ہم نے خلاصی پائی تاکہ نفرت کے کام کرو ؎۲

اے یروشلم (بیت المقدس) اپنے بال منڈا اور پھینک دے اور اونچی جگہوں پر جا کے نوحہ کر کیونکہ خداوند نے اس نسل کو جس پر اس کا قہر پڑا تھا مردود کیا اور ترک کر دیا ہے کہ بنی یہوداہ نے میری نظر میں برائی کی، خداوند کہتا ہے اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے انھوں نے اپنی مکروہات رکھیں کہ اسے ناپاک کریں ؎۳

اس لئے رب الافواج یوں کہتا ہے لہذا تم نے میری باتیں نہ سنیں، دیکھ میں اتر کے سارے گھرانوں کو اور شاہِ بابل بنوکد نذر کو بلا بھیجوں گا۔ ؎۴

اور حزقیلؑ کی کتاب میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے یہی یروشلم ہے میں نے اسے قوموں اور ملکوں کے درمیان جو اس کے آس پاس ہیں رکھا ہے لیکن اس نے میری عدالتوں کو شرارت کر کے قوموں کی بہ نسبت زیادہ ٹال دیا اور میری شریعتوں کو آس پاس کی مملکتوں کی بہ نسبت زیادہ عدول کیا کہ انھوں نے

؎۱ باب۱ آیات ۱۵-۱۶۔ ؎۲ باب۷ آیات ۸-۱۰۔ ؎۳ باب۷ آیات ۲۹-۳۰۔ ؎۴ باب۲۵ آیات ۸-۹

میری عدالتوں کو حقیر جانا اور میری شریعتوں پر عمل نہیں کیا سو خداوند یہوواہ یہ کہتا ہے از بسکہ تم نے ان قوموں کی نسبت سے جو تمہارے گرد و پیش ہیں زیادہ بغاوت کی اور میری شریعتوں پر نہ چلے۔

. . . . سو خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں ہاں میں ہی تیرا مخالف ہوں اور تیرے درمیان سب قوموں کی آنکھوں کے سامنے تجھے سزا دونگا۔ ؎۱

اور زکریاہ نبی کی کتاب میں یہود کے دوسرے فساد اور بیت المقدس کی دوبارہ تباہی کے متعلق یہ پیشینگوئی درج ہے۔

دیکھو خداوند کا دن آتا ہے اور تیری لوٹ کا مال تیرے درمیان بانٹا جائے گا اور میں ساری قوموں کو فراہم کروں گا کہ یروشلم پر چڑھیں اور لڑیں اور شہر لے لیا جائیگا اور گھر کے گھر لوٹے جائیں گے اور عورتیں بے حرمت کی جائیں گی اور آدھا شہر اسیر ہو کے جائیگا پھر وہ جو باقی رہ جائیں گے، شہر میں کاٹے نہ جائیں گے تب خداوند خروج کرے گا اور ان قوموں کے ساتھ جنگ کرے گا جس طرح سابق میں جنگ کے دن لڑا تھا۔ ؎۲

یہ ہے خلاصہ ان مکاشفات یا پیشینگوئیوں کا جو انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں بڑی تفصیلات کے ساتھ مذکور ہیں اور جن کا اجمالی تذکرہ قرآنِ عزیز (سورۂ بنی اسرائیل) میں بھی بصورت تصدیق موجود ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان مکاشفات اور پیشینگوئیوں کا ظہور کس کس زمانہ میں ہوا اور کس طرح ہوا تو مفسرین میں سے ابنِ کثیر کے طرزِ بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہود کی ان دو شر انگیزیوں میں سے ایک کو بعثت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قبل زمانہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور دوسری کو زمانۂ بعثت صلی اللہ علیہ وسلم پر محمول فرماتے ہیں اور پھر پہلے واقعہ کے متعلق اپنی جانب سے فیصلہ دیتے ہوئے مفسرین کے تین قول نقل کرتے ہیں۔ (۱) قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہود کی پہلی شرارت کی سزا میں جالوت کا حملہ ہوا جس نے یہود کو بہت مصیبت میں ڈال دیا تھا مگر داؤد (علیہ السلام) کی بدولت اس کے

؎۱ باب ۵ آیات ۹-۵۔ ؎۲ باب ۱۴۔ آیات ۳-۱۔

فتنہ سے ان کو نجات ملی۔ یہ واقعہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گذرچکا۔ (۲) سعید بن جبیرؓ کی رائے ہے کہ پہلا وعدۂ الٰہی جو پاداشِ عمل میں یہود پر نافذ ہوا موصل (نینوٰی) کے مشہور قاہر بادشاہ سنجاریب کے حملہ کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے فلسطین کے اکثر شہروں پر قبضہ کرلیا تھا اور بیت المقدس کا محاصرہ کئے ہوا تھا مگر جب یہود اور شاہِ یہود "حزقیاہ" نے اپنے زمانہ کے نبی یسعیاہ علیہ السلام کے ہاتھ پر توبہ انابت کی اور وہ سچائی کے ساتھ اپنی بداعمالیوں اور بدکاریوں سے باز آ گئے تب خدا تعالیٰ نے ان پر سے اس بلا کو ٹال دیا اور وہ محاصرہ ترک کر کے واپس ہو گیا۔ (۳) سعید بن جبیر ہی سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے مراد بخت نصر (بنو کد نذر) شاہ بابل کا وہ مشہور حملہ ہے جس نے نہ صرف فلسطین اور شام کے تمام علاقے کو تاراج کر دیا تھا اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی بلکہ یہود کی قومیت و نسل کو بھی برباد کر ڈالا اور ہزاروں بچوں، بوڑھوں عورتوں اور مردوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تھا مگر یرمیاہ علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق ستر برس کے بعد یہود کو خورس شاہِ فارس نے بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور ان کو دوبارہ آزادی، شادمانی اور خوش عیشی نصیب ہوئی اور خورس کے حکم سے بیت المقدس بھی دوبارہ تعمیر ہوا اور اس نے حضرت دانیال علیہ السلام کو ان کا سردار بنا کر یروشلم واپس کر دیا۔ [۱]

اور قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے پہلی مرتبہ کے معاملہ کو سنجاریب یا بخت نصر سے متعلق کیا ہے اور دوسرے واقعہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ فارس کے ملوک الطوائف میں سے ہردوس بادشاہ کے زمانہ میں پیش آیا جبکہ اس نے بیت المقدس پر سخت حملہ کیا اور یہود اس کی مقاومت سے عاجز رہے مگر جب انھوں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر کے سامنے سچی توبہ کی اور نیک کردارانہ زندگی اختیار کرنے کا پختہ عہد و پیمان کیا تو ان سے یہ مصیبت ٹال دی گئی۔ اور یہود کی شرانگیزیوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان پر یہ تباہیاں اس وقت لائی گئیں جبکہ وہ اپنی

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۳ و تاریخ ابن کثیر ج ۲۔

شرارت میں اس درجہ بڑھ گئے تھے کہ انبیار علیہم السلام کے قتل سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ میں یسعیاہ یا یرمیاہ کو قتل کیا تھا اور دوسری مرتبہ زکریا و یحییٰ کو اور حضرت علیسیٰ کے قتل پر بھی آمادہ تھے۔ اور" ان عدتم عدنا" میں اس تیسرے واقعہ کا تذکرہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آیا یعنی یہود نے اپنی الہامی کتابوں میں آپ کی نبوت و رسالت کے حالات و علامات جان لینے کے باوجود آپ کا انکار کیا اور بدعہدیاں کرکے آپے اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچائیں نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ جب ٹھکرائے گئے تو پھر کبھی نہ ابھرے اور نہ قیامت تک ہی صاحبِ حکومت ہوسکیں گے

دوسری رائے یہ ہے کہ یہود کی پہلی شرارت اور اس کی پاداش کا معاملہ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری مرتبہ کا معاملہ طیطوس (ٹیٹس) رومی کے حملہ سے متعلق ہی اور یہی رائے صحیح اور قرآنِ عزیز کی آیات اور تاریخی نقول کے مطابق ہے۔ اور یہ اس لئے کہ قرآنِ عزیز نے اس معاملہ کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے حسب ذیل باتیں خصوصیت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱) "الکتاب" میں یہ خبر دیدی گئی تھی کہ یہود دو مرتبہ سخت شر انگیزی اور فساد کریں گے "وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا"

(۲) جب انھوں نے پہلی مرتبہ شر و فساد کیا تو ہم نے ان پر ایسی قاہرانہ طاقت مسلط کردی کہ اس نے ان کی بستیوں میں گھس کر ان کو اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ "فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا"

(۳) اس تباہی کے بعد (ان کی توبہ و انابت پر) ہم نے ان کو سابق کی طرح پھر حکومت و طاقت بھی بخشی اور مال و متاع کی بہتات سے بھی مستفیض کیا۔ "ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا"

(۴) اور ان کو یہ بھی بتا دیا کہ سرکشی اور فساد سے پرہیز اور امن، آشتی اور خدائے تعالیٰ کی فرمانبرداری کے قبول کا باز اثر ہم کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اس کی خلاف ورزی میں تمہارا اپنا ہی

سلہ ان ہر دو انبیاء میں سے کوئی بھی قتل نہیں کئے گئے " سلہ بیضاوی سورۂ اسریٰ

نقصان ہے اور اس کی اطاعت و انقیاد سے تم ہی کو فائدہ پہنچتا ہے "وَإِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا"

(۵) مگر انھوں نے دوسری مرتبہ پھر بدعہدی کی اور خدا کی نافرمانی اور فساد فی الارض میں دوبارہ بے باک ہوگئے تو ہم نے بھی پہلے کی طرح ان پر ایک ظالم طاقت کو مسلط کر دیا جس نے سابق ظالم حکمراں کی طرح دوبارہ بیت المقدس اور اس کے ہیکل (مسجد) کو بھی برباد کیا اور ان کو بھی ذلیل و رسوا کر کے ان کی سرکشی کا سر کچل دیا "فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا"

(۶) اور اگرچہ یہود کی یہ تباہی بظاہرِ حال ابدی معلوم ہو لیکن خدائے تعالیٰ کی رحمت تیسری مرتبہ اور موقعہ دے گی کہ وہ عزت و سربلندی حاصل کریں اور ان کی مایوسی مبدل بہ کامرانی ہو جائے لیکن اگر انھوں نے اس کو بھی ٹھکرایا تو بیشک پھر اس کا قانون "پاداشِ عمل" بھی ان کو ضرور سزا دیگا۔ اور وہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے اور پھر یقیناً رہتی دنیا تک ذلیل و خوار رہیں گے اور دارِ آخرت میں تو جہنم ایسے ہی متکبروں کے لئے تیار کی گئی ہے "عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا"

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کی شرانگیزیوں پر بصورت سزا و عذاب جن جابر و قاہر بادشاہوں کو مسلط کیا گیا انھوں نے دونوں مرتبہ بیت المقدس (یروشلم) کو ضرور تباہ و برباد کیا۔ "وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا" اس لئے جن اقوال میں پہلے واقعہ کا مصداق آشوری حکمراں "سنجاریب" یا "جالوت" کو بتایا گیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی بیت المقدس میں داخل نہیں ہو سکا چہ جائیکہ وہ اس کو تباہ و برباد کرتا چنانچہ جالوت کے متعلق تو قرآن کی تصریحات بھی اس کی تائید کرتی ہیں اور سیر و تاریخ کی نقول بھی جیسا کہ ہم حضرت سموئیل (علیہ السلام) اور حضرت داؤد (علیہ السلام) کے واقعات میں بیان کر چکے ہیں اسی طرح سنجاریب کے متعلق "یسعیاہ کی کتاب" میں یہ موجود ہے۔

پس شاہ حزقیاہ کے ملازم یسعیاہ پاس آئے تب یسعیاہ نے انھیں فرمایا تم اپنے آقا سے کہو خداوند یوں فرماتا ہے کہ تو ان باتوں سے جنھیں شاہِ آشور (سنجاریب) کے جوانوں نے کہہ کے میری تکفیر کی ہراساں مت ہو۔ دیکھ میں اس میں روح ڈالوں گا اور وہ ایک افواہ سن کے اپنی مملکت کو پھر جائیگا اور میں اُسے اُس ہی کی سرزمین میں تلوار سے مروا ڈالوں گا۔ . . . . . . سو خداوند شاہ اشور (سنجاریب) کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ وہ اس شہر (یروشلم) میں نہ آنے پائے گا نہ اس کے اندر تیر چلانے پائے گا نہ سپر پکڑ کے اس کے سامنے ظاہر ہوگا اور نہ اس کے مقابل دمدمہ باندھنے پائے گا۔ بلکہ جس راہ سے وہ آیا اسی راہ سے پھر جائے گا اور اس شہر میں نہ آنے پائے گا۔ . . . . . تب سنحریب (سنجاریب) شاہِ آشور نے کوچ کیا اور چلا گیا اور پھر گیا اور نینوی میں آرہا۔ [۵۱]

اور قاضی بیضاوی کا یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کہ یہود سے متعلق دوسرے حادثہ کا مصداق فارس کے ملوک الطوائف میں سے شاہ ہردوس ہے اس لئے کہ تاریخ و سیر میں ملوک الطوائف کے عہد میں کسی ایسے بادشاہ کا ذکر نہیں پایا جاتا جس نے بیت المقدس پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور اس کو تباہ و برباد کر ڈالا ہو۔

ان اقوال کے برعکس توراۃ (صحائف انبیاء) اور سیر و تاریخ کی نقول سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین اور سرزمین یہوداہ کی تباہی اور ہیکل کی بربادی صرف دو بادشاہوں کے ہاتھوں ہوئی ہے اور نہ صرف شہروں کی بربادی بلکہ یہودی قومیت کی وہ تباہی و بربادی جو دنیا کے انقلابات کی تاریخ میں اہم جگہ رکھتی ہے۔ ایک بابل کے قاہر بادشاہ بنوکدنزر (بخت نصر) کے ہاتھ سے۔ اور یہ تقریباً ۵۸۶ ق م کا واقعہ ہے اور دوسری طیطوس رومی کے ہاتھوں سے اور یہ واقعہ رفع مسیح علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد پیش آیا اور ان ہی دو حادثوں میں یہود، یہودی قومیت، اور یہودی مذہب پر وہ سب کچھ ہو گذرا جس کی اطلاع پہلے سے توراۃ (صحف انبیاء) میں دیدی گئی تھی اور جس کی تصدیق کے لئے قرآن عزیز بھی شہادت دے رہا ہے۔

---

[۵۱] باب ۳۷- آیات ۷-۵ و آیات ۳۱-۳۳ و آیات ۳۸-۳۷-

اس لئے بلاخوف تردید یہ کہنا صحیح ہے کہ یہود کی بدکرداریوں کے نتیجہ میں جابر و قاہر بادشاہوں کے ہاتھوں ان کی تباہی و بربادی کے جو دو سانحے پیش آئے اور جن کا ذکر سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) میں ہے وہ بلاشبہ بخت نصر اور طیطوس (ٹیٹس) ہی سے تعلق رکھتے ہیں تو اب از بس ضروری ہے کہ ان ہر دو واقعات کی تفصیلات بیان کر کے یہ دکھایا جائے کہ اس زمانہ میں یہود کی شرانگیزیاں اور مفسدانہ کارگذاریاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ان دونوں تباہ کن حوادث میں ان پر جو کچھ گذرا وہ ان کی بداعمالیوں ہی کا ثمرہ اور نتیجہ تھا اور پاداشِ عمل ہی نے ان دو طاقتوں کی شکل میں ظہور کیا تھا

شرارتِ یہود کا پہلا دور

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانونِ قدرت کا ہمیشہ سے یہ اٹل فیصلہ رہا ہے کہ جب بداخلاقی، فتنہ و فساد، خوں ریزی، جبر و ظلم اور حق کے مقابلہ میں بغض و حسد کسی جماعت کا قومی مزاج بن جاتے ہیں اور چند افراد میں نہیں بلکہ پوری قوم کے اندر یہ امور نشو و نما پا جاتے ہیں تو پھر قبولِ حق کی صحیح استعداد ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور وہ اس درجہ بے خوف اور بے باک ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس خدا کے سچے پیغمبر دعوتِ حق اور پیغامِ الٰہی سنانے آتے ہیں تو وہ صرف اس دعوت سے منہ ہی نہیں موڑ لیتے بلکہ ان انبیاء و رسل کو قتل تک کر دینے سے گریز نہیں کرتے اور شرک و طغیان کو راہِ عمل بنا کر اولیاء الرحمان کی جگہ اولیاء الشیطان بن جاتے ہیں۔ جب ان کی حالت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اب خدائے برتر کا قانون "پاداشِ عمل" بروئے کار آتا ہے اور آخرت کے عذابِ الیم کے علاوہ دنیا ہی میں ان کو ایسی ہلاکت و بربادی سے دوچار کر دیتا ہے کہ اس قوم کا تمام کبر و غرور اور شر و فساد کی شعلہ سامانیاں ذلت و خواری کے ساتھ تہ خاک کر دی جاتی ہیں اور ان کی قومی زندگی کو قعرِ مذلت میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ ان کی آنکھیں مشاہدہ کر لیں اور عبرت آموز قلب بھی یہ سمجھ لیں کہ حقیقی عزت و سربلندی کے مالک تم نہیں ہو اور ذلت و عزت تمہارے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس قادرِ مطلق ہستی کے قبضہ میں ہے جو کائناتِ ہست و بود کا خالق و مالک ہے اور جس کا یہ اعلان ہے کہ بدکاروں کے لئے انجام کار ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور حقیقی عزت نکوکاروں ہی کے لئے ہے اور وہی اس حقیقت کے پیشِ نظر جس کو چاہتا ہے

عزت بخشتا اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے" وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

پس جب ہم اس قانونِ فطرت کو پیش نظر رکھ کر یہودِ بنی اسرائیل کے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں جو زیرِ بحث واقعات سے متعلق ہے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح نمایاں نظر آتی ہے کہ ان کی قومی زندگی کا قوام مسطورہ بالا بداخلاقیوں سے ہی بنا تھا اور وہ اپنی اس زندگی پر فخر ومباہات کرتے تھے چنانچہ حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کے بعد ان کی مذہبی اور اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ جھوٹ، فریب، ظلم وسرکشی اور فساد و فتنہ انگیزی ان کا شعار بن گئے تھے، حتی کہ شرک وبت پرستی تک ان میں رچ گئی تھی لیکن اس کے باوجود عرصہ دراز تک خدائے تعالیٰ کے "قانونِ مہلت" نے ان کو مہلت دی کہ وہ اپنی حالت کی اصلاح کریں اور اس کی صفتِ "رحمت" نے ان سے منہ نہیں موڑا بلکہ ان کی رشد وہدایت اور اصلاحِ اخلاق و اعمال کے لئے نبیوں اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم رکھا جو برابر ان کو نکوکاری کی ترغیب دیتے اور بدکاری سے اجتناب کی تلقین کرتے رہتے تھے تاکہ ان کو دین ودنیا کی سربلندی حاصل ہو اور وہ انبیاء ورسل علیہم السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے دوسروں کے لئے اسوۂ حسنہ بن سکیں مگر یہود پر ان کے ارشاد و تبلیغ کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا اور ان کی سرکشی اور نافرمانی ترقی پذیر ہوتی گئی اور ان کے علماء واحبار نے سیم وزر کی خاطر خدائے برتر کے احکام میں تلبیس شروع کر دی اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے میں بے خوف ہو گئے اور عوام نے کتابِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال کر گمراہی کو اپنا امام بنا لیا، اور بے باکی کے ساتھ ہر قسم کی بداخلاقی کو اپنا لیا اور آخر کار ان کے خواص وعوام اس انتہائی شقاوت وبدبختی پر اتر آئے کہ خدا کے معصوم پیغمبروں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور ان کی تکذیب کر کے ان کے خونِ ناحق پر فخر ومباہات کرنے لگے۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں جگہ جگہ ان کی بدکرداریوں اور نافرمانیوں کا اس طرح ذکر موجود ہے۔

بنی اسرائیل نہیں جانتے، میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے۔ آہ خطاکار گروہ، ایک قوم جو گناہوں سے

لدی ہوئی ہے، بدکاروں کی نسل، خراب اولاد کہ انھوں نے خدا کو ترک کیا، اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اس سے بالکل پھر گئے۔ [1]

اے میری امت تیرے پیشوا تجھ کو گمراہ کرتے ہیں اور تیرے راہ گیروں کی راہ مارتے ہیں، خداوند کھڑا ہے کہ مقدمہ پیش کرے اور وہ لوگوں کی عدالت کرنے پر مستعد ہے۔ [2]

کیونکہ وہ جو ان کے پیشوا ہیں ان سے خطاکاری کراتے ہیں اور وہ جو ان کی پیروی کرتے ہیں، نگلے جائیں گے سو خداوند ان کے جوانوں سے خوشنود نہیں اور وہ ان کے یتیموں اور ان کی بیواؤں پر رحم نہ کرے گا کہ ان میں ہر ایک بے دین ہے اور بدکردار ہے۔ [3]

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں اس طرح مذکور ہے۔

اور خداوند نے اپنے سارے خدمت گذار نبیوں کو تمہارے پاس بھیجا، صبح سویرے اٹھ کے بھیجا، پر تم نے نہ سنا، نہ سننے کو اپنا کان لگایا، انھوں نے کہا کہ ہر ایک اپنی بری راہ سے اور اپنے کاموں کی برائی سے باز آؤ اور اس سرزمین میں جسے خدا نے تم کو اور تمہارے باپ دادوں کو ہمیشہ کے لئے دیا بستے رہو، اور تم بیگانے باطل معبودوں کا پیچھا نہ کرو کہ ان کی بندگی اور ان کو سجدہ کرنے لگو۔ اور اپنے ہاتھوں کے کاموں سے مجھے غصہ نہ دلاؤ اور میں تم پر کچھ ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ پر تم نے میری نہ سنی، خداوند کہتا ہے تاکہ اپنے ہاتھوں کے کاموں سے اپنے زیان کے لئے مجھے غصہ دلاؤ۔ [4]

اور ایسا ہوا کہ جب یرمیاہ ساری باتیں کہہ چکا جو خداوند نے اسے حکم دیا تھا کہ ساری قوم سے کہے تب کاہنوں اور نبیوں (جھوٹے مدعیان نبوت) اور ساری قوم نے اس کو پکڑا اور کہا کہ تو یقیناً قتل کیا جائے گا۔ تو نے خداوند کا نام لے کر کس لئے نبوت کی ہے اور یہ کہا کہ یہ گھر (یروشلم) سیلا کی مانند ہو جائیگا اور یہ شہر ویران کیا جائے گا۔ [5]

کیونکہ اے یہوداہ جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں تم کاہے کو مجھ سے حجت کروگے؟ تم سب مجھ سے پھر گئے ہو۔ خداوند کہتا ہے۔ میں نے تمہارے لڑکوں کو عبث مارا پیٹا ہے وہ تربیت پذیر

[1] باب ۱ آیات ۴ تا ۳۰۔ [2] باب ۳ آیات ۱۲ تا ۱۳ [3] باب ۹ آیات ۱۶ تا ۱۷ [4] باب ۲۵ آیات ۴ تا ۷۔ [5] باب ۲۶ آیات

نہیں ہوتے، تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمہارے نبیوں کو کھا گئی ہے۔ (یعنی تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے سچے پیغمبروں کو قتل کیا ہے)۔

یہود کی سرکشی اور خدا سے بغاوت کے یہ افسوسناک حالات تھے۔ جن پر خدائی جانب سے بار بار ان کو تنبیہ کی جاتی اور مہلت سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جاتی رہی لیکن ان پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوتا رہا اور ان کی بے حیائی اور بے جا جسارت بڑھتی ہی رہی تب یکایک غیرتِ حق نے قہر اور بطشِ شدید کی شکل اختیار کر لی اور اس کا زبردست ہاتھ ان کی جانب پاداشِ عمل کے لئے بڑھا۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے آخری دور میں بابل (عراق) کی حکومت پر ایک زبردست جری اور ظالم و جابر بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوا، اس کا نام نبوکدنذر یا نبوکدزار تھا اور عرب اس کو بخت نصر کہتے تھے، اگرچہ اس زمانہ میں بابل کی حکومت بذاتِ خود ایک متمدن اور زبردست حکومت شمار ہوتی تھی مگر اس سے قریب نینویٰ کی مشہور طاقت کی تباہی کے بعد تو اس کو اور زیادہ قوت و شوکت حاصل ہو گئی اور وہ ایک عظیم الشان شہنشاہیت تسلیم کر لی گئی۔ حتیٰ کہ ایران کی مختلف قبائلی حکومتیں بھی اس کی باجگزار اور ماتحت حکومتیں سمجھی جانے لگیں۔

نبوکدنذر کی شمشیر کشورستان نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور اس کی نظریں شام و فلسطین کے علاقوں پر بھی پڑنے لگیں جو یہودیا کا علاقہ کہلاتا اور بنی اسرائیل کے مذہب اور قومیت کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ وہ اس کی جانب بڑھا۔ جب یہودیا کی سرزمین کے باشندوں نے یہ سنا تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے اور بادشاہ سے لیکر رعایا تک سب کو موت کا نقشہ نظر آنے لگا۔ اور اب وہ سمجھے کہ یسعیاہ اور یرمیاہ (علیہما السلام) نے ہماری بدکاریوں پر متنبہ کرتے ہوئے جس سزا اور عذابِ الٰہی کا ذکر کیا تھا اور جس سے ناراض ہو کر ہم نے یرمیاہ (علیہ السلام) کو قید میں ڈال رکھا ہے وہ وقت آپہنچا مگر شومئی قسمت دیکھئے کہ انھوں نے اس حالت کو دیکھکر اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں پر اظہارِ ندامت اور درگاہِ الٰہی میں توبہ و انابت کی جانب پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مادی طاقت کے اسباب و وسائل پر بھروسہ کیا اور شاہِ بابل کی مقاومت کے لئے آمادہ ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فلسطین

اور شام کے شہروں اور آبادیوں کو ویران اور مسمار کرتا ہوا بیت المقدس (یروشلم) کے دروازہ پر آکھڑا ہوا۔ اب شاہ یہوداہ یکونیا بن یہویقیم کو بجز اطاعت کوئی چارہ نہ رہا۔ بنوکدنزر یروشلم میں لشکر سمیت داخل ہوا اور بادشاہ، سردار اور تمام امراء کو قید کر لیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، لشکریوں نے تمام مال و متاع اور ہیکل کی تمام اشیاء کو لوٹ لیا اور توراۃ کے تمام نسخوں کو آگ میں جلا کر خاک کر دیا اور ہزار ہا انسانوں کو قتل اور باختلافِ روایت ایک لاکھ سے زاید یہودیوں کو (جن میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور مرد سب ہی تھے) بھیڑ بکری کی طرح ہنکاتا ہوا پیادہ پا بابل لے گیا اور ان سب کو غلام و باندی بنا لیا علاقہ فلسطین و شام کے لاکھوں انسانوں کو قتل و غارت کرنے کے علاوہ صرف دمشق میں اُس نے بے تعداد یہودیوں کو تہ تیغ کیا حتیٰ کہ خود یہودیوں کی زبان پر یہ تھا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے کی سزا ہے جو ہم کو شاہِ بابل کی شمشیرِ بُراں کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔

غرض شاہِ بابل کے اس حملہ نے یہوداہ کا ملک ہی ویران نہیں کیا بلکہ ان کے مذہب اور قوم کو بھی پارہ پارہ کر دیا، چنانچہ یہود کے ان قیدیوں میں حضرت دانیال (اصغر) حضرت عُزَیر اور بعض دوسرے وہ بزرگ بھی تھے جن کو خدائے تعالیٰ کی جانب سے قیامِ بابل کے زمانہ میں یہود کی اصلاح کے لئے نبوت سے سرفراز کیا گیا تاکہ وہ اس بت پرست شاہنشاہی کی غلامی میں طاقت و آزادی سے محرومی کے ساتھ ساتھ دین و مذہب سے بھی محروم نہ ہو جائیں۔[۱]

ابنِ کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب بنوکدنزر (بخت نصر) بیت المقدس میں داخل ہو کر سب کچھ برباد کر چکا تو اس کو اطلاع دی گئی کہ یہود نے اپنے ایک نبی یرمیاہ (علیہ السلام) کو اس بنیاد پر قید کر رکھا ہے کہ انھوں نے تیری آمد اور حملہ سے قبل اپنی قوم کو ان تمام باتوں کی خبر دیدی تھی جو آج پیش آئیں یہ سن کر شاہ بابل نے ان کو زندان سے نکالا اور ان سے بات چیت کر کے بیحد متاثر ہوا اور اصرار کیا کہ اگر وہ بابل چلنے پر آمادہ ہوں تو ان کو حکومت میں منصبِ جلیل دیا جائے گا اور ان کی کیاست و فراست سے فائدہ اٹھایا جائے گا مگر حضرت یرمیاہ نے یہ کہکر صاف انکار کر دیا کہ

---

[۱] باب ۲۴ آیت ۱ - [۲] تاریخ ابن کثیر ج ۲ -

تیرے ہاتھوں میری بدقسمت قوم کا جو حال ہوا ہے اس کے بعد میرے لئے بابل جانا میری زندگی کا سب سے بدترین سانحہ ہوگا۔ میں تو اب ان ہی کھنڈرات پر زندگی گذاروں گا پس اسے بادشاہ تو مجھ کو اس بارہ میں اصرار نہ کر، شاہ بابل یہ سن کر خاموش رہا اور بابل کو روانہ ہوگیا[1]۔

غلامی سے نجات | بابل کی غلامی کا یہ زمانہ یہود کے لئے کس درجہ یاس انگیز، حسرت زا اور عبرتناک رہا ہوگا اس کا تحقیقی اندازہ ہمارے اور آپ کے لئے بہت مشکل ہے۔ بظاہر کوئی سہارا نہیں تھا کہ جس کے بل بوتہ پر وہ اپنی اس حالت میں انقلاب پیدا کرسکتے۔ البتہ جبکہ وہ یسعیاہ اور یرمیاہ (علیہما السلام) کے مکاشفوں اور پیشینگوئیوں کی ابتدائی صداقت[2] کا تجربہ کرچکے بلکہ اپنی زندگی پر ان کو گذرتا ہوا دیکھ چکے تو ان کے لئے امید کی ایک یہ جھلک ضرور باقی تھی کہ ان مکاشفوں اور پیشینگوئیوں میں ساتھ ہی یہ بھی خبر دی گئی تھی کہ یہود بابل میں ستر برس غلام رہیں گے اور

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲۔ [2] شاہ بابل نے یہود اور یروشلم کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی خبر یہود کو پہلے سے دیدی گئی تھی اور بتادیا گیا تھا کہ تمہاری بدکاریوں کا اگر یہی حال رہا تو تم ایک بت پرست بادشاہ بنوکدنزر کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کئے جاؤ گے۔ یہ پیشینگوئی بھی یسعیاہ اور یرمیاہ کے صحیفوں میں آج تک موجود ہے۔

تب یسعیاہ نبی نے حزقیاہ بادشاہ کے پاس آکر اس سے کہا کہ ان شخصوں نے کیا کہا اور وہ کہاں سے تیرے پاس آئے؟ حزقیاہ نے جواب دیا کہ ایک دور ملک بابل ہی سے میرے پاس آئے تب اس نے کہا کہ انھوں نے تیرے گھر میں کیا کیا دیکھا؟ حزقیاہ نے جواب دیا سب کچھ کہ جو میرے گھر میں ہے انھوں نے دیکھا تب یسعیاہ نے حزقیاہ کو کہا کہ رب الافواج کا کلام سن۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ وہ سب کچھ جو کہ تیرے گھر (یروشلم) میں ہے اور جو کچھ تیرے باپ دادوں نے آج کے دن تک ذخیرہ کر رکھا ہے اٹھا کے بابل کو لیجائیں گے۔ خداوند فرماتا ہے کوئی چیز باقی نہ چھوٹے گی اور وہ تیرے بیٹوں میں سے جو تیری نسل سے ہوں گے اور تجھ سے پیدا ہوں گے لیجائیں گے اور وہ شاہِ بابل کے قصر میں خواجہ سرا ہوں گے۔ (باب ۳۹ آیات ۳-۷)

یہ پیشینگوئی حضرت یسعیاہ نے اس وقت کی تھی جبکہ بنوکدنزر سے بہت پہلے بابل کے بادشاہ مرودک نے یہوداہ کے بادشاہ حزقیاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے۔ اسی طرح حضرت یرمیاہ کی کتاب میں ہے۔

اس لئے رب الافواج یوں کہتا ہے تم نے میری باتیں نہیں سنیں تو دیکھو میں شمال کے سارے گھرانوں کو اور بنوکدنزر کو جو میرا غلام ہے بلا بھیجوں گا۔ خداوند کہتا ہے اور میں انھیں اس سرزمین اور اس کے باشندوں پر اور ان ساری قوموں پر جو چہار جانب

[illegible] باب ۲۵ آیات ۹-۸

ستر برس گذرنے پر فارس سے ایک بادشاہ کا ظہور ہوگا جو خدا کا مسیح اور اس کا چرواہا کہلائے گا اور وہ یہود اور یروشلم کا نجات دہندہ ہوگا۔

یہ پیشینگوئی حضرت یسعیاہ نے واقعہ سے تقریباً ایک سو ساٹھ برس اور حضرت یرمیاہ نے ساٹھ برس قبل یہودیوں کی تباہی و بربادی کی پیشینگوئی کے ساتھ ساتھ سنادی تھی حتیٰ کہ قیام بابل کے دوران میں پیشینگوئی کے ظہور سے تھوڑے زمانہ قبل دانیال (علیہ السلام) نے اپنے مکاشفہ میں اس شاہِ فارس کو ایک ایسے مینڈھے کی شکل میں دیکھا تھا جس کے دو سینگ (قرنین) ہیں اور جبرئیل علیہ السلام نے اس کی یہ تعبیر دی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بادشاہ مادہ (میڈیا) اور فارس دو بادشاہتوں کو ملا کر بادشاہی کرے گا اور اسی مکاشفہ میں انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اور بکرا ہے جس کی پیشانی پر صرف ایک سینگ ہے اور اس نے دو سینگ والے مینڈھے کو مغلوب کرلیا ہے۔ اور پھر جبرئیل (علیہ السلام) نے اس کی تعبیر یہ دی کہ یہ ایک ایسا زبردست بادشاہ ہوگا جو ایران کی اس شاہنشاہی کا خاتمہ کرکے اس پر قابض ہوجائیگا (یعنی سکندر یونانی)۔

چنانچہ یرمیاہ کی کتاب میں بصراحت یہ مدت مذکور ہے۔

اور یہ ساری سرزمین ویرانہ اور حیرانی کا باعث ہوجائے گی اور یہ قومیں ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گی۔ ؎۱

اور ایسا ہوگا خداوند کہتا ہے "کہ جب ستر برس پورے ہوں گے میں بابل کے بادشاہ کو اور اس کی قوم کو اور کسدیوں (بابلیوں) کی زمین کو ان کی بدکاری کے سبب سزا دوں گا اور میں اُسے ایسا اجاڑوں گا کہ ہمیشہ تک ویرانہ رہے۔ ؎۲

خداوند یوں کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گذر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔" ؎۳

اور ان ہی پیشینگوئیوں میں یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ یہود کو بابل کی غلامی سے نجات دینے والی

؎۱ باب ۲۵ آیات ۱۱۔ ؎۲ باب ۲۵ آیات ۱۲-۱۳۔ ؎۳ باب ۲۹ آیات ۱۰-۱۱۔

ہستی کا ایران سے ظہور ہوگا اور اس کا نام خورس ہوگا، اس کی حکومت اور شاہنشاہیت کا فروغ خداوند اسرائیل کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوگا اور جو بات ان کے گذشتہ بادشاہوں کو نصیب نہیں ہوئی اس کو نصیب ہوگی کیونکہ وہ خدا کا چرواہا، مسیح (مبارک) اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ ہوگا۔ چنانچہ یسعیاہ کی کتاب میں اس کے ظہور کی خبر صاف الفاظ میں اس طرح دی گئی ہے۔

(میں، خداوند بنی اسرائیل کا خدا) یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سوکھ ڈالوں گا۔ جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔ اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ خداوند اپنے "مسیح" خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دوہرائے ہوئے دروازے اس کے لئے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کئے جائیں گے . . . .

. . . میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں، میرے سوا کوئی خدا نہیں، میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا تاکہ لوگ سورج کے نکلنے کی اطراف سے اور سورج کے غروب ہونے کی اطراف تک جانیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں . . . .

. . . . میں نے اس کو صداقت کے لئے برپا کیا ہے اور میں اس کی ساری راہیں آراستہ کروں گا وہ میرا شہر بنائے گا اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض لئے چھڑائیگا . . .

. . . اے اسرائیل کے خدا اے نجات دینے والے وہ سب کے سب پشیمان اور سراسیمہ بھی ہوں گے وہ جو بت تراش (اہل بابل) ہیں سب کے سب گھبرا جائیں گے، پھر اسرائیل خداوند میں ہو کے ابدی نجات کے ساتھ رہائی پائے گا۔[1]

گذرو آستانہ پر سے گذرو، لوگوں کے لئے راہ درست کرو اور شاہراہ اونچی کرو، پتھر سرکا دو

[1] یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۰-۲۶- و باب ۴۵ آیات ۱-۱۳

قوموں کے لئے جھنڈا کھڑا کرو، دیکھو خداوند دنیا کی سرحدوں تک منادی کرتا ہے کہ صیہون کی بیٹی کو کہو دیکھو تیرا نجات دینے والا آتا ہے دیکھ اس کا اجر اس کے ساتھ اور اس کا کام اس کے آگے ہے۔[1]

"بابل کی بابت وہ الہامی بات جسے اموص کے بیٹے یسعیاہ نے رویا میں دیکھا . . . .
. . . میں نے اپنے مخصوص کئے ہوؤں کو حکم کیا۔ میں نے اپنے بہادروں کو جو میری خداوندی سے مسرور ہیں بلایا ہے کہ وہ میرے قہر کو انجام دیں . . . . . رب الافواج جنگی لشکر کی موجودات لیتا ہے وہ دور ملک سے آسمان کی انتہا کی طرف سے آتے ہیں . . . . . دیکھو میں مادیوں (میڈیا والوں) کو ان پر چڑھاؤں گا جو کہ روپیہ کو خاطر میں نہیں لاتے اور سونے سے خوش نہیں ہوتے۔[2]

اور یرمیاہ کی کتاب میں مذکور ہے۔

دیکھ میں اُتر کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا۔ اور بابل پر لے آؤں گا . . . . کسدستان (بابل) لوٹا جائیگا۔ سب جو اسے لوٹیں گے آسودہ ہوں گے خداوند کہتا ہے۔[3]

اس لئے خداوند یوں کہتا ہے دیکھ میں تیری حجت ثابت کروں گا اور تیرا انتقام لوں گا اور اس (بابل) کے دریا سکھا دوں گا اور اس کے سوتے خشک کر دوں گا اور بابل کھنڈر ہو جائے گا اور گیدڑوں کا مقام اور حیرانی کا باعث ہوگا اور اس میں کوئی نہ بسے گا . . . . کیونکہ حملہ آور اُس پر چڑھے ہیں . . . . بابل سے رونے کی آواز اور بڑی ہلاکت کی صدا کسدیوں کی سرزمین سے آتی ہے کیونکہ خداوند بابل کو غارت کرتا ہے . . . . بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھا دی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیئے جائیں گے۔"[4]

توراۃ کے ان بیان کردہ واقعات کی تصدیق تاریخ کے روشن صفحات اس طرح کرتے ہیں کہ تقریباً ۳۵۰ قبل مسیح ایران میں قبائلی طرز حکومت رائج تھا اور ایران دو حصوں پر تقسیم تھا جہاں دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں ان میں سے شمال مغربی حصہ میڈیا (مادہ یا ماہات) کہلاتا تھا اور جنوبی حصہ پارس کے نام سے موسوم تھا مگر اس دور میں چونکہ بابل و نینوی کی حکومتیں زبردست

[1] باب ۶۲ آیات ۱۱-۱۰ ۔ [2] باب ۱۳ - آیات ۱۸-۱ ۔ [3] باب ۵۰ آیت ۱۰ [4] باب ۵۱ ۔

اور قاہر حکومتیں تھیں اس لئے یہ دونوں ریاستیں نینوای کی حکومت کے زیر اثر اور ماتحت سمجھی جاتی تھیں لیکن جب ۶۱۲ ق م میں نینوای تباہ ہو گیا اور آشوری حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو اگرچہ میڈیا کو آزادی نصیب ہو گئی اور وہاں قومی حکومت کے جذبات ابھرنے لگے اور ایک حکمراں شاہی خاندان بھی پیدا ہو گیا تاہم پارس اور میڈیا دونوں ریاستوں کو آزاد سلطنت قائم کر لینے کی جرأت نہ ہو سکی اور بابلی حکومت کو بیحد فروغ ہو گیا گویا نینوای کی تباہی نے بابل کی طاقت کو بہت بڑی شاہنشاہیت میں تبدیل کر دیا جس کے سامنے یہ ریاستیں بے اثر ہی رہیں یہ کیفیت ۵۶۰ ق م تک رہی لیکن ۵۵۹ق م میں اچانک میڈیا کے رئیس کمبوجیہ (کیقباد) کے جانشین کے ارش (خورس) نے غیر معمولی حالات کے ساتھ ظہور کیا اور چند ہی روز میں میڈیا اور فارس کی ریاستوں نے برضا و رغبت اس کو اپنا واحد شاہنشاہ تسلیم کر لیا اور وہ بغیر کسی خونریزی کے ایشیاء کوچک کے تمام علاقوں کا زبردست اور خود مختار شاہنشاہ بن گیا۔

اہلِ فارس اس کو کے ارش اور گورش کہتے ہیں لیکن یہ یونانی میں سائرس عبرانی میں خورس اور عربی میں کیخسرو کے ناموں سے مشہور ہے۔

کے ارش کے ظہور سے یونانی اور یہودی دو قومیں خصوصیت کے ساتھ متعارف ہیں اس لئے کہ ان دونوں قوموں پر اس کی حکومت کا موافق اور مخالف حیثیت سے نمایاں اثر پڑا اور یہود کے لئے تو اس کا عروج و ظہور، خوشحالی، آزادی اور امن و اطمینان کا بہت بڑا سبب بنا اسی لئے وہ اس کی شخصیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کے انبیاء کے صحیفوں میں اس کو "خدا کا چرواہا" "مسیح" اور "بنی اسرائیل کا نجات دہندہ" کہا گیا ہے، مگر اہلِ عرب قبل از اسلام اس کی شخصیت سے زیادہ متعارف نہیں تھے اور بعد از اسلام جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تب بھی ان کو اس کی شخصیت کے تعارف سے اس لئے واسطہ نہیں پڑا کہ یہ ایران کے دورِ اول کا ہیرو ہے اور مسلمانوں کی فتوحات کا تعلق تمام تر ایران کے تیسرے دور سے متعلق ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اس کے نام اور شخصیت کے تعین میں بھی اختلاف نظر آتا ہے چنانچہ بعض مؤرخینِ عرب نے اس کو بہمن بن اسفندیا

کہلاتے اور بعض نے ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے اس کا نام کیقباد بیان کیا ہے حالانکہ ایران و یونان کے وہ مؤرخین جو کے ارش کے معاصر ہیں کیقباد (کمبوچہ) اس کے باپ اور اس کے بیٹے کا نام بتاتے ہیں اور بعض عرب مؤرخین نے اس کو لہراسپ بن گشتاسپ بتایا ہے [1]

غرض جب گورش یا خورس میڈیا (ماہات) اور پارس دونوں ریاستوں کو ملا کر ایک زبردست اور خود مختار بادشاہ ہو گیا تو یہ وہ وقت ہے کہ بابل کے تختِ سلطنت پر نبوکدنزر (بخت نصر) کا ایک جانشین بیل شازار سریر آرائے سلطنت تھا۔

یہ بادشاہ بخت نصر کی طرح اگرچہ جری اور بہادر نہیں تھا مگر ظلم اور عیاشی میں اس سے بھی آگے تھا، حتیٰ کہ خود اس کی اپنی رعایا اس کے اعمالِ بد سے سخت پریشان اور اس کے ظلم سے عاجز اور ہر وقت انقلاب کی خواہاں رہتی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حضرت دانیال اپنی الہامی پیشینگوئیوں، کریمانہ اخلاق، عالی صفات اور غیر معمولی فہم و فراست کی وجہ سے پبلک میں اس درجہ مقبول تھے کہ حکومت کے نظامِ کار میں دخیل اور مشیر بن گئے تھے، انھوں نے بیل شازار کو ہر چند سمجھایا اور بداعمالیوں سے روکا اور ڈرایا مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا اور ایک دن اس نے یہ نوبت پہنچادی کہ اپنی محبوبہ کے اصرار پر یروشلم کے مقدس ظروف کو "جو بخت نصر لوٹ کر لایا تھا" مجلسِ نشاط میں منگوا کر ان میں شراب پی اور ان کی توہین کی مگر ابھی وہ شراب نوشی میں مشغول ہی تھا کہ اس نے شمع کافوری کی روشنی میں یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا کہ بغیر کسی شکل و صورت کے سامنے آئے ہوئے ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا اور اس نے محل کی دیوار پر چند جملے لکھ دیئے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ پر بہت ہیبت طاری ہو گئی اور اس نے فوراً نجومیوں، کاہنوں، جوتشیوں اور بڑے بڑے عقلاء و حکماء کو جمع کیا اور ان سے اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر کا مفہوم معلوم کرنا چاہا لیکن کوئی اس عقدہ کو حل نہ کر سکا اور وہ بھی بادشاہ کی طرح حیران رہ گئے تب ملکہ نے کہا کہ آپ اس برگزیدہ انسان "دانیال" کو بلائیں جس کی باتیں ہمیشہ سچی ہوتی ہیں اور جو اپنے اعمال و کردار میں بے نظیر انسان ہے وہی اس کو حل کر سکتا ہے۔

---

[1] یہ مسئلہ ذوالقرنین کی بحث میں زیادہ واضح کیا جائیگا۔

حضرت دانیال دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے واقعہ نقل کیا اور کہا کہ اگر تم اس کو حل کردو تو میں تم کو دولت و ثروت سے مالامال کردوں گا۔ دانیال علیہ السلام نے ہنس کر جواب دیا کہ مجھے بادشاہ کی دولت درکار نہیں ہے میں بغیر کسی عوض کے ہی بادشاہ کے اس عقدہ کو حل کردوں گا۔

اے بادشاہ گوشِ ہوش سے سن! خدا نے تجھ کو قوت اور دولت دونوں سے حصۂ وافر عطا فرمایا اور نبیوں کی اولاد تک تیرے حوالہ کردی مگر تو نے خدا کا شکر ادا نہ کیا اور جس نیک کرداری کی تجھ سے توقع ہو سکتی تھی وہ تو نے پوری نہ کی اور حد یہ ہے کہ تو نے مجلس نشاط میں یروشلم کے ظروف کی توہین کرکے گویا یروشلم کے خدا کو چیلنج کیا چنانچہ اس کی جانب سے تجھ کو وہ جواب ملا جو تو نے نوشتہ میں دیکھا نوشتہ کہتا ہے کہ "ہم نے تجھ کو وزن کیا مگر تو پورا نہ اترا اور کم نکلا، ہم نے تیری حکومت کا حساب کیا اور اس کو تمام کرڈالا اور ہم نے تیری حکومت پارہ پارہ کرکے فارس اور میڈیا کے بادشاہ کو بخشدی"[1]۔

چنانچہ اس واقعہ کو چند دن بھی نہ گذرے تھے کہ بابل کی رعایا نے چند افسروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خورس کے پاس جائیں اور اس سے عرض کریں کہ آپ کی ایمانداری، عدل و انصاف اور رعایا پروری کی شہرت نے ہم کو مجبور کیا ہے کہ ہم آپ کو دعوت دیں کہ آپ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلا کر اپنی رعایا بنا لیجئے۔ خورس کے پاس یہ وفد اس وقت پہنچا جبکہ وہ مشرق کی مہم سر کرنے میں مشغول تھا اس نے وفد کی درخواست کو سنا اور قبول کیا اور مشرقی مہم سے فارغ ہو کر بابل پہنچا اور اس کی مستحکم اور نہ تسخیر ہونے والی دوہری شہر پناہ کو منہدم کرکے حکومت بابل کا خاتمہ کردیا اور تمام رعایا کو امن دے کر ان کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائی جس کا بابل کی رعایا نے بسجدۂ شکریہ ادا کیا اور بخوشی اس کی اطاعت قبول کرلی۔[2]

جب خورس بابل کے شہر میں فاتحانہ داخل ہوا تو دانیال (علیہ السلام) نے اس کو تورات (صحف انبیاء) کی وہ پیشنگوئیاں دکھائیں جو حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ نے یہود کو غلامی سے نجات

---

[1] نوشتہ کے الفاظ یہ ہیں "منے منے تقیل او فیرسین" دانی ایل کی کتاب باب ۵ آیات ۲۸-۲۵

[2] تاریخ کے یہ واقعات معہ حوالجات ذوالقرنین کی بحث میں مفصل بیان ہوں گے۔

دلانے والی ہستی کے متعلق کی تھیں، خورس ان کو دیکھ کر بیحد متاثر ہوا اور اس نے اعلان کر دیا کہ تمام یہود آزاد ہیں کہ وہ ملک شام و فلسطین کو واپس چلے جائیں اور وہاں جا کر خدا کے مقدس گھر یروشلم (بیت المقدس) اور اس کے ہیکل (مسجد) کو دوبارہ تعمیر کریں اور اس سلسلہ کے تمام اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کئے جائیں اور یہ بھی اعلان کیا کہ یہی دین، دینِ حق ہے اور یروشلم کا خدا ہی سچا خدا ہے۔

"عزرا کی کتاب" میں ہے کہ اگرچہ خورس کی بدولت یہود کو دوبارہ آزادی اور خوشحالی نصیب ہوئی اور ہیکل کی تعمیر بھی شاہی خزانہ سے شروع ہو گئی مگر ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ خورس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا کیقباد (کمبوجیہ) بھی جلد مر گیا تب آٹھ سال کے اندر ہی دارا جو خورس کا چچا زاد بھائی تھا اس کا جانشین ہوا اس درمیان میں بعض مخالف افسروں نے یروشلم کی تعمیر کو حکما روک دیا تب حجی نبی، اور زکریا نبی[۱] نے دارا کے دربار میں ایک مراسلہ بھیجا جس میں تعمیر بیت المقدس کے متعلق لکھتے ہوئے اس کو بتایا تھا کہ سرکاری دفتر میں خورس کا وہ حکم نامہ ضرور موجود ہو گا جس میں بیت المقدس کی تعمیر کا حکم اور خزانہ شاہی سے اخراجات کا ذکر کیا گیا ہے آپ اس کو نکلوائیں اور اپنے متعلقہ افسروں کو حکم دیں کہ جو بھی اس کی تعمیر میں حائل ہو رہے ہیں ان کو روک دیں تاکہ ہم باطمینان اس کی تعمیر کر سکیں۔ چنانچہ دارا نے جب خورس کا وہ حکمنامہ دفتر سے طلب کیا تو اس میں یہ تحریر تھا۔

خورس بادشاہ کی سلطنت کے پہلے سال مجھ خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے۔ یہ حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور اس کی بنیادیں مضبوطی سے ڈالی جائیں اور . . . . . خرچ بادشاہ کے خزانہ سے دیا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے روپہلے برتن بھی جنھیں بنو کد نضر یروشلم کی ہیکل سے نکال لایا اور بابل میں لا رکھا سو پھیر دیئے جائیں۔ اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ رکھ دیئے جائیں یعنی خدا کے گھر میں رکھ دیئے جائیں[۲]۔

پس اس حکم کے مطابق دارا نے یروشلم کی تکمیل کا حکم دیا اور افسروں کو سختی کے ساتھ روک دیا کہ کوئی اس میں ہرگز مزاحم نہ ہو۔ در یروشلم اور خدائے یروشلم کے ساتھ اپنی اور اپنے پیشرو کی عقیدت کا

---

[۱] یہ زکریا، یحییٰ علیہ السلام کے والد نہیں ہیں بلکہ دوسرے نبی ہیں۔ [۲] عزرا باب ۲ آیات ۱

ان الفاظ میں اظہار کیا۔

میں ایک اور حکم کرتا ہوں کہ جو شخص اس فرمان کو ٹال دے اس کے گھر سے کوئی لٹھا کھینچ کر نکالا جائے اور وہ کھڑا کیا جائے اور وہ اس پر پھانسی دیا جائے اس بات کے لئے اس کا گھر کوڑے کا ڈھیر کر دیا جائے پھر وہ خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوں غارت کرے۔ میں دارا حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیے۔ [۱]

چنانچہ جلد ہی حجّی اور زکریاہ (علیہما السلام) انبیاء بنی اسرائیل کی نگرانی میں دارا کے نہر پار کے صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اور ان کے رفقاء نے اس تعمیر کو مکمل کرا دیا۔ عزرا کی کتاب میں ہے۔

چنانچہ انھوں نے اسرائیل کے خدا کے حکم کے مطابق اور فارس کے بادشاہ خورس اور دارا اور ارتخششتا کے حکم کے مطابق تعمیر کی اور کام کو انجام تک پہنچایا۔ [۲]

یہود بنی اسرائیل کو اب پھر ایک بار امن و اطمینان نصیب ہوا اور انھوں نے ارض یہوداہ میں دوبارہ اپنی حکومت کو استوار کیا اور چونکہ شاہِ بابل نے توراۃ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کر دیا تھا اور ستر برس تک وہ خدا کی اس کتاب سے محروم رہے تھے اس لئے ان کے اصرار پر حضرت عزیر (عزرا) علیہ السلام نے اپنی یادداشت سے از سرِ نو اس کو تحریر کیا۔

شرارتِ یہود کا دوسرا دور

یہود کی قومی خصائل و عادات سے متعلق کافی معلومات کے بعد آپ کے لئے یہ بات حیرت انگیز نہیں ہو سکتی کہ اتنی سخت ٹھوکر کھانے اور ذلت و رسوائی کی اس عبرتناک سزا کو برداشت کرنے کے باوجود جن کی تفصیلات ابھی سپردِ قلم ہو چکی ہیں۔ ان کی چشمِ عبرت اور گوشِ حق نیوش میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اور ان کی حالت اس آیت کا مصداق ثابت ہوئی "لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا" یعنی آہستہ آہستہ انھوں نے پھر ظلم و فساد اور بغاوت و سرکشی پر کمر باندھ لی اور گذشتہ بد اخلاقیوں اور بدکرداریوں کا

[۱] باب ۶ آیت ۱۱-۱۲۔ [۲] باب ۶ آیات ۱۳-۱۴۔

مظاہرہ شروع کردیا۔

کچھ یہ بھی نہیں تھا کہ کوئی ان کو سمجھانے اور تنبیہ کرنے والا نہیں تھا کیونکہ خدائے تعالیٰ کے سچے پیغمبروں کا سلسلہ ان میں جاری تھا اور وہ ان کو سیدھی راہ پر لگانے اور بری راہ سے بچانے کے لئے برابر پند و نصیحت اور موعظت و بصیرت کا حق ادا کرتے رہتے تھے مگر ان کے قومی مزاج کا توازن اس درجہ خراب ہوچکا تھا کہ ان پر کسی اچھی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، وہ پیغمبرانِ حق کا مذاق اڑاتے، باطل کوشی کو شیر مادر سمجھتے اور اپنی حرکاتِ بد پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر کرتے رہتے تھے۔ پھر صورتِ حال اس حد پر جاکر بھی ختم نہیں ہوئی بلکہ اسی درمیان میں ایک ایسا ہوش ربا حادثہ پیش آگیا جس نے یہود کی دنائت اور باطل کوشی کو دوست دشمن دونوں کی نگاہ میں بخوبی روشن کردیا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل

اس ہوشربا حادثہ کی تفصیل یہ ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے یہ عہد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا عہد تھا اور ارضِ یہودیہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مواعظ کا یہ اثر ہو رہا تھا کہ بنی اسرائیل کے قلوب مسخر ہوتے جاتے تھے اور وہ جس جانب بھی نکل جاتے تھے جماعتِ کثیر اُن پر پروانہ وار نثار ہونے لگتی تھی۔ ادھر تو یہ حالت تھی اور دوسری جانب یہودیہ کا بادشاہ ہیرودیس نہایت ہی بدکار اور ظالم تھا وہ حضرت یحییٰؑ کی مقبولیت کو دیکھ کر لرزہ براندام تھا اور خوف کھاتا تھا کہ کہیں یہودیہ کی بادشاہت میرے ہاتھ سے نکل کر اس مردِ ہادی کے پاس نہ چلی جائے، سوءِ اتفاق کہ ہیرودیس کے سوتیلے بھائی کا انتقال ہوگیا اس کی بیوی بیحد حسین تھی اور ہیرودیس کی بھاوج ہونے کے علاوہ اس کی علاتی بھتیجی بھی تھی۔ ہیرودیس اس پر عاشق ہوگیا اور اس سے عقد کرلیا چونکہ یہ عقد اسرائیلی ملت کے خلاف تھا اس لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سرِ دربار اس کو اس حرکت پر ملامت کی اور خدا کے خوف سے ڈرایا۔ ہیرودیس کی محبوبہ نے یہ سنا تو غم و غصہ سے بے تاب ہوگئی اور ہیرودیس کو آمادہ کیا کہ وہ یحییٰ علیہ السلام کو قتل کردے۔ ہیرودیس اگرچہ اس نصیحت سے خود بھی بہت برافروختہ تھا مگر

اس ارادہ میں متامل تھا لیکن محبوبہ کے اصرار پر اس نے حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کا سر قلم کر کے اور طشت میں رکھ کر اس کے پاس بھجوا دیا۔ سخت حیرت کا مقام ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی محبوبیت عام کے باوجود کسی اسرائیلی کو یہ جراءت نہیں ہوئی کہ ہیرودیس کی اس ملعون حرکت پر اس کو روکے یا ملامت کرے، بلکہ ایک جماعت نے اس کے اس ملعون عمل کو بنظرِ استحسان دیکھا۔ اب حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوت و تبلیغ کا وقت آگیا اور انھوں نے علی الاعلان یہود کی بدعات، مشرکانہ رسوم، ظالمانہ خصائل اور بددینی کے خلاف جہادِ لسانی شروع کر دیا، یہود میں یہ صلاحیت کہاں تھی کہ وہ امرِ حق پر لبیک کہتے۔ چنانچہ مختصر سی تعداد کے ماسوا بھاری اکثریت نے ان کی مخالفت شروع کر دی، اسی درمیان میں نبطی بادشاہ حارث نے جو ہیرودیس کی پہلی بیوی کے رشتہ سے اس کا خسر تھا، اس پر چڑھائی کر دی اور سخت کشت و خون کر کے ہیرودیس کو ہزیمت فاش دی جس نے ہیرودیس کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔ تاہم یہودیہ کی ریاست رومیوں کے بل بوتے پر قائم رہی۔ اس وقت اگرچہ عام طور پر یہودیہ کہتے تھے کہ ہیرودیس اور اسرائیلیوں کو یہ ذلت و ہزیمت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے خونِ ناحق کی پاداش میں پیش آئی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس حادثہ سے کوئی سبق نہیں لیا اور وہ اپنے ظالمانہ مقاصد سے باز نہ آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں بغض و عناد کے ساتھ سرگرم رہے تا آنکہ شاہِ یہودیہ پلاطس سے اُن کے قتل کی اجازت حاصل کر کے ان کا محاصرہ کر لیا مگر خدائے تعالیٰ نے ان کے ارادوں کو ناکام بنا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔[۵۱]

آپ غور فرمائیں کہ اس عرصہ میں خدائے تعالیٰ کے قانونِ امہال نے کس درجہ ان کو مہلت دی کہ وہ اپنی حرکاتِ بد سے باز آجائیں مگر انھوں نے اصلاحِ حال کی بجائے یہ کیا کہ اول یحییٰ علیہ السلام کو شہید کر ڈالا اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے بھی آمادہ ہو گئے۔

پاداشِ عمل آخر پاداشِ عمل سامنے آئی اور اب خود یہودیوں کے باہم خانہ جنگی شروع ہو گئی، وجہ یہ پیش آئی کہ اس دور میں یہود کے تین فرقے ہو گئے تھے ایک فقہاء کی جماعت تھی اور ان کو "فریسی" کہتے تھے

[۵۱] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۵ تا ۱۲

اور دوسری جماعت اصحابِ ظاہر کی تھی جو الہامی الفاظ کے ظاہر پر جمود کرتے تھے ان کو "صدوقی" کہتے تھے اور تیسری جماعت مرتاض راہبوں کی تھی۔ ان میں سے فریسی اور صدوقی کا اختلاف اس درجہ ترقی کر گیا تھا کہ ان میں سخت خونریزیاں ہونے لگیں، شاہ یہودیہ جس گروہ کا طرفدار ہو جاتا تھا وہ دوسرے گروہ کو بے دریغ قتل کرتا تھا، آخر یہ جنگ اس درجہ بڑھی کہ شاہ یہودیہ کو باغیوں کے خلاف رومیوں سے مدد لینی پڑتی تھی اور بت پرستوں کے ہاتھوں یہودیوں کو قتل کرایا جاتا تھا چنانچہ اس کشمکش میں رفع عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد یہود کے دو مدعیانِ حق یوحنان اور شمعون کے درمیان سخت معرکۂ جنگ وجدل برپا ہوا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تخت روم پر اس کا ایک بہادر جرنیل اسپناسوس قیصری کر رہا تھا اور ارضِ یہودیہ میں یوحنان کو کامیابی ہو گئی تھی جو نہایت سفاک اور بدکار تھا اور اس کے ظالم ساتھیوں کے ہاتھوں ارضِ قدس کی تمام گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اس حالت میں یہود نے اسپناسوس سے مدد چاہی اور اس نے اپنے بیٹے طیطوس (ٹیٹس) کو ارض مقدس کی فتح پر مامور کیا، وہ آگے بڑھا اور ارضِ یہودیہ کے قریب جا کر اپنے ایک قاصد نیقانوس کو صلح کے لئے بھیجا یہود کا پارۂ ظلم و ستم بہت چڑھا ہوا تھا انھوں نے اس کو بھی قتل کر دیا اب طیطوس غضبناک ہو گیا اور اس نے کہا کہ بلا لحاظ کسی فرقہ کے تمام یہود کا استیصال کر کے جاؤں گا تا کہ ہمیشہ کے لئے اس سرزمین سے یہ جھگڑا پاک ہو جائے چنانچہ بقول مؤرخین اس نے بیت المقدس پر اس قدر سخت حملہ کیا کہ شہر پناہ منہدم ہو گئی۔ ہیکل کی دیواریں شکستہ ہو گئیں محاصرہ کی طوالت سے ہزاروں یہود بھوک سے مر گئے اور ہزاروں فرار ہو کر بے وطن ہو گئے اور جو بچے تھے وہ تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ رومیوں نے ہیکل کی بےحرمتی کی اور جہاں خدائے واحد کی عبادت ہوتی تھی وہاں بت جا کر رکھ دیئے [۱]

غرض یہ وہ شکست تھی کہ پھر یہود کبھی نہ ابھرے اور اپنی کمینہ اور ظالمانہ حرکات، علانیہ فسق و فجور اور نبیوں کے قتل کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔

---

[۱] ابن خلدون ج ۲۔

تیسرا اندرونی موقعہ اور یہود کی روگردانی

کچھ عرصہ بعد رومیوں نے بت پرستی ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی اور اس طرح ان کے عروج و ترقی نے یہودی قومیت اور مذہب دونوں کو مغلوب و مقہور بنا دیا۔

آپ ابھی مطالعہ کر چکے ہیں کہ جب طیطوس رومی نے بیت المقدس کو برباد کر دیا تو یہودیوں کی ایک کافی تعداد وہاں سے بھاگ کر اطراف و جوانب میں جا بسی تھی ان ہی میں سے بعض وہ قبائل بھی ہیں جو یثرب (حجاز) اور اس کے قرب و جوار میں ساکن ہو گئے تھے، یہ اور ان سے قبل و بعد جو قبائل یہود یہاں آ کر سکونت پذیر ہوئے ان کے اس انتخاب سکونت کے متعلق مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہود کو توراۃ اور قدیم صحیفوں سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ سرزمین نبی آخر الزماں کا دار الہجرۃ بنے گی اور یہود نبی آخر الزماں کے اس درجہ منتظر تھے اور ان کے یہاں اس کی آمد کی اس قدر شہرت تھی کہ جب حضرت یحیٰی علیہ السلام نے تبلیغ و دعوت کے ذریعہ پیغام الٰہی سنانا شروع کیا تو یہود نے جمع ہو کر ان سے صاف کہا کہ ہم تین نبیوں کا انتظار کر رہے ہیں ایک مسیح کا دوسرے ایلیاس کا اور تیسرے اس مشہور و معروف نبی آخر الزماں کا جس کی آمد کی شہرت ہمارے درمیان اس قدر ہے کہ ہم اس کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور صرف اس کی جانب اشارہ کر دینے سے ہر ایک یہودی اس کو پہچان لیتا ہے چنانچہ انجیل یوحنا میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

> اور یوحنا (یحییٰ) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن[۱] اور لیوی[۲] یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انھوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایلیا (الیاس) ہے۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی[۳] ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں؟[۴]

توراۃ انجیل صحائف انبیا اور تاریخ یہود میں اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں کہ جن سے یہ

۱؎ و ۲؎ یہ یہود کے مذہبی مناصب ہیں۔ ۳؎ توراۃ میں اس کا لقب فارقلیط (احمد) ہے۔ ۴؎ باب ۱ آیات ۲۱-۱۹۔

تحقیق ہوتا ہے کہ یہود کو ایسے پیغمبر کا انتظار تھا جو نبی آخر الزماںؐ ہوگا اور حجاز میں مبعوث ہوگا۔ اسی وجہ سے جب بھی وہ اپنے مرکز سے منتشر ہوئے ہیں تو ان کی ایک معقول تعداد اسی کے انتظار میں یثرب میں جا بسی۔ [1]

ابدی ذلت و خسران

پس کس درجہ بدبخت و بدقسمت ہے وہ جماعت جس نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت سے تقریباً پانچسو ستر سال تو اس انتظار میں گذارے کہ یثرب کی اس سرزمین میں جب خدائے تعالیٰ کا وہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کرکے آئے گا تو ہم اس کی پیروی کرکے اپنی قومی اور مذہبی عظمت و وقار کو پھر ایک بار حاصل کریں گے حتیٰ کہ یثرب کے قبائل اوس و خزرج کے مقابلہ میں بھی اسی کی نصرت و مدد کے منتظر رہتے تھے مگر جب وہ نبی برحق آیا اور اس نے موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) اور توراۃ و انجیل کی تصدیق کرتے ہوئے ان کو پیغام حق سنایا تو سب سے پہلے انھوں (یہود) نے ہی ان کے خلاف بغض و عناد کا مظاہرہ کیا اور اس کی آواز پر کان نہ دھرتے ہوئے اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور نتیجہ میں ابدی ذلت و حرماں نصیبی کو مول لیا۔

اللہ تعالیٰ نے تو شروع ہی میں ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ دو مرتبہ کی سرکشی اور اس کے انجام کے بعد ہم تم کو ایک موقعہ اور عنایت کریں گے پس اگر تم اس وقت سنبھل گئے اور تم نے خدا کی فرمانبرداری کا ثبوت دیا اور خدا کے پیغمبر کی صداقت کا اقرار کرکے دینِ حق کو قبول کر لیا تو ہم بھی تمہاری عظمتِ رفتہ کو واپس لے آئیں گے اور دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ اندوز کریں گے لیکن اگر تم نے اس موقعہ کو بھی گنوا دیا اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی قدیم شرارتوں کا مظاہرہ کیا تو ہم بھی پاداشِ عمل کا قانون نافذ کریں گے۔ "وان عدتم عدنا"

غرض جب یہود نے اس مرتبہ بھی اپنی قومی سرشت کو ہاتھ سے نہ دیا تو خدائے تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں یہ آخری فیصلہ سنا دیا "ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباؤا بغضب من اللہ۔" اور یہی ہوا بھی کہ قوم یہود کو نہ پھر کبھی عزت نصیب ہوئی اور نہ حکومت اور آج بھی

[1] یہ بحث اپنے موقع پر تفصیل سے آئے گی۔

امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہونے کے باوجود قومی عزت و حکومت سے محروم ہیں، اور قیامت تک محروم رہیں گے اور دنیا کی جو حکومت طاقت بھی اپنے ناپاک مقاصد کی خاطر مسطورہ بالا فیصلہ کو چیلنج کر کے ان کو برسرِ حکومت و اقتدار لانا چاہیگی وہ کبھی اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور بہت ممکن ہے کہ خود بھی قہرِ الٰہی کا شکار ہو کر یہود ہی کی طرح ذلت و خسران میں مبتلا ہو جائے اور دوسروں کے لئے عبرت و بصیرت بنے "وما ذلک علی اللہ بعزیز"

بہرحال اہلِ ذوق ان حقائق کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآنِ عزیز کی زیرِ بحث آیات کا مصداق جو کہ بیت المقدس کی تباہی اور یہود کی بربادی سے تعلق رکھتا ہے تاریخی اعتبار سے بخت نصر اور طیطس رومی سے ہی متعلق ہے اور باقی اقوال بلحاظِ تاریخ آیات کا صحیح مصداق نہیں بنتے " فاعتبروا یا اولی الالباب "

بصائر (۱) اگرچہ یہ دنیا "دار العمل" ہے "دار الجزاء" نہیں ہے تاہم خدائے تعالیٰ کبھی کبھی دنیا میں بھی مجرموں کو ان کی پاداشِ عمل میں اس طرح کس دیا کرتے ہیں کہ خود ان کو اور ان کے معاصرین کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ ان کے جرائم کی سزا ہے اور ان کی تاریخی زندگی بعد میں آنے والوں کے لئے سامانِ عبرت و بصیرت بن جاتی ہے خصوصاً غرور اور ظلم یہ دو ایسے لعنت جرائم اور ام الخبائث ہیں کہ مغرور اور ظالم کو آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ضرور اپنی بدعملیوں کا کچھ نہ کچھ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ انفرادی کبر و ظلم کی پاداش شخص و فرد کی زندگی سے متعلق ہوتی ہے اور قومی و اجتماعی کبر و ظلم کی پاداش قومی اور اجتماعی زندگی سے وابستہ ہوتی ہے اس لئے اول الذکر کی مدت میں زیادہ عرصہ نہیں ہوتا مگر ثانی الذکر کی مدت کبھی ایسی طویل نظر آتی ہے کہ مظلوم قوم اور جماعت مایوسی کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی نظر سے یہ نکتہ اوجھل ہو جاتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت اور کامرانی و ناکامی کی عمر افراد و اشخاص کی عمر کی طرح نہیں ہوتی بلکہ طویل ہوتی ہے تاہم بعض حالات میں عبرت و بصیرت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے اس مدت کو کبھی مختصر بھی کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہود کی زیرِ بحث

تاریخ کے واقعات وحالات اس کی زندۂ جاوید شہادت ہیں، اور قابل صد ہزار عبرت وبصیرت۔

(۲) منکرین حق اور باطل پرست قوموں کو اگر عبرت وبصیرت کے پیش نظر دنیا میں کسی قسم کی سزا دی جاتی یا ان کو عذاب الٰہی میں پکڑا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان پر سے آخرت کا عذاب (عذاب جہنم) ٹل جاتا اور معاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ اسی طرح قائم رہتا ہے جو اپنے وقت پر ہو کر رہے گا۔ وجعلنا جہنم للکفرین حصیرا۔

(۳) اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اس کی بدکرداریوں اور اس کے مظالم ومفاسد کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرنا اور اپنے پاداشِ عمل کے قانون کو ان پر نازل کرنا چاہتا ہے تو سنت اللہ یہ جاری ہے کہ وہ بداعمالیوں کے فوراً بعد ہی ایسا نہیں کرتا بلکہ ایک عرصہ تک اس کو مہلت دیتا اور ہادیوں اور پیغمبروں کی معرفت ان کو ترغیب وترہیب کی راہ سے ہدایت پر لانے کے تمام مواقع بہم پہنچاتا ہے تاکہ خدا کی حجت ہر طرح تمام ہو جائے پس اگر اس کے بعد بھی ان کی سرکشی اور بغاوت اور ظلم وعدوان کا تسلسل اسی طرح قائم رہتا ہے تو اس کی بطشِ شدید اچانک مجرم قوم کو اس طرح دبوچ لیتی ہے کہ پھر کیفر کردار پر پہنچے بغیر رستگاری ناممکن ہو جاتی ہے اور ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مشاہدہ کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔

سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔	عنقریب ظالم جان لیں گے کہ کس طریقۂ انقلاب کے ذریعہ وہ الٹ دئے جائیں گے۔

ذوالقرنین

سلاہ ۵۶ قم

تمہید ذوالقرنین۔ ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذوالقرنین اور سکندر مقدونی۔ ذوالقرنین اور ذوایزن علماء سلف کی رائے۔ متاخرین کی رائے۔ یہود و قریش اور انتخاب سوالات۔ ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشنگوئیاں۔ خورس اور تاریخی شواہد۔ مغربی مہم۔ مشرقی مہم۔ شمالی مہم۔ فتح بابل۔ خورس کا مذہب۔ ایرانِ قدیم کا مذہب۔ ذوالقرنین اور قرآنِ عزیز۔ یاجوج و ماجوج۔ سد۔ یاجوج و ماجوج کا آخری خروج۔

تمہید یہ واقعہ اپنی دلچسپ تاریخی روایات کے لحاظ سے تین اہم حصوں پر منقسم ہے، ذوالقرنین کی شخصیت؟ سدِ ذوالقرنین؟ یاجوج و ماجوج؟ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سہ مسائل کو جدا جدا بیان کر کے اس واقعہ کی اصل حقیقت کو واضح کیا جائے۔

زیر بحث مسائل اور علماء اسلام سلف میں اگرچہ مسائل زیر بحث کے متعلق ایسے اقوال بہ کثرت ملتے ہیں جو ان مسائل کی تفسیر و تفصیل کی غرض سے بیان کئے گئے ہیں لیکن علماء متاخرین نے اس سلسلہ میں دو جدا جدا راہیں اختیار کر لی ہیں، ایک جماعت سلف کے بعض اقوال کو نقل کرنے کے بعد یہ کہہ دینے پر اکتفا کرتی ہے کہ زیر بحث مسائل سے متعلق منقول اقوال چونکہ قرآن کی بیان کردہ شخصیت ذوالقرنین کے ساتھ پوری طرح مطابقت نہیں کرتے اس لئے ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ ایک جانب یہ یقین و اعتقاد رکھیں کہ قرآنِ عزیز نے جس حد تک ذوالقرنین کی شخصیت، سد اور یاجوج و ماجوج پر روشنی ڈالدی ہے وہ بلاشبہ حق ہے اور باقی تفصیلات یعنی اس کی شخصیت کا تاریخی مصداق، سد کا جائے وقوع اور قوم یاجوج و ماجوج کا تعین۔ سو ان کے علم کو سپرد بخدا کر دینا چاہئے کیونکہ "تفویض" کا طریقہ ہی اسلم طریقہ ہے۔ لیکن ہے ایک تحقیق طلب طبیعت اس پر

قانع نظر نہیں آتی اور وہ اضطراب و تردد میں پڑجاتی ہے تو یہ جماعت اس کو مطمئن کرنے کے لئے اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ جبکہ دنیوی اسباب علم اور وسائلِ معلومات کے اس حیرت زا دور میں بھی محققینِ علم الآثار (Archaeology) کو یہ اعتراف ہے کہ ابھی وہ اس دنیا کے مستور تاریخی خزانوں اور نظروں سے اوجھل تاریخی حقائق کے معلوم کرنے میں سمندر میں سے قطرہ کی مقدار حاصل کرپائے ہیں اور جبکہ ہم چند صدی قبل تک دنیا کے چوتھے برِ اعظم امریکہ کی دریافت سے بھی قاصر رہے تھے تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر ابھی تک دنیا اور موجودہ علوم تحقیق سدِ ذوالقرنین کو نہ پا سکے ہوں اور یاجوج و ماجوج کے متعلق ان کا علمِ تحقیق ابھی تک قاصر رہا ہو اور وہ ذوالقرنین کی شخصیت کا تعین نہ کر سکے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ پہلے دو امور وقتِ موعود تک یعنی قریب بہ قیامت منکشف ہو کر ہمارے سامنے آجائیں اور ان دونوں کے انکشاف سے ذوالقرنین کی شخصیت کا بھی بآسانی تاریخی تعین ہو جائے۔ پھر کون سی وجہ ہے کہ اگر ہم ان امور کی تاریخی تفصیلات کو آج نہ بیان کر سکیں تو اس بنا پر ان امور کو محض افسانوی داستان سمجھ لیا جائے۔ خصوصاً جبکہ قرآن عزیز وحی الٰہی کے علمِ یقین کے ذریعہ ان کے وجود کی اطلاع دیتا ہے اور جبکہ اہلِ علم کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ ہمارا کسی شے کو نہ جاننا اس کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ شے حقیقتاً بھی وجود نہیں رکھتی۔ پس ایک مسلمان کے لئے تو اسی قدر کافی ہے کہ نفسِ مسئلہ پر یقین کرتے ہوئے تفصیلات کو سپردِ بخدا کر دے اور منکرین وحی الٰہی کے لئے زیادہ سے زیادہ توقف کی گنجائش ہو سکتی ہے نہ کہ انکار پر اصرار کی۔

اس کے برعکس علماءِ اسلام میں سے دوسری جماعت ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہے اور وہ قرآنِ عزیز کی عطا کردہ روشنی میں ان کے حقائق کی تفصیلات کو واضح کرنا نہایت ضروری جانتی اور قرآنِ حکیم کی اہم تفسیری خدمت یقین کرتی ہے، اس کا خیال ہے کہ مسائل زیرِ بحث میں تفویض کے طریقہ کو اختیار کر کے ہم اپنی ذمہ داری سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے اور یہ اس لئے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے معاملہ کو یہود کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور اسی بنا پر اس نے وہ اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے جس سے سوال کرنے والی جماعت اس اقرار کرنے پر

مجبور ہو جائے کہ "نبی امی" نے وحی الٰہی کے ذریعہ ان ہر سہ مسائل کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں بلاشبہ وہ صحیح ہیں اور یہ کہ بنی اسرائیل ہی "روح" کے سوال پر قرآن کا جواب اس کے برعکس اسلوب پر مذکور ہے اور دریافت کرنے والوں کو صرف اس قدر بتا کر کہ "روح" خدا کے علم و امر میں سے ایک ایسی شے ہے جو اس کے حکم سے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ مزید تفصیلات کو ان کی عقول کے لحاظ سے غیر ضروری قرار دیدیا ہے لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز ذوالقرنین سے متعلق تفصیلات کے درپے ہے اور یہود کو یا مشرکین اور یہود دونوں کو ان کی معلومات کے مطابق مطمئن کرنا چاہتا بلکہ اس سلسلہ میں ان کے یہاں بعض تفصیلات نے جو افسانوی شکل اختیار کر لی تھی اس کے خلاف حقائق واقعیہ کو کھول دینا چاہتا ہے۔

نیز اس لئے بھی یہ مسائل محتاجِ تحقیق ہیں کہ قرآن حکیم کے اسلوبِ بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہود اس تاریخی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی قومی اور مذہبی زندگی کا اس کے ساتھ گہرا تعلق تھا تب ہی انھوں نے اس مسئلہ کو مشرکین کی اعانت کے لئے اس لئے انتخاب کیا کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بآسانی امتحان ہو جائے گا، پس جو معاملہ آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے تک لوگوں کی معلومات میں تھا اور جس کی تفصیلات وہ قومیں بخوبی جانتی تھیں اس کے متعلق یہ کہکر سبکدوش اور قرآن کے بیان کردہ اس اہم واقعہ کی تفسیر سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا کہ جبکہ ہم خدا کی زمین کے بہت سے حصوں سے ابھی تک ناواقف ہیں تو ممکن ہے کہ اس واقعہ کے متعلق شخصیتیں اور مقامات بھی اسی طرح غیر معلوم ہوں اور ہم ابھی تک ان کا پتہ لگانے سے قاصر رہے ہوں۔ چنانچہ علماءِ محققین مثلاً حافظ ابن تیمیہ، ابنِ کثیر، ابو حیان، ابن عبد البر، امام رازی حافظ ابنِ حجر، شیخ بدرالدین عینی، ابنِ ہشام اور سہیلی (رحمہم اللہ) ان مسائل کی تحقیق و تدقیق کے درپے نظر آتے اور اس بارہ میں اپنے رجحان کے مطابق فیصلہ دینا چاہتے ہیں۔

مسائل زیر بحث سے متعلق ہمارا خیال ان ہی علماءِ تحقیق کی پیروی پر آمادہ ہے بلکہ ہم ان مسائل کے متعلق اس لئے اور بھی زیادہ تحقیق و تدقیق کے خواہشمند ہیں کہ جن مستشرقینِ یورپ نے

قرآنِ عزیز کے الہامی کتاب ہونے کے خلاف زہر چکانی کی ہے اور اپنے مزعومہ دلائل سے جہاں اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ثابت کیا ہے وہیں یہ بھی ہرزہ سرائی کی ہے کہ قرآن کے بعض بیان کردہ واقعات، حقائق نہیں ہیں بلکہ اہلِ عرب کے مشہور افسانوں کو حقیقت کے نام سے بیان کر دیا گیا ہے۔

اسلامی مسائل میں مستشرقین یورپ کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اکثر تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے اندازے اور قیاس سے چند ایسے مقدمات وضع کر لیتے ہیں جن سے ان کو اپنے مزعومات اور خیالات میں مدد ملے اور اسلام بلکہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ حقائق کی تردید کی جا سکے چنانچہ اصحاب رقیم (پیٹرا) کے متعلق قرآن عزیز نے جب چند حقایق کا اظہار کیا اور موعظت و عبرت کے لئے وہ ان کے حالات و واقعات کو روشنی میں لایا تو انھوں نے اپنی ناواقفیت و جہل کو چھپانے یا تعصب کی راہ سے قرآن کو جھٹلانے کے لئے رقیم (پیٹرا) کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور جرارتِ بےجا کے ساتھ یہ کہدیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب کے سنے سنائے جھوٹے قصے کو وحی الٰہی کہکر بیان کر دیا ہے مگر جب قدرت کے ہاتھوں نے قرآن کے اعلانِ حق کے تیرہ سو سال کے بعد پیٹرا کو ٹھیک اسی مقام پر ظاہر کر دیا اور اس کے عظیم الشان کھنڈر اپنے وجود کا اعلان کرنے لگے تو ان کو حقیقت کے سامنے سر جھکانا پڑا اور ندامت و شرمساری کے ساتھ قرآنِ عزیز کے اعلانِ حق کو تسلیم کئے بغیر ان کے لئے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

اسی طرح جب قرآن عزیز نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصہ تک مصر میں فراعنۂ مصر اور قبطیوں کے غلام رہے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) نے صدیوں کے بعد ان کو خدا کے بخشے ہوئے اعجاز کے ذریعہ نجات دلائی اور اس مسئلہ میں توراۃ نے بھی ایک حد تک قرآن اور وحی الٰہی کے علمِ یقین کا ساتھ دیا تو اس کے باوجود ان مدعیانِ علم نے ایک عرصہ تک مصر میں بنی اسرائیل کی غلامی کا انکار کیا اور علمِ حقیقی کی تکذیب کے درپے رہ کر اس کا مذاق اڑایا مگر مصری حفریات نے جب فرعون کے مشہور سنگی کتبہ کا اکتشاف کرایا اور کتبہ کی کندہ عبارت نے بنی اسرائیل کی غلامی پر

ایک حد تک روشنی ڈالی تو آہستہ آہستہ جہل نے علم کے سامنے شکست قبول کرلی اور اب ان نظریات میں بھی تبدیلی ہونے لگی جو فلسفۂ تاریخ کے نام پر محض ظن وتخمین سے قائم کئے گئے تھے اور جن کو علم کا درجہ دیا جاتا تھا یہاں تک کہ اب انکار، اقرار کی شکل میں تبدیل ہونے لگا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ذوالقرنین، یاجوج وماجوج اور سد کا معاملہ ہے۔ قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں ایک ایسے پادشاہ کا تذکرہ کیا ہے جس کا لقب ذوالقرنین ہے اور جس نے مشرق ومغرب تک فتوحات کیں اور دوران فتوحات میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کے بسنے والوں نے اس سے یہ شکایت کی کہ یاجوج وماجوج ہم کو ستاتے اور وحشیانہ حملے کرکے فساد مچاتے اور بربادی لاتے ہیں آپ ہم کو ان سے نجات دلائیے۔ ذوالقرنین نے یہ سُنکر ان کو تسلی وتشفی دی اور لوہے اور تانبے کو پگھلا کر دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی سد قائم کردی کہ شکایت کرنے والے یاجوج وماجوج کے فتنہ سے محفوظ ہوگئے۔

مستشرقین یورپ نے جب اس واقعہ کا مطالعہ کیا تو حسب عادت اپنے پیشرو مشرکین مکہ اور کفارِ عرب کی طرح فوراً یہ کہدیا۔

اِنْ هِيَ اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۔ یہ (قرآن) کچھ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں۔

اور بڑے زور وشور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ ذوالقرنین کا یہ قصہ اخبارِ قرآنی کے اعجاز اور عبرت وموعظت کے لئے حقیقی واقعہ نہیں ہے بلکہ عرب کی ایک فرسودہ داستان اور بے سروپا کہانی کو وحی الٰہی کی حیثیت دیدی گئی ہے ورنہ تاریخی دنیا میں ذوالقرنین اور یاجوج وماجوج کی شخصیتیں اور سدِ ذوالقرنین کا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

پس ایسی صورت میں ایک مسلمان کا فرض ہوجاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ذاتی اعتقاد کی بنا پر بلکہ تاریخی نقطۂ نگاہ کے مطابق یہ واضح کرے کہ دوسرے تاریخی مسائل کی طرح قرآنِ عزیز کا عطا کیا ہوا علم ویقین اس مسئلہ میں بھی اپنی جگہ اٹل اور علم ویقین کے درجہ کی حقیقت ہے اور معترضین کا انکار بلاشبہ جہل، ظن وتخمین اور باطل مزعومات کا طومار ہے اور ان تاریخی حقائق کا انکار صرف

بے جا تعصب پر مبنی ہے نہ کہ اظہارِ حقیقت کے پیشِ نظر۔

ذوالقرنین ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرنے سے قبل حل طلب اہم سوال یہ ہے کہ قرآن عزیز نے اس معاملہ کی جانب کس لئے توجہ کی اور اگر از خود نہیں بلکہ کسی سوال کے جواب پر توجہ مبذول کی تو سائل کون ہیں اور کس بنیاد پر انھوں نے اس سوال کا انتخاب کیا؟ یہی وہ سوال ہے جو دراصل اس معاملہ کی کلید ہے اور اگرچہ بہ سلسلۂ شانِ نزول مفسرین اور اربابِ سیر نے اس کی جانب توجہ فرمائی ہے مگر تحقیقِ شخصیت کے وقت ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ذوالقرنین کی شخصیت، سد کا تعین اور یاجوج و ماجوج کی تحقیق اگرچہ تین مستقل مسائل ہیں تاہم یہ تینوں اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر کسی ایک کے متعلق واضح تحقیق سامنے آجائے تو قرآنِ عزیز کی تفصیلات کی روشنی میں باقی دو مسائل کے حل میں بہت زیادہ سہولت ہو جاتی ہے۔

ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت محمد بن اسحٰق نے بروایت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) بیان کیا ہے کہ قریش مکہ نے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو علماءِ یہود کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ چونکہ تم خود کو اہلِ کتاب کہتے ہو اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تمہارے پاس زمانۂ سابق کے پیغمبروں کا وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہم کو یہ بتائیں کہ ان کے دعویٰ پیغمبری کی صداقت کے متعلق آپ حضرات کی الہامی کتابوں میں کوئی تذکرہ یا علامات موجود ہیں یا نہیں؟۔

چنانچہ قریش کے وفد نے یثرب پہنچ کر علماءِ یہود سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا، احبارِ یہود نے ان سے کہا تم اور باتوں کو چھوڑو ہم تم کو تین سوالات بتائے دیتے ہیں اگر وہ ان کا صحیح جواب دیدیں تو سمجھ لینا کہ وہ ضرور اپنے دعویٰ میں سچے ہیں اور نبی مرسل ہیں لہٰذا تم پر ان کی پیروی واجب ہے اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکیں تو وہ کاذب ہیں پھر تم کو اختیار ہے کہ جو معاملہ ان کے ساتھ چاہو کرو، وہ سوالات یہ ہیں۔ (۱) اس شخص کا حال بیان کیجئے جو مشرق و مغرب تک فتوحات کرتا چلا گیا؟۔ (۲) ان چند نوجوانوں پر کیا گذرا جو کافر بادشاہ کے خوف سے پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپے تھے؟

(۳) روح کے متعلق بیان کیجئے؟ وفد مکہ واپس آیا اور اس نے قریش کو یہودی علماء کی گفتگو سنائی قریش نے سن کر کہا "اب ہمارے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ دیکھے ان سوالات کے جوابات ایک امی انسان جب ہی دیکتا ہے کہ درحقیقت اس پر خدا کی جانب سے وحی آتی ہو" چنانچہ قریش مکہ نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر تینوں سوالات پیش کر دیئے ان ہی سوالات کے جوابات کے لئے آپ پر سورہ کہف کا نزول ہوا۔ [1]

محدثین نے اس روایت کے مختلف طریقوں کو بیان کرکے اس کی تحسین فرمائی ہے اور سدی کے طریق روایت میں اس قدر اور اضافہ ہے۔

قال قالت الیهود، اخبرنا عن نبی	یہود نے کہا: ہم کو اس نبی کا حال بتائیے جس کا ذکر
لم یذکرہ الله فی التوراة الا فی	اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں صرف ایک ہی جگہ کیا ہے
مکان واحد۔ قال ومن؟	نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دریافت فرمایا:
قالوا "ذوالقرنین" [2]	"وہ کون" یہود نے کہا: "ذوالقرنین"۔

یہود کے اس بلاواسطہ سوال کے متعلق محدثینؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ راوی نے اختصار سے کام لیا ہے صحیح تفصیل یہ ہے کہ ان سوالات کا انتخاب یہود نے کیا تھا مگر قریش کی زبان سے ادا کرائے گئے، اور ہو سکتا ہے کہ سوال میں لفظ توراۃ دیکھ کر نیچے کے کسی راوی نے اپنے وہم سے ان سوالات کو بلاواسطہ یہود کی جانب سے سمجھ لیا ہو۔

غرض۔ اس روایت سے تین اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے (الف) یہ کہ ذوالقرنین سے متعلق سوال اگرچہ قریش کی زبان سے ادا ہوا لیکن اصل میں یہ یہود کی جانب سے تھا۔ (ب) یہ ایسے شخص سے متعلق سوال تھا جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ "ذوالقرنین" کہا گیا ہے (ج) اس شخص کو قرآن نے اپنی جانب سے ذوالقرنین کا لقب نہیں دیا بلکہ سوال کرنے والوں کے سوال کے پیش نظر اس کو دہرایا ہے چنانچہ قرآن کا یہ اسلوبِ بیان بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۷۲-۷۱ و در منثور ج ۴۔ [2] قرطبی قلمی سورۂ کہف۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۔ وہ تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین کا حال بتاؤ۔

ذوالقرنین اور سکندر مقدونی

ذوالقرنین کس شخصیت کا لقب ہے اس بحث سے قبل یہ معلوم رہنا از بس ضروری ہے کہ بعض حضرات کو یہ سخت مغالطہ ہوگیا ہے کہ سکندر مقدونی ہی وہ ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن سورۂ کہف میں کیا گیا ہے۔ یہ قول باتفاق جمہور علماء سلف وخلف قطعًا باطل اور جہالت پر مبنی ہے اس لئے کہ قرآن کی تصریحات کے مطابق ذوالقرنین صاحبِ ایمان اور مردِ صالح پادشاہ تھا اور سکندر مقدونی مشرک اور جابر بادشاہ گذرا ہے جس کے شرک وظلم کی صحیح تاریخ خود اس کے بعض امراءِ دربار نے بھی مرتب کی ہے اور تمام معاصرانہ شہادتیں بھی اس کے بت پرست اور جابر وظالم ہونے پر متفق ہیں۔

امام بخاریؒ نے "کتاب احادیث الانبیاء" میں ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے تذکرہ سے قبل نقل کیا ہے، اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے ہیں۔

وفی ایرادہ المصنف ترجمۃ	مصنف نے ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیمؑ
ذی القرنین قبل ابراہیم اشارۃ	کے تذکرہ سے قبل اس لئے بیان کیا ہے کہ وہ اس
الی توھین قول من زعم انہ	شخص کے قول کی اہانت کرنا چاہتے ہیں جو سکندر
الاسکندر الیونانی ؎	یونانی کو ذوالقرنین کہتا ہے۔

اور پھر اپنی جانب سے تین وجوہِ فرق بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ سکندر یونانی کسی طرح بھی قرآن میں مذکور ذوالقرنین نہیں ہوسکتا، انھوں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جن حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کہا ہے غالبًا ان کو اس روایت سے مغالطہ ہوا ہے جو طبری نے اپنی تفسیر میں اور محمد بن ربیع جیزی نے کتاب الصحابہ میں نقل کی ہے اور جس میں اس کو رومی اور بانی اسکندریہ کہا گیا ہے مگر یہ روایت ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہے ؎

اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ ذوالقرنین کے نام کی تعیین سے متعلق مختلف اقوال نقل کرتے

؎ و ؎ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۴۔

ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

اور اسحٰق بن بشر نے بروایت سعید بن بشیر قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح (علیہ السلام) کی نسل سے تھا لیکن اسکندر بن فیلپس (مقدونی) کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے ہیں جو رومی اور بانی اسکندریہ ہے مگر واضح رہے کہ یہ دوسرا ذوالقرنین پہلے سے بہت زمانہ بعد پیدا ہوا ہے کیونکہ سکندر مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال قبل ہوا ہے اور مشہور فلسفی ارسطاطالیس اس کا وزیر تھا اور یہ ہی وہ بادشاہ ہے جس نے دارا بن دارا کو قتل کیا اور فارس کے بادشاہوں کو ذلیل کر کے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ہم نے یہ تنبیہ اس لئے کر دی کہ بہت سے آدمی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں اور یہ اعتقاد کر بیٹھے ہیں کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ یہی سکندر مقدونی ہے جس کا وزیر ارسطاطالیس فلسفی تھا اور اس اعتقاد کی بدولت بہت بڑی غلطی اور بہت زیادہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے کہ ذوالقرنین اول مسلمان اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر (علیہ السلام) تھے جن کے متعلق ہم ثابت کر آئے ہیں کہ وہ نبی تھے اور دوسرا (مقدونی) مشرک تھا اور اس کا وزیر فلسفی تھا اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے پس کہاں یہ (مقدونی) اور کہاں وہ (عربی سامی) اور ان دونوں کے درمیان اس درجہ امتیازات ہیں کہ بجز ماسوا غبی اور حقائق سے ناآشنا شخص کے دوسرا کوئی شخص ان دونوں کو ایک کہنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ [۵۱]

اور امام رازیؒ نے اگرچہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیا ہے بایں ہمہ ان کو بھی یہ اقرار ہے۔

کان ذو القرنین نبیا وکان الاسکندر کافرا	ذوالقرنین نبی تھے اور سکندر مقدونی کافر
وکان معلمہ ارسطاطالیس وکان یأتمر	تھا اور اس کا معلم اور وزیر لا ئبہ کافر تھا۔
بامرہ وھو من الکفار بلا شک [۵۲]	

---

[۵۱] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰۶-۱۰۵۔ [۵۲] تفسیر کبیر سورۂ کہف۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس مغالطہ کی وجہ یہ نقل کی ہے کہ چونکہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین متقدم ہے اور وہ وسیع حکمت کا مالک رہا ہے اور سکندر یونانی بھی وسیع حکومت کا حکمراں رہا ہے۔ اس لئے اس کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے یا اس لئے کہ وہ دو بادشاہتوں روم اور فارس کا بادشاہ ہوگیا تھا۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے محمد بن اسحق نے اپنی سیرت میں ذوالقرنین کا نام سکندر نقل کردیا ہے اور چونکہ اس کی سیرت بہت مشہور و مقبول ہے اس لئے یہ نام بھی شہرت پاگیا اور حافظ عماد الدین کا خیال یہ ہے کہ چونکہ اسحق بن بشر کی روایت میں قرآن میں مذکور ذوالقرنین کا نام بھی سکندر بتایا گیا ہے اس لئے غلطی اور نادانی سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔

غرض۔ حافظِ حدیث شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن عبدالبر، زبیر بن بکار، ابن حجر، ابنِ کثیر عینی (رحمہم اللہ) جیسے محققین نے اس مغالطہ کی پوری طرح تردید کردی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے جو محاسن و مناقب بیان کئے ہیں ان کے پیشِ نظر ایک بت پرست اور جابر و ظالم شخص کو ان کا مصداق بنانا فاش غلطی ہے۔ [له]

استدراک [له]

کیا ذوالقرنین سکندر مقدونی ہے؟

جولائی سنہ کے برہان میں میرا ایک مضمون "ذوالقرنین اور سدِ سکندری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا یہ مسلسل مضمون کی پہلی قسط تھی اور اگست کے برہان میں بھی ابھی تک وہ سلسلہ ناتمام ہی تھا کہ محترم مدیر صاحب صدق نے پہلی قسط پر ایک "استدراک" لکھکر برہان کی عزت افزائی فرمائی اور مجھکو اس سلسلہ میں مزید لکھنے کا موقعہ مرحمت فرمایا جس کے لئے صاحبِ موصوف کا ممنون ہوں۔

"یہ" استدراک برہان کی اشاعت سے قبل ہی ۲ اگست کے صدق میں قدرے اضافہ کے ساتھ طبع ہوگیا اور اب ۱۸ اگست کے صدق میں بھی "سدِ سکندری" کے عنوان سے اسی کا ایک تکملہ یا ذیل شائع ہوا ہے۔

ذوالقرنین اور اثر ماءِ مکن	ایک جویا رِ حق کو یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ وسعت حکومت اور زبردست سطوت وصولت کے لحاظ سے جس طرح بعض حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶۔

بہر حال اگست کے برہان میں جو "استدراک" شائع ہوا ہے چونکہ وہی اصل ہے اور صاحبِ استدراک کے دلائل کا حامل، اس لئے "تنقید باستدراک" کی بنیاد بھی اسی پر قائم کی گئی ہے اور صدق کے ہر دو مضامین کے اضافات کو ضمنی طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ (محمد حفظ الرحمٰن)

ذوالقرنین کی تحقیق سے متعلق میرا مضمون تحلیل وتجزیہ کے بعد دو حصوں پر تقسیم ہو سکتا ہے۔ ایک مسئلہ کا "اثباتی پہلو" اور دوسرا "منفی پہلو"۔ اثباتی پہلو میں مضبوط دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ سائرس (کیخسرو یا خورس) ہی وہ شخصیت ہے جس کو قرآنِ عزیز نے "ذوالقرنین" کہکر یاد کیا ہے اور "منفی پہلو" میں ان اقوال کو مرجوح قرار دے کر جو "سائرس" کے علاوہ "ذوالقرنین" کا مصداق متعین کرتے ہیں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ قرآنِ عزیز میں منصوص اور مصرح مذکور نہیں ہے اس لئے دوسری ہستیوں کے متعلق بھی مجالِ گفتن باقی رہتی ہے۔ لیکن ذوالقرنین سے متعلق قرآنی صفات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر قطعی ہے کہ "سکندر مقدونی" کسی حالت میں بھی "قرآن کا ذوالقرنین" نہیں کہلایا جا سکتا۔ اور بعض علماءِ حق نے اگر اس کو ذوالقرنین بنایا ہے تو سلفِ صالحین اور خلفِ صادقین کی اکثریت نے ان کے اس قول کی سختی سے تردید کی ہے اور ناقابلِ انکار دلائل کے ساتھ تردید کی ہے۔

علماءِ اسلام نے جن دلائل کی روشنی میں اس انکار پر اصرار کیا ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ زیر بحث مضمون میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن محترم "صاحبِ استدراک" نے ان میں سے صرف تین باتوں کو منتخب فرما کر ان پر "استدراک" سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ترتیب وار "تنقیدی نظر" ڈالی جائے تاکہ مسئلہ زیر بحث بخوبی منقح ہو سکے۔ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

مقالۂ مذکور مندرجہ برہان بابت جولائی ۱۹۳۸ء میں ذوالقرنین کے سکندرِ مقدونی ہونے سے انکار دلائل ذیل کی بنا پر کیا گیا ہے۔

(۱) سکندر مقدونی کی تاریخ کا یہ مسلہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا۔

(۲) سکندر باتفاق اصحابِ تاریخ جابر و قاہر تھا نہ کہ نیک سیرت و نیک نفس۔

(۳) یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے کہ اس کی فتوحات اور سیاحت کا سلسلہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا۔ (رملاحظہ ہو ...)

لقب دیدیا ہے اسی طرح یمن کے بعض تبابعہ کو بھی اہلِ عرب وسعتِ حکومت کی بنیاد پر ذوالقرنین کہتے آئے ہیں مثلاً ابوکرب تبع نے اپنے دادا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۷ ۔

"عرض کرنے دیجیے کہ یہ تینوں دعوے مسلمات نہیں، بجائے خود مخدوش و مجروح ہیں"۔

"اس کے بعد صاحب موصوف نے ان تینوں دلائل یا دعاوی کو "مخدوش" اور مجروح ثابت کرنے کے لئے بالترتیب دلائل پیش فرمائے ہیں چنانچہ مضمون نگار کی پہلی دلیل کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

(۱) نزولِ قرآن سے قبل والا ذوالقرنین ظاہر ہے کہ اصطلاحی معنی میں تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے مومن ہونے سے مراد صرف یہی ہو سکتی ہے کہ موحد (مسلم) اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا۔

(برہان ماہ اگست)

مسلم: مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ "صاحب استدراک" کا سکندر کے مسلمان ہونے کی بحث میں یہ فرمانا "کہ اصطلاحی معنی میں تو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا" کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ اصطلاحی معنی میں صرف وہی شخص "مسلمان" کہلایا جا سکتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہو اور دوسرے کسی نبی کی امت کو "مسلم" نہیں کہہ سکتے تو ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح "قرآن کی اصطلاح" نہیں ہے کیونکہ وہ صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ آدمؑ سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک خدا کے ہر نبی و رسول کا دین "اسلام" ہے اور اس کی امت اجابت "امتِ مسلمہ" ہے اور اس کا سچا مطیع "مسلمان" ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ (بقرہ)	کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آپہنچا؟ اس نے اپنی اولاد سے کہا میرے بعد تم کس کی پرستش کروگے؟ انہوں نے جواب دیا، ہم تیرے اور تیرے باپ ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کے ایک خدا کی پرستش کریں گے اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر اس کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

والاسلام ھو ملۃ الانبیاء قاطبۃ وان تنوعت شرائعھم واختلفت مناھجھم۔ (تفسیر ج ۱ ص ۳۲۳)	اور "اسلام" ہی تمام انبیا علیہم السلام کی ملت ہے بلا تخصیص، اگرچہ ان کی شریعتیں اور ان کے طریقے مختلف ہیں۔

اور اگر "صاحب استدراک" کی مراد اصطلاحی معنی سے یہ ہے کہ سکندر اگرچہ موحد اور مسلم تو تھا مگر چونکہ

قد كان ذو القرنين جدّى مسلمًا   ملكًا تدين لها الملوك وتسجد

میرا دادا ذوالقرنین مسلمان تھا اور ایسا پرشوکت بادشاہ تھا کہ بہت سے بادشاہ اس کے تابع فرمان اور اس کے سامنے سربسجود

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۸۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بہت پہلے تھا اس لئے عرف عام میں وہ مسلمان نہیں ہو سکتا تو گستاخی معاف پھر اس کیلئے "اصطلاحی معنی" کی تعبیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس ارشاد کی یہاں کوئی ضرورت تھی جبکہ متکلم اور مخاطب دونوں پر عیاں ہے کہ یہ اس سکندر کا ذکر ہے جو تقریباً تین سو سال قبل مسیح تھا۔

آگے چل کر صاحب "استدراک" ارشاد فرماتے ہیں۔

"روایات یہود میں سکندر کو اسی حیثیت سے (یعنی موحد اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا) پیش کیا گیا ہے چنانچہ جوزیفس (یہ حواریان مسیح کا ہمعصر ہے) کی قدیم "تاریخ یہود" میں بصراحت موجود ہے کہ سکندر نے ہیکل یروشلم میں آکر وہاں عبادت کی۔ وہاں کے پیشواؤں کی تعظیم و تکریم کی۔ اور جب دانیال کی یہ پیشینگوئی اسے دکھائی گئی کہ ایک رومی فاتح ایران کی شہنشاہیت کو برباد کردیگا تو وہ اس پیشینگوئی کا مصداق اپنے ہی کو سمجھا۔" جیوش انسائیکلوپیڈیا میں تصریح لکھی چلی آتی ہے کہ اس وقت کے یہود اسے مسیح موعود ماننے کو تیار تھے۔ (جلد ۸ ص ۵۰۷)

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی مشرک کے ساتھ روا نہیں رکھا جا سکتا تھا اور نہ کوئی مشرک فرمانروا خود یہ معاملہ مرکز توحید کے ساتھ روا رکھتا۔ (برہان ماہ اگست)

"موحد اور مسلم" کی غلط تشریح کے علاوہ صاحب استدراک نے سکندر کو اس کا مصداق ثابت کرنے میں جو سند اور دلیل پیش کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ "صاحب استدراک" کے اس ارشاد میں ایک دعویٰ ہے اور دوسری اس کی دلیل، دعویٰ یہ ہے کہ "روایات یہود میں" سکندر کو موحد اور اسرائیلی نبی کے مطیع کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ قدیم تاریخ یہود کے مصنف جوزیفس (جو کہ حواریانِ مسیح کا ہمعصر ہے) نے سکندر کے متعلق وہ سب کچھ لکھا ہے جو صاحب استدراک کی عبارت سے ابھی نقل ہو چکا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکندر کے مسلمان (موحد) ہونے کا زبردست شاہد جوزیفس ہے مگر جوزیفس کا یہ حال ہے کہ وہ خود یہود کے نزدیک قابل تسلیم نہیں۔

جوزیفس؛ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جوزیفس یہود کے نزدیک "غیر معتبر اور ناقابلِ احتجاج و اعتماد" ہے اور اس کی کتاب "قدیم تاریخ یہود" ان میں غیر مقبول ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جوزیفس میں دو خرابیاں ہیں جو کسی طرح یہود کی روایات کی صحت باقی نہیں رہنے دیتیں۔ ایک یہ کہ وہ "مورخ" نہیں ہے بلکہ داستان سرا اور قصہ گو ہے اور

اور عرب کے مشہور شعرا امرء القیس اوس بن حجر اور طرفہ بن عبد وغیرہ کے کلام میں بھی حمیری بادشاہوں کو ذوالقرنین کہا گیا ہے۔ سلہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس درجہ جو شیلا ہے کہ واقعات کو جلد گڑھ کر بیان کر دینے اور اصل واقعہ میں اپنی جانب سے من گھڑت اضافے کرنے کا عادی ہے۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے درمیان جو نفرت قائم تھی اس کو کسی طرح مٹائے اور دونوں قوموں کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا کرے اس لئے وہ یونانی و رومی روایات میں خصوصیت کے ساتھ ایسی داستانیں اختراع اور ایجاد کرتا رہتا اور ان کو تاریخی حیثیت میں پیش کیا کرتا تھا جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرے اس لئے یونانیوں سے متعلق جس قدر روایات وہ بیان کرتا ہے خصوصیت کے ساتھ وہ قطعاً ناقابلِ اعتماد ہیں اور کسی طرح لائقِ احتجاج نہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ہے۔

یہ بات یقینی ہے کہ جوزیفس نہ تو اعلیٰ درجہ کا مورخ ہے اور نہ ایک ایماندار و بے تعصب محقق جسے صرف حقیقت کی تلاش ہو بلکہ وہ ایسا مصنف ہے جس کی غرض و غایت صرف ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہے (ج ۷، ص ۵۷۴)

جوزیفس کا مقصد اور منتہائے نظر کیا ہے؟ آگے چلکر اسی کتاب میں اس کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

"اس کی منتہائے تمنا یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جو تعصب پھیلا ہوا ہے اسے دور کرے اور ان پر جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں ان سے ان کو بری ثابت کرے اور یہودیوں اور یونانیوں کے درمیان پیدا شدہ دشمنی کو مٹا دے۔ (ج ۷، ص ۵۷۴)

جوزیفس کا یہ مقصد برا نہیں تھا اگر تاریخی حقایق پر مبنی ہوتا اور صحیح واقعات کی روشنی میں اس کو کامیاب بناتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس یہ کیا۔

اس کا یہ حمایتی مقصد اس امر سے بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ماخذوں کا انتخاب کرتا ہے اور ایسے ٹکڑوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں یہودیوں کے ساتھ قدیم بادشاہوں اور رومیوں کے الطاف و اکرام کا تذکرہ ہے وہ صداقت کو اپنے میلان اور رجحان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا تا ہے اگرچہ وہ اس بات کا مدعی ہے کہ حقیقت اور مکمل حقیقت کے سوا کچھ نہیں لکھے گا لیکن وہ ایفاء عہد نہ کر سکا اس لئے کہ (وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرنے کے لئے) کہیں تو بعض چیزوں کو قصداً قلم انداز کر جاتا ہے اور کہیں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے اور جگہ جگہ نہایت بے پروائی اور بے ضابطگی کے ساتھ

سلہ فتح الباری ج ۶

اسی طرح ایرانی بادشاہوں میں سے اہل عرب کیقباد اور فریدوں کو بھی ان کی قاہرانہ فتوحات کی وجہ سے ذوالقرنین کہتے تھے۔[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۰۔

ماخذوں کے حوالے دیتا ہے۔ ۔ (ج ۷، ص ۵۷۷)

جوزیفس کی تاریخی بددیانتی کا معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ مقصد کی تکمیل کے لئے اپنی مقدس کتاب بائبل کے واقعات کو بھی توڑ مروڑ کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

اور یہی وجہ ہے کہ بائبل کے واقعات بھی کبھی کبھی اس کے قلم سے بالکل نئے معنی اور نئے پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا ریلیجین ج ۷، ص ۵۷۷)

جوزیفس کی اس غیر مورخانہ روش اور بددیانتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی تاریخی تصانیف کو خود اپنی قوم "یہود" میں بھی مقبول نہ کر سکا اور ان میں بھی اپنا اعتماد کھو بیٹھا۔

اس کی تاریخی تصانیف اس کی قوم میں سب سے کم مقبول ہوئیں، اس کی قوم اس کو بیوفا اور غدار سمجھتی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا ریلیجین ج ۷، ص ۵۷۷)

یروشلم اور سکندر | اور یہ واضح رہے کہ "جیوش انسائیکلوپیڈیا" کا مضمون بھی اسی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ جوزیفس کے متعلق یہ حوالجات تو اس کی عام مورخانہ حیثیت اور اس کی تاریخی کتابوں کی قدر و قیمت سے متعلق تھے اب ریلیجین انسائیکلوپیڈیا کی زبانی ان واقعاتِ خصوصی کی حقیقت کو بھی سن لیجئے جن کو صاحب باستدراک نے سکندر کے موحد اور (مسلمان) ہونے کی دلیل میں ذکر فرمایا ہے۔ یعنی اس کا یروشلم میں جانا، جا کر عبادت کرنا اور یہودی پیشواؤں کی تعظیم کرنا وغیرہ)۔

ایستر (Esther) کی کتاب اور عہد ارتاسرزز (Artaxerxes) کے تذکرہ کے بعد جوزیفس جب قصص تورات کے آخری حصہ پر پہنچتا ہے تو اسی جگہ سے اس کی کتاب اینٹی کوئیٹیس جوڈیکیو (Antiquitates Judaciae) کے دوسرے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس باب کے شروع ہی میں تاریخی روایات کا تسلسل جاتا رہتا اور ان میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو "مکابیسن بغاوت" (Maccabaeon Revolt) کے دور تک برابر قائم رہتا ہے اور تین صدی تک چلا جاتا ہے اور اسی کے اندر سکندر مقدونی، ٹولمی اور سلیوسیانڈ (Seleucidae) وغیرہ کے عہدِ حکومت بھی آجاتے ہیں ان دورہائے حکومت کے متعلق جوزیفس صرف بے ربط قصے بیان کرتا ہے جو سکندر کے آخری دور کے ماخذ سے لئے گئے ہیں۔ اس غیر مسلسل اور بے ربط سلسلہ کی سب سے پہلی چیز اسکندر کا یروشلم

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲۔

مگر یہ سب مسطورہ بالا وجہ کی بنیاد پر ہی ذوالقرنین کہلاتے رہے ہیں اور قرآن میں مذکور ذوالقرنین ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت استاذ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱۔

جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام واقعات بھی ہیں جو اس کے وہاں جانے سے پہلے اور جانے کے بعد سے وابستہ ہیں کیونکہ یہ واقعہ جوزیفس نے ایک ایسے ماخذ سے لیا ہے جو غیر معتبر اور غیر موثق ہے اور دانیال نبی کی کتاب کے بعد کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ج ۷، ص ۵)

یہ حقیقت ہے اس حوالہ کی جو جوش انسائیکلوپیڈیا سے نقل کر کے "صاحب استدراک" نے ایسے اہم تاریخی مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہاں یہ من گھڑت اور بے دلیل قصہ جس کا ماخذ تک غیر معتبر اور غیر مستند ہے اور کہاں سائرس کے یروشلم بنانے اور خدا کے مسیح ہونے کے وہ ناقابل تردید تاریخی واقعات جو کتاب مقدس اور صحیح تاریخی حوالوں سے ثابت ہیں۔

بہر حال جوزیفس اس کی کتب تاریخ اور اس کے تاریخی ماخذوں کے متعلق مسطورہ بالا محققانہ حوالجات کے بعد آپ خود کتاب مقدس کی طرف رجوع کیجئے اور معلوم کیجئے کہ داستان سرا اور قصہ گو جوزیفس کی یروشلم والی داستان اور یہود کا سکندر کو مسیح موعود مان لینے کا قصہ یہ دونوں کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

خدا کا مسیح: ابھی بابل کے بادشاہ بخت نصر (نبوکدرزار) نے بیت المقدس پر چڑھائی نہیں کی تھی کہ حضرت یسعیاہ نبی (علیہ السلام) نے وحی الٰہی سے خبر پا کر یہود کو مطلع کیا کہ وقت آنے والا ہے کہ بابل کی حکومت کے ہاتھوں یروشلم کا ہیکل برباد ہوگا اور اس کی توہین کی جائے گی اور اس کے بعد یہ بشارت سنائی کہ وہ پھر خورس (سائرس) کے ہاتھوں بنایا جائے گا اور اس کی عزت و حرمت برقرار کی جائے گی اور یہود بابل کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے چنانچہ پیش گوئی کے الفاظ یہ ہیں۔

"خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے۔ .... یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائیگی (یسعیاہ باب ۴۴ آیات ۲۸-۲۴)

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں۔ .... اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند

سے اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ذوالقرنین کے معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے
کہ نہ تو وہ اہل مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال فغفور چین کی جانب ہے اس لئے کہ اگر وہ مشرقی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۲۔

اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لیکے بلایا ہے۔ (باب ۴۴-آیت ۳۱)

حضرت یسعیاہ نبی کی یہ پیشنگوئی خورس (سائرس) کے فتح بابل سے ایکسو ساٹھ برس پہلے یہود کو سنائی گئی اور فتح بابل کے صرف ساٹھ برس پہلے اسی کی تائید میں حضرت یرمیاہ نبی نے یہود کو یہ پیشگوئی سنائی تھی۔

"وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو، منادی کرو، مت چھپاؤ، لکھو کہ بابل لے لیا گیا بعل رسوا ہوا، مردوک سراسیمہ کیا گیا ہے اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیونکہ اُتر سے ایک قوم اس پر چڑھ آتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کریگی" (یرمیاہ باب ۵۰ آیت ۱-۲)

اور عزرا نبی کی کتاب میں بصراحت موجود ہے کہ خورس (سائرس) نے یروشلم کی ہیکل کو تعمیر کیا اور اس نے اس کی تعمیر اور عزت و حرمت کا اپنی قوم میں اعلان کرایا اور اس طرح یرمیاہ نبی کی بشارت پوری ہوئی۔

"اور شاہِ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہوا۔ خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہِ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لئے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے کون کون ہے؟ اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے" (عزرا باب آیت ۱-۳)۔

یسعیاہ نبی اور یرمیاہ نبی کی پیشگویوں سے اور عزرا نبی کی کتاب میں اس بیان کردہ منادی سے جو خورس (سائرس) کی جانب سے کی گئی" تین باتیں صاف اور صریح طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱) توراۃ کی پیشگوئیاں خورس کو خدا کا چرواہا اور خدا کا مسیح بتا رہی ہیں نہ کہ سکندر کو۔

(۲) یروشلم (بیت المقدس) کے ہیکل کی تعمیر اس کی عزت و حرمت کا اعلان، اس کے خدا کے گھر ہونے کا اقرار اور یہود کی آزادی، خورس (سائرس) کے ہاتھوں ہوئی نہ کہ سکندر کے۔

(۳) یرمیاہ نبی کی پیشگوئی میں اگرچہ نام نہیں ہے لیکن یہ تصریح ہے کہ بابل کا تباہ کرنے والا اور یروشلم کو آباد کرنے والا اتر (شمال) سے اٹھیگا۔ سو یہ فارس و میڈیا کا بادشاہ خورس ہی ہو سکتا ہے نہ کہ سکندر جو یونان سے

ہوتا تو قرآن عزیز اس کے سفر مغرب کے بعد یہ کہتا کہ وہ پھر مشرق کو لوٹ گیا یعنی اپنے وطن کی جانب واپس ہو گیا یہ نہ کہتا "واذا بلغ مطلع الشمس" اور نہ وہ اہل مغرب میں سے تھا بلکہ مشرق و مغرب کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳:۔

(بابل کی جانب مغرب سے) اشعا اور عزرا نبی کی تصدیق بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

(۴) یہ تمام پیشنگوئیاں متفق ہیں کہ خورس کی فتوحات جابرانہ و قاہرانہ انداز کی نہیں تھیں بلکہ ایک صالح اور باخدا انسان کی حیثیت سے تھیں اور کتابِ مقدس کے ان صاف اور صریح بیانات کے علاوہ تاریخی حقائق بھی ان نتائج کی زبردست تائید کرتے ہیں چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سائرس کے متعلق یہ تصریحات موجود ہیں۔

"بابل پر جب سائرس حملہ آور ہوا تو وہاں کے یہودیوں نے ایرانیوں کو نجات دہندگان اور موحدین کہکر پکارا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہود کی مدد کے صلہ میں سائرس نے یہودیوں کو یروشلم اور ان کا معبد (ہیکل) واپس کر دیا اور انھیں فلسطین لوٹنے کی اجازت دیدی۔ (ج ۶ ص ۷۵۲ ایڈیشن ۹)

اب کتاب مقدس اور اس کے ان روشن تاریخی حوالوں پر نظر کیجئے اور پھر جوزیفس کی اس بددیانتی کی داد دیجئے کہ اس نے یروشلم کی تعمیر، علماء یہود کی تعظیم و تکریم اور خدا کے مسیح کے ہاتھوں یہود کی بابل سے نجات کے تمام ان معاملات کو جو کتابِ مقدس نے خورس (سائرس) کے لئے مخصوص کئے تھے کس جرأت کے ساتھ سکندر مقدونی پر اس غرض سے چسپاں کر دیئے کہ کسی طرح اس کا یہ مقصد کہ یہودیوں اور یونانیوں اور رومیوں کے درمیان منافرت کی خلیج کو پاٹ دیا جائے پورا ہو جائے مگر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اور یہودیوں نے ان تحریفات کی بناء پر (جیسا کہ ابھی حوالہ گذر چکا ہے) اس کو خائن اور غدار کہکر اس کی تاریخی کتابوں کو بھی غیر مقبول قرار دیدیا۔ اور اگر ہم بالفرض سکندر کے معاملہ زیر بحث میں جوزیفس کی روایت کو صحیح بھی مان لیں تو اس کی حقیقت زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتی ہے (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے) کہ سکندر کی یہ عادت تھی کہ جس ملک کو فتح کرتا وہاں کی پبلک کو اپنا بنانے کے لئے ملکی رسم و رواج کے مطابق عبادت کر کے یہ ثابت کرتا کہ مجھ کو بھی ان عقائد و عبادات سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ اس ملک کے رہنے والوں کو۔ پھر کیا عجب ہے کہ یہودیوں کو متاثر کرنے کی خاطر اس نے یروشلم میں بھی یہ ڈھونگ رچایا یا سائرس کی نقل اتار کر یہودیوں میں ذوالقرنین بننے کی کوشش کی ہو اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

چنانچہ بستانی کی انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ سکندر جب مصر پہنچا تو لیبیا کے کاہنوں اور باشندوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے معبود (مشتری) کی پرستش کی۔ (ملاحظہ ہو ج ۲ ص ۵۴۶)

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے

بابل میں سکندر نے وہاں کے مقامی دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی جیسا کہ اس نے دوسرے مقامات پر

درمیانی علاقہ کا باشندہ تھا۔

والراجح انہ لیس من اذواء الیمن و	اور راجح یہ ہے کہ ذوالقرنین مذکور فی القرآن
لاکیقباد بن ملوک العجم ولا ھو اسکندر	نہ یمن کے بادشاہوں میں سے تھا اور نہ شاہان
بن فیلفوس بل ملک اخر من الصالحین	عجم میں سے کیقباد ذوالقرنین تھا اور نہ سکندر بن
ینتھی نسبہ الی العرب السامیین الاولین	فیلفوس (مقدونی) ہی ذوالقرنین تھا بلکہ وہ ان سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے تھا جن کا نسب
ذکرہ صاحب ناسخ التواریخ الخ	قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے ناسخ التواریخ نے ایسا ہی کہا ہے۔

حاشیہ صفحہ ہذا سلہ عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۱۹۵۔
آیت من آیات اللہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہ) نے ذوالقرنین کے مسئلہ کو ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر ان کا مطمع نظر ذوالقرنین کی شخصیت کی تحقیق نہیں ہے بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی ان ہفوات کی تردید مقصود ہے جو یاجوج و ماجوج، سد، دجال کے خروج اور مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے نزول سے تعلق ہیں اور جن پر قادیانی نے اپنی نبوت اور یسوع مسیح ہونے کے دعوی کی بنیاد قائم کی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یورپ کی موجودہ متمدن اقوام ہی وہ یاجوج و ماجوج ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور یہ کہ دجال ان کے پادری ہیں اور میں ہی وہ یسوع مسیح ہوں احادیث میں جس کے نزول کی خبر دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قرب قیامت میں آکر ان سب کا استیصال کرے گا۔

حالانکہ قادیانی مشن کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے اقوام یورپ کے الحاد و زندقہ، فساد فی الارض، اور دجل و مکر کی زبردست وبا کو روکنے یا ختم کر دینے کی بجائے ممالک اسلامیہ کو یورپ کی بعض حکومتوں کے استعماری عزائم کے حوالہ کرنے اور غلام بنانے، جہاد جیسے فریضہ اسلامی منسوخی کا اعلان کر کے اپنے مزعومہ یاجوج و ماجوج کو خوش کرنے اور اپنے منکرین پر کفر کا عام فتوی دیکر کروڑوں پرستاران توحید کو کافر اور خارج از اسلام قرار دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا اور نام نہاد تبلیغ اسلام کے پردہ میں بھی اپنے مشن کی کامیابی کے علاوہ اسلام کی کوئی کوئی خدمت انجام نہیں دی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴۔ بھی اسی طرح کیا تھا (یعنی مقامی دیوتاؤں کی پرستش کی نفی اور یہ تمام ملکوں کے مذاہب کی آمیزش آگے چل کر یونانی الحاد و بیدینی پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی (ج ۱۵ ص ۱۴۱۔ ایڈیشن ۹)
ہاں یہ صحیح ہے کہ کتاب مقدس کی مسطورہ بالا پیشگوئیوں کی صحت پر بعض عیسائی مورخوں نے شبہ ظاہر کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ پیشگوئیاں جن میں سورس کا نام تک مذکور ہے واقعات کے وجود پذیر ہونے کے بعد

اور سید محمد آلوسیؒ نے بھی اذواء یمن میں سے کسی ذو کو ذوالقرنین تسلیم نہیں کیا اور اس قول کو غلط قرار دیا ہے۔ ؎

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵۔
بنالی گئی ہوں۔ لیکن اول تو اپنے اس دعوے یا شبہ پر انھوں نے قیاس و تخمین کے سوائے کوئی دلیل نہیں دی، دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بابل کی غلامی کے دور اور بخت نصر کے توراۃ جلا ڈالنے کے واقعۂ ہائلہ کے بعد کے اس قسم کے تمام ذخیرے کے متعلق علماء یہود و نصاریٰ کا اس پر کلی اتفاق ہے کہ یہ اضافات و تحریفات سے محفوظ ہیں اور ان میں ردوبدل کے لئے کوئی سبب وجود پذیر نہیں ہوا، یعنی توراۃ کے قدیم حصہ کی طرح اس پر کوئی حادثہ نہیں گذرا اگر علماء یہود و نصاریٰ کے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ان پیشگوئیوں میں خورس کے نام کی تصریح بعد کو داخل کردی گئی یا ان پیشگوئیوں کو واقعات کے مطابق بنالیا گیا تب بھی ہمارا مطلب حاصل ہے اس لئے کہ ان پیشگوئیوں سے یہ بات تو بغیر کسی خدشہ کے ثابت ہوگئی کہ یہودیوں میں "خورس کے یروشلم تعمیر کرنے، یہود کو آزاد کرانے، اور مذہب یہود کی عظمت کرنے اور یہود کا اس کو خدا کا مسیح سمجھنے کی روایات کو اس درجہ تواتر حاصل تھا کہ شبہ کرنے والوں کے بقول "یہودیوں نے سائرس کے ساتھ خوش اعتقادی کی وجہ سے ان ثابت شدہ حقائق کو کتاب مقدس میں وحیِ الٰہی کی بشارات بنا ڈالا" لیکن اس کے برعکس سکندر مقدونی کو کسی طرح یہ حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔

بہرحال کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یروشلم سے متعلق جن واقعات کو صدیوں تک کتاب مقدس اور یہودیوں کی متواتر روایات میں خورس (سائرس) سے وابستہ ظاہر کیا گیا وہ چار سو برس کے بعد یک بیک جوزیفس کی زبانی سکندر کے حق میں ہو جاتی ہیں "انّ ھذا الشئ عجاب"

سکندر مشرک تھا سکندر کے مذہب کا ذکر اگرچہ پہلے گذر چکا ہے مگر آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وہ صرف دیوتاؤں کی پوجا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اس درجہ مغرور و متکبر تھا کہ یونان اور ایرانیان کے لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا اور اپنے تئیں معبود کہلاتا تھا۔ (دائرۃ المعارف للبستانی ج ۲ ص ۵۴۷)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

جب سکندر باختر (Bactra.) لوٹ آیا اور داؤکزایارٹس کی بیٹی روکزانا (Roxana.) سے شادی کی، تو شادی کی دعوت کے موقعہ کو غنیمت جان کر اس نے اپنے یونانی اور مقدونی پیرووں سے اپنی خدائی کا اعتراف کرانا چاہا مز (ج ص ۴۸۴)

اور مشہور محدث حافظ عمادالدین ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں بروایت قتادہؒ سکندر

ان تفصیلات کے بعد اب بسہولت یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں مذکور ذو القرنین کے متعلق یہ سب اقوال نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں اور صرف دو . . . . قول ہی قابل توجہ ہیں جن میں سے ایک قول سلف کی جانب منسوب ہے اور دوسرا متاخرین میں سے ایک معاصر محقق کی تحقیق ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶ :-

ذو القرنین اور سکندر بن فیلقوس میں فرق کرتے ہوئے سکندر مقدونی کو مشرک کہا ہے (ج ۲ ص ۱۰۶)

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے بھی امام رازیؒ کے قول کو بطور سند پیش کرتے ہوئے سکندر مقدونی اور اس کے دربار ارسطاطالیس دونوں کو کافر کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۲۹۴)

اور اسلام کے ان جلیل القدر ائمہ دین کی مزید تائید انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے بھی ہوتی ہے چنانچہ مقالہ نگار لکھتا ہے

"جب سکندر دریائے ستلج کے کنارہ پہنچا تو اس نے اپنی فوج کو دریا کے عبور کرنے کا حکم دیا لیکن فوج نے عبور کرنے سے انکار کر دیا اس پر سکندر نے اپنے افسروں کے سامنے مزید فتوحات کی اسکیم پیش کی لیکن یہ بے سود ثابت ہوئی تب سکندر نے حسب دستور دریا کے سامنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائی اور (اپنے عقیدہ کے مطابق) دیوتاؤں کی اجازت نہ سمجھتے ہوئے پیشقدمی سے باز آیا اور واپس لوٹ گیا (ج ۱ ص ۴۸۴)

اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن میں ہے کہ جوزیفس کی زبانی اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید سکندر یروشلم گیا تھا اور اس نے یہود کے ساتھ خصوصی مراعات بھی کیں اور محکمہ نہر رسانی میں ممتاز درجے بھی دیئے اور اس طرح یونانیوں اور یہودیوں میں ایک علاقہ قائم ہو گیا۔ تاہم یہ محقق ہے کہ یہودیوں نے ان کلچر اور ان کے عقائد و رسوم کو اپنے اندر داخل نہ ہونے دیا اور وہ ہمیشہ ان کو اس حیثیت سے نفرت و حقارت ہی سے دیکھتے رہے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہودی قوم سختی کے ساتھ توحید کی قائل تھی اور اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ" اور یہی وجہ ہے کہ یونانیت اور یہودیت میں کبھی اتصال نہ ہو سکا۔ (ج ۱ ص ۲۰۹)

اور بستانی لکھتا ہے کہ سکندر مقدونی نے وفات کے وقت جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ اس کو بتوں کے درمیان دفن کیا جائے۔

ثم لما رأى ان لا رجاء له بالشفاء وان ساعته دنت نزع خاتمه من اصبعه وسلمه الى الامير بردیکاس واوصاه ان ینقل جثته الى هيكل المشترى لواحات سیوة لیدفن هناك بين الاصنام (ج ۳ ص ۵۴۸)	پھر جب سکندر نے دیکھا کہ اب زیست کی کوئی امید باقی نہیں رہی اور اس کی موت کا وقت قریب آ لگا تو اس نے اپنی انگلی سے شاہی مہر نکال کر امیر بردیکاس کو دی اور اس کو وصیت کی کہ مجھکو سیوہ کے اطراف میں مشتری دیوتا کے ہیکل میں بتوں کے درمیان دفن کیا جائے۔

علمارِ سلف کی رائے | علمارِ سلف کی رائے یہ ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین عربی الاصل تھا، سامیۂ اولیٰ میں سے تھا اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا معاصر بادشاہ تھا اور حج کے سفر میں دونوں کا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۷۔

اب ان تمام حقائق کو پیشِ نظر رکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ "مضمون نگار" کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "سکندر مقدونی کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا" یا محترم صاحب "استدراک" کا یہ ارشاد کہ "یہ دعویٰ (کہ سکندر مشرک تھا) بجائے خود مخدوش و مجروح ہے"۔

اور یہ بھی انصاف طلب بات ہے کہ "صاحب استدراک" کے اس حوالہ کی "جو کہ جوزیفس کی قدیم تاریخ یہود سے دیا گیا ہے" محققین مورخین بلکہ کتابِ مقدس کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت ہے؟ کہاں مدلل واقعات و حقائق اور کہاں محض ظن و تخمین ۔۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

سکندر کا ظلم و جبر | محترم صاحبِ استدراک "مضمون نگار" کے دوسرے دعویٰ کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

"سکندر کا جابر و قاہر ہونا مسلم نہیں بہت کچھ مختلف فیہ ہے۔ تاریخ میں دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں کم از کم شک کا فائدہ تو اسے ملنا ہی ہے" (برہان ماہ اگست ۱۹۴۱ء)

اس سلسلہ میں عرض کرنے دیجئے کہ قدیم و جدید مسلم اور عیسائی مورخین نے سکندر کی جو سیرت پیش کی ہے بحیثیت مجموعی ان سب کا حاصل یہ ہے کہ وہ جابر و قاہر تھا اور اس کو نیک سیرت اور صالح بادشاہ نہیں کہا جا سکتا لہٰذا کم از کم ایک قول تو ایسا تحریر کیا جاتا جس میں اس کو نیک، عادل اور صالح تسلیم کیا گیا ہو۔

رہی یہ بات کہ اس کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی عدل یا رحم کا موجود نہیں ہے تو اس کا انکار تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر ان چند گنتی کے واقعات سے کسی کی سیرت، عادل رحیم اور صالح نہیں کہی جا سکتی ورنہ تو پھر چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور حجاج بن یوسف کو بھی یہی مقام دیا جانا چاہیے۔ سکندر کی جابرانہ حیثیت کا اندازہ ان چند حوالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

"درحقیقت اس کے دماغ کا توازن شروع ہی سے بگڑ گیا تھا یہ ظالم اور جابر انسان جو اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا جو اپنے دوست کے سینہ میں برچھی گھونپ کر مسرور ہوتا تھا جو ایک دوسرے دوست کو سخت ترین جسمانی ایذا پہنچا کر اس کی چیخ پر حقارت آمیز انداز میں متبسم ہوتا تھا وہ ایک عادل دماغ فرمانروا اور مدبر ہونے سے بہت دور تھا (جز ۱ صفحہ ۵۸۹) ہر شخص اس سے حد درجہ خوشامدانہ انداز میں بات کرنے پر مجبور تھا" پلوٹارک (Plutarch) لکھتا ہے کہ اس کو اپنی پرانی عادت یعنی انسانوں کا شکار کرنے میں بڑی تسلی و تشفی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔

(ج ۱)

ساتھ رہا ہے اور ایک معاملہ میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اس کی عدالت میں مرافعہ کیا تھا اور اس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا اور خضر (علیہ السلام) اس کے وزیر یا تدبیر تھے۔ لیکن علماء سلف کی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸

"آخر کار وہ پسر گیڈا (Pasargadae) پہنچا اور سائرس کی قبر کا پتہ لگا کر اسے کھدوایا اور لوٹا اور اس کی توہین کی (ج ا ص ۴۸۴)

"قابض ہوجانے کے بعد پسر گیڈا میں اس کو بے شمار دولت مال و اسباب ہاتھ آیا جس کی قیمت کا اندازہ ایک کرور تیس لاکھ پونڈ کے قریب کیا جاتا ہے اس دولت کو لوٹنے کے بعد اس نے شہر کے تمام مردوں اور اولادِ ذکور کو تہ تیغ کردیا اور عورتوں اور اولادِ اناث کو باندیاں بنالیا۔ (ج ا ص ۴۸۳)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے علاوہ بستانی اور وہ تمام مسلمان مؤرخین جو اس کو زبردستی "ذوالقرنین" بنانے پر آمادہ نہیں ہیں، سکندر سے متعلق اسی قسم کی روایات جبر و قہر بیان کر رہے ہیں۔ پس ضرورت تھی کہ ان روایات کے مقابلہ میں کسی محقق مورخ کی ایک روایت ایسی بھی سامنے آجاتی جو تخمین و قیاس سے جدا تاریخی روشنی میں اس کو نیک صالح اور عادل بادشاہ ثابت کرسکتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور تمام ذخیرۂ تاریخ اس سے یکسر خالی ہے۔

رہا "شبہ کا فائدہ" تو اول تاریخی حقائق کے بعد شبہ کے فائدہ کا سوال ہی کیا ہے اور اگر تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کو زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے کہ سکندر کو جابر و قاہر کہنے میں سکوت اختیار کیا جائے نہ کہ یہ فائدہ کہ ایسی ہستی کو جس کا نیک، صالح اور عادل ہونا تک مشتبہ ہو، قرآنِ عزیز کا ذوالقرنین بنا دیا جائے کہ جس کی منقبت میں قرآنِ عزیز رطب اللسان ہے۔ اس کو تو بلاشبہ تاریخی صحائف میں روزِ روشن کی طرح صالح و عادل ثابت ہونا چاہیے۔

سکندر کا مغرب کی طرف اقدام

تیسری بات "مضمون نگار" نے یہ کہی تھی کہ سکندر کی تاریخی مہمات کے متعلق یہ مسلمات میں سے ہے کہ وہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا۔ چنانچہ "صاحبِ استدراک" اس کو بھی مخدوش و مجروح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

سکندر کی ابتدائی فتوحات تاریخ کو مسلم ہے کہ شمال و مغرب ہی کی جانب حاصل ہوئی تھیں۔" (برہان ماہ اگست ۱۹۴۱ء)

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ سکندر کی شمالی جانب میں فتوحات کا انکار تو "مضمون نگار" نے بھی نہیں کیا، البتہ مغربی جانب میں سلسلۂ فتوحات و سیاحت کے بڑھنے کا ضرور انکار کیا ہے۔ "صاحبِ استدراک" اس کی تردید میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"اور مقدونیہ کے کنارے مغرب ہی میں وہ جھیل ہے جس کا پانی اتنا گندہ ہے کہ سیاہی مائل ہوگیا ہے

اس تحقیق میں کئی قسم کی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں جو اس تحقیق کو ایک متردد اور مضطرب رائے میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ مثلاً قرآن نے ذوالقرنین کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بیان کیا ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹۔

اور وہی سورج ڈوبتا نظر آتا ہے "وجدھا تغرب فی عین حمئۃ" کا پورا مصداق ہے۔ (برہان اگست ۱۹۴۸ء)

مگر یہ دلیل "کوہ کندن و کاہ برآوردن" سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ اس لئے کہ "مضمون نگار" کا یہ مقصد تو ہرگز نہ تھا کہ سکندر جس نے شمال اور مشرق میں ہزارہا میل تک زبردست فتوحات حاصل کیں اور ملکوں اور شہروں کو مسخر کیا وہ مغرب کی جانب اپنے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ تک بھی نہیں گیا۔

پس اس جھیل تک سکندر کا پہنچنا جو مقدونیہ کے کنارہ ہی پر ہے ایسی کونسی عظیم الشان مہم تھی جس کا ذکر قرآنِ عزیز نے اس اہمیت کے ساتھ کیا ہے اور جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مغربی مہم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ذوالقرنین کے مرکزی دارالسلطنت سے سینکڑوں یا ہزاروں میل دور اس حد تک پہنچ گئی تھی جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پانی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مقدونیہ کے کنارہ کی جھیل اوکریڈا جس جگہ واقع ہے وہاں تو صبح و شام خدا کی ہزاروں مخلوق کا شب و روز ہی گذر ہوتا رہتا تھا اور وہ مغرب کے کسی آخری حصہ میں بھی واقع نہیں ہے بلکہ اطراف و جوانب کے شہروں اور ملکوں کے درمیان واقع ہے تو یہ کونسی ایسی جگہ تھی جس کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے "حتی اذا بلغ مغرب الشمس وجدھا تغرب فی عین حمئۃ" پس محض جھیل کے پانی کے گندہ اور سیاہی مائل ہونے کی وجہ سے یہ جھیل کسی طرح بھی قرآنِ عزیز کی اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتی۔

چنانچہ مفسرینِ قرآن بالاتفاق اس آیت کی تفسیر وہی کرتے ہیں جو ہم نے بیان کی ہے یعنی ذوالقرنین مغرب کی جانب دور تک بڑھتا ہوا ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے البتہ سمندر کا وہ حصہ ایسا تھا جہاں پانی گدلا اور سیاہ ہو گیا تھا اور سورج غروب ہوتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سیاہ گدلے چشمہ پانی میں ڈوب رہا ہے۔

چنانچہ سید محمود آلوسیؒ "بلغ مغرب الشمس" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ای منتھی الارض من جھۃ المغرب (ج ۱۶) یعنی مغرب کی جانب میں زمین کے آخری حصہ تک جب پہنچا۔

اور محدث ابن کثیرؒ، ابن جریرؒ، امام رازیؒ اور قدیم و جدید تمام مفسرین یہی تفسیر بیان فرما رہے ہیں پس صاحب مقالہ کی یہ تفسیر نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ مقصد کے منافی ہے۔

درحقیقت اس آیت کا مصداق یہ ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا جب تمام ایشیاءِ کوچک کو بحرِ شام سے بحرِ اسود تک قبضہ میں کر چکا تو وہ آگے بڑھتا ہوا مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ نقشہ میں

اس نے اپنی عمر میں تین تاریخی مہم سر کی ہیں .. ایک میں وہ مطلع الشمس تک پہنچا ہے یعنی مشرق کی جانب اس حد تک پہنچا جہاں آبادیوں کا سلسلہ ختم ہوکر سورج سامنے سے طلوع ہوتا نظر آتا تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۳۰)

دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل میں چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہوگئے ہیں اور بحر ایجین کے ساحلی مقام پر جاکر یہ گہرے سیاہ رنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ساحل پر کھڑے ہونیوالے کو سورج اس کے اندر ڈوبتا نظر آتا ہے، اور مغربی ساحل کی یہ مہم سائرس ہی کو نصیب ہوئی ہے سکندر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اب صاحبِ استدراک چاہتے ہیں کہ اسے گھر بیٹھے ہی مقدونیہ کے کنارہ اس خوش قسمتی کا مصداق بنادیں مگر یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا۔

نیز صاحبِ استدراک "آرکیڈا جھیل کا جائے وقوع مناستر سے پچاس میل مغرب میں (یوگوسلاویہ) میں بتاکر اگرچہ اس کا بُعدِ مسافت ظاہر فرمانا چاہتے ہیں مگر بہرحال ہے وہ سکندر کے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ ہی۔

یہ ہیں وہ خدشات اور اسباب جرح جو "صاحب استدراک" نے تکلیف گوارا فرماکر "مضمون نگار" کے تین مسلماتِ بیعاد فرمائے ہیں، اب قارئین کرام بنظر انصاف خود غور فرمائیں کہ تاریخ کی روشنی میں "مضمون نگار" کے "مسلماتِ ثلثہ" صحیح ہیں یا صاحب استدراک کے "خدشات و جرح" درست ہیں؟ اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔

اس کے بعد صاحبِ استدراک یہ تحریر فرماتے ہیں "جزم کے ساتھ کسی کی بھی تعیین کرنا دشوار ہے اس لئے کہ قرآن مجید کی بتائی ہوئی علامات کا مصداق تمام تراب تک کوئی نہیں ملا ہے" (برہان ماہ اگست)

مضمون نگار نے بھی ذوالقرنین کی تعیین پر بحث کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ اس سب کچھ لکھنے کے بعد بھی بحث و تمحیص کا دروازہ بند نہیں ہے مگر پھر تعجب یہ ہے کہ ایسی صورت میں صاحب استدراک کو مضمون نگار کے مضمون کی فوری تردید کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ شاید صاحبِ استدراک کے نزدیک وہ اہم ضرورت یہ تھی فرماتے ہیں "لیکن جہانتک ارجحیت کا تعلق ہے سکندر مقدونی کا مسٔلہ جس کی طرف ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں کسی سے پیچھے نہیں"

گویا صاحب استدراک اس غلط فہمی میں ہیں کہ علماء متقدمین کی اکثریت اس جانب ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔ حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے کہ جس کو جلد رفع ہوجانا چاہئے۔

اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے متعلق مختلف اقوال میں سے علماء سلف (متقدمین) کی اکثریت کا دعویٰ کسی جانب بھی نہیں کیا جاسکتا اور اگر ان کے تمام اقوال کو جمع کرکے خلاصہ نکالا بھی جائے تو دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ ان کے نزدیک شاید راجح یہ ہے کہ وہ ایک قدیم بادشاہ تھا اور اس کا نسب

اور دوسرے میں وہ مغرب الشمس تک گیا ہے یعنی اس حد تک پہنچا ہے جہاں حصۂ زمین ختم ہو کر سمندر کا کوئی ایسا حصہ سامنے تھا جس میں غروب کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا گویا سورج

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱ -

سام بن اولیٰ سے ملتا ہے اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا - دوسری یہ کہ جن بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ ذوالقرنین سکندر ہے ان کی مراد سکندر مقدونی سے نہیں ہے بلکہ وہ حضرت مسیح سے دو ہزار برس پہلے سکندر رومی کو اس کا مصداق تسلیم کرتے اور رومی اور مقدونی کو دو جدا جدا ہستیاں مانتے ہیں اور ان دونوں باتوں کی تصدیق کے لئے تفسیر ابن کثیر (ج ۳ ص ۱۶۷) فتح الباری (ج ۶ ص ۲۹۴ و ۲۹۵) بخاری کتاب احادیث الانبیاء البدایہ والنہایہ یعنی تاریخ ابن کثیر (ج ۲ ص ۱۰۲ و ۱۰۵) اور کتاب التیجان قابلِ مراجعت ہیں اور حافظ عماد الدین ابن کثیر نے تو البدایہ والنہایہ (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) میں متقدمین کی اس دوسری بات کو واضح کرتے ہوئے صاف صاف تحریر فرمایا ہے

> حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین سکندر ہی ہے اور اس کا باپ پہلا قیصر گذرا ہے اور وہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھا اور لیکن دوسرا ذوالقرنین پس وہ سکندر بن فلپس مقدونی یونانی مصری ہے جس نے اسکندریہ آباد کیا اور جو روم کی تاریخ بناتا ہے اور یہ دوسرا سکندر پہلے سکندر سے بہت طویل زمانہ کے بعد ہوا ہے اور ہم نے اس پر اس لئے تنبیہ کی کہ بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ دونوں سکندر ایک ہی ہیں اور یہ گمان کر بیٹھے کہ قرآن میں جس سکندر کا ذکر ہے وہ سکندر ہے جس کا وزیر ارسطو ہے اور اس غلط سمجھ کی وجہ سے بہت بڑی خطا اور عریض و طویل فساد برپا ہو جاتا ہے پس بلاشبہ پہلا سکندر مومن صالح اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور دوسرا سکندر مشرک تھا اور اس کا وزیر ارسطو فلسفی تھا اور ان کے درمیان دو ہزار سال سے زائد کا زمانہ ہے اور ان دونوں کا فرق صرف ایسے غبی پر ہی مشتبہ رہ سکتا ہے جو حقائق امور سے ناواقف ہو۔

اب صاحب استدراک غور فرمائیں کہ ان کا یہ کہنا "سکندر یونانی کی جانب ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں" کہاں تک درست ہے؟ ہاں ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اس سخت مغالطہ میں کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔ صرف صاحب استدراک ہی تنہا نہیں ہیں بلکہ مورخین اسلام میں سے بعض اچھے اچھے مؤرخوں کو یہ دھوکا ہو گیا اور انھوں نے اس سکندر قدیم کو جو در اصل سکندر نہیں بلکہ حمیری سامی بادشاہ تھا۔ سکندر مقدونی سمجھ لیا اور ذوالقرنین والا تمام قصہ اس کے ساتھ چسپاں کر دیا اور جب اس کے جسم حکومت اور شخصیت پر قبا، ذوالقرنین راست نہ آسکی تو دور از کار تاویلات کے ذریعہ اس پر موزوں کرنے کی سعی ناکام کی۔ اور زیادہ تعجب یہ ہے کہ امام رازی جیسا بزرگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور غالباً اس کی ابتدا مشہور مفسر و مورخ ابن جریرؒ سے ہوئی۔

کہ وہ چشمہ میں ڈوب رہا ہے۔ اور تیسری مہم ایسے سفر سے متعلق تھی جس میں اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان سے ناآشنا تھی اور جس نے یاجوج ماجوج قبائل کی تاخت و تاراج کے کے متعلق اس سے شکایت کی اور اس نے ان کی فرمائش پر دو پہاڑوں کی پھانکوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ایک مضبوط "سد" قائم کر کے حملہ آور یاجوج و ماجوج قبائل سے ان کو محفوظ کر دیا لیکن علماء سلف یہ بتلانے سے قاصر رہے ہیں کہ جس شخص کو وہ ذوالقرنین فرما رہے ہیں کیا واقعی اس کو یہ تینوں مہم اس تفصیل کے ساتھ پیش آئیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ بلکہ وہ اس کا بھی فیصلہ نہیں فرما سکے کہ اس کا اصل نام کیا ہے؟ اس کا مرکزِ حکومت کہاں تھا؟ اور اس کو ذوالقرنین کیوں کہتے ہیں؟ غرض سلف رحمہم اللہ کے یہاں ان سوالات کے جوابات میں اس درجہ مختلف اور مضطرب اقوال پائے جاتے ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ اوصاف و علامات کے پیش نظر ان کے ذریعہ کسی قدیم العہد بادشاہ کی شخصیت کا تعین ناممکن ہو جاتا اور معاملہ اپنی جگہ غیر منفصل

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲۔

علماء سلف اور متقدمین کی اکثریت کے مسلک کی اس توضیح کے بعد لائق صاحب استدراک خود غور فرمائیں کہ کیا اس کے بعد بھی ان کا ازراہِ طعن یہ فرمانا کہ جب سے تحقیق اور روشن خیالی کا معیار ہی یہ قرار پا گیا ہے کہ اگلے ماہرین فن کے ساتھ رشتۂ اتحاد و توافق کا نہیں بلکہ انکار و تردید کا قائم رکھا جائے ذوالقرنین کے اسکندر ہونے سے مسلسل انکار ہونے لگا ہے۔" (صدق ۱۳ اگست ۱۹۵۸ء) کسی حد تک بھی درست ہو سکتا ہے؟ ہم اس کے جواب میں انھیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی "ایاکم والظن فان بعض الظن اثم" یاد دلانا چاہتے ہیں۔

صاحب استدراک فرماتے ہیں کہ ہم نے ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار کر کے اکابر سلف کے ساتھ انکار و تردید کا رشتہ قائم کیا ہے حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سکندر مقدونی کے انکار میں اکابر تفسیر و حدیث حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، شعبی، حافظ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حیان حافظ ابن حجر، شیخ بدرالدین عینی، امام نووی، قرطبی وغیرہ سب ہی غریب مضمون نگار کے ہمنوا اور صاحب استدراک کی رائے کے مخالف ہیں۔ البتہ صرف ابن جریر طبری اور امام رازی ضرور مقدونی کو ذوالقرنین بتا رہے ہیں مگر ساتھ ہی امام صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول پر بہت قوی اعتراضات وارد ہوتے ہیں لیکن صاحب استدراک کی نگاہ میں وہ خود تو اکابر سلف کے مؤید ہیں اور غریب مضمون نگار اکابر کا مخالف ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً نام کے متعلق زبیر بن بکار اور ابن مردویہ (عن ابن عباسؓ) کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ضحاک بن معد بن عدنان ہے مگر اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت بہت ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں وہ حضرت ابراہیمؑ کا معاصر نہیں ہو سکتا جبکہ حضرت ابراہیمؑ اور عدنان کے درمیان چالیس واسطے ہیں[1]۔ ابن ہشام، کعب احبار اور جعفر بن حبیب کہتے ہیں کہ اس کا نام مصعب بن عبداللہ یا مصعب حمیری ہے[2]۔ حافظ ابن حجر کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مصعب سے قحطان تک چودہ پشت ہوتی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام سے فلج تک سات پشت ہیں حالانکہ فلج اور قحطان دونوں بھائی اور عبر کے بیٹے ہیں[3]۔ لہٰذا اس حساب سے یہ شخص بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر نہیں ہو سکتا۔ اور جعفر بن حبیب کی دوسری روایت یہ ہے کہ منذر بن ابی القیس (شاہ حیرہ) ذوالقرنین ہے[4] لیکن یہ بادشاہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے بھی بعد پیدا ہوا ہے۔ اور ہمدانی نے کتاب الانساب میں اس کا نام ہمیسع (ابوالصعب) بن عمرو بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا بن قحطان یا ابن یشجب بن یعرب بن قحطان بتایا ہے۔ اگرچہ اس نام کا بادشاہ سبا کے خاندان سے ضرور ہو گذرا ہے[5] لیکن حمیری (سبا) بادشاہوں کے طبقۂ اولیٰ کی تاریخ بھی ۱۲۰۰ ق م سے اوپر نہیں جاتی حالانکہ معاصر ابراہیم (علیہ السلام) کو ۲۲۰۰ ق م ہونا چاہئے۔ اور ابن ہشام نے سیرت میں دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ ذوالقرنین کا نام مرزبان بن مردویہ ہے اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق کی روایت کی وجہ سے اسی کو سکندر اول بھی کہتے ہیں، لیکن تاریخی اعتبار سے یہ نام مجہول ہے اور اس نام کا کوئی بادشاہ تاریخوں میں مذکور نہیں ہے۔ علاوہ ازیں علماء سلف یہ صراحت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین عربی الاصل ہے اور مرزبان اور مردویہ عربی نام نہیں ہیں بلکہ عجمی نام ہیں اس لئے اگر اس نام کا کوئی بادشاہ ہوگا تو وہ عجمی ہوگا نہ کہ عربی۔ اور وہب بن منبہؒ سے منقول ہے کہ اس کا نام صعب بن مراثد (تبع اول) ہے[6]۔ لیکن یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اول تو کوئی تبع اول

---

[1] فتح الباری ج ۶۔ [2] مصعب یا صعب بن عبداللہ بن قرین بن منصور بن عبداللہ بن ازد فتح الباری ج ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ و توراۃ پیدائش باب ۱۱ و الانباہ لابن عبدالبر۔ [3] کتاب المعبر۔ [4] الانباہ لابن عبدالبر و تاریخ ابن کثیر ج ۲۔ [5] قلقشندی

[6] کتاب التیجان لابن ہشام۔

کا یہ نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کا نام حارث الرائش یا زید ہے دوسرے کوئی حمیری تُبّع "حضرت ابراہیم کا معاصر نہیں ہے اور دار قطنی اور ابن ماکولا سے منقول ہے کہ اس کا نام ہَرمِس یا ہِردِس بن قیطون بن منطلی ہے[۱۵]۔ مگر یہ سخت مغالطہ ہے اس لئے کہ یہ سکندر مقدونی کے دادا کا نام ہے اور سکندر کے مغالطہ ہی میں ذکر میں آگیا ہے۔

اس تفصیل سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس امر پر اتفاق کے باوجود کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر بادشاہ ہے جو نام سلف سے منقول ہیں ان میں سے نہ کوئی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا معاصر ہے اور نہ سامیہ اولی نسبت بلکہ یا یمنی حمیری سلاطین کے نام ہیں اور یا عجمی بادشاہوں کے نام اور ان میں بھی اس درجہ اختلاف ہے کہ چند علماء سلف کا کسی ایک پر بھی اتفاق نہیں ہے اور اسی بنا پر حافظ ابن حجرؒ صرف یہ فرما کر خاموش ہوگئے کہ چند اشعار عرب اور بعض اقوال سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کا نام صعب تھا۔ لیکن خود صعب کی شخصیت کے متعلق جو اختلاف اقوال ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر نہ ہونے کا جو اشکال ہے اس کا کوئی حل انھوں نے نہیں کیا۔

پھر نام کی طرح اس کے لقب "ذوالقرنین" کے متعلق بھی یہی اضطراب موجود ہے اور اس لقب کی وجہ میں جس قدر بھی عقلی احتمالات ہوسکتے تھے وہ سب ہی منقول و مذکور ہیں۔ فہرست ملاحظہ ہو۔

(۱) ذوالقرنین اس لئے کہا گیا کہ وہ روم و فارس دو مملکتوں کا مالک تھا اور قرن "جس کے معنی "سینگ" کے ہیں بطور استعارہ کے طاقت و حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی دو حکومتوں کا والی و مالک یہ رائے اہل کتاب کی جانب منسوب ہے اور بعض مفسرین کا رجحان بھی اسی جانب ہے۔

(۲) وہ فتوحات کرتا ہوا فضائے مشرق و مغرب تک پہنچا اور دونوں جہات میں بہت سے ممالک پر قابض و مسلط ہوا۔ یہ زہری کا قول ہے

(۳) اس کے سر میں دونوں جانب سینگ کے مشابہ تانبے کے سے دو غدود ابھرے ہوئے تھے

---

[۱۵] تاریخ ابن کثیر ج ۲

یہ وہب بن منبہؒ کی رائے ہے۔

(۴) اس کی زلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بالوں کو دو حصے کرتا اور ان کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا، ان دونوں کو "قرن" سے تشبیہ دے کر اس کو یہ لقب دیا گیا۔ یہ قول حسن بصریؒ کی جانب منسوب ہے۔

(۵) اس نے ایک جابر بادشاہ کو یا اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، بادشاہ یا قوم نے غضبناک ہو کر اس کے سر کے ایک جانب ایسی سخت چوٹ لگائی کہ وہ مر گیا اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر پھر تبلیغ کا فرض انجام دیا اس مرتبہ دوسری جانب چوٹ مار کر قوم نے اس کو شہید کر دیا، اس ضرب سے اس کے سر پر جو دو نشان پڑ گئے تھے اس وجہ سے اس کو یہ لقب دیا گیا۔ یہ توجیہ حضرت علیؓ کی جانب منسوب ہے۔

(۶) وہ نجیب الطرفین تھا اس لئے والدین کی نجابت کو قرنین کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور "ذوالقرنین" لقب ہوا۔

(۷) اس نے اس قدر طویل عمر پائی کہ انسانی دنیا کے دو قرن (صدیوں) تک زندہ رہا۔

(۸) وہ جب جنگ کرتا تھا تو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ہتھیار چلاتا بلکہ دونوں رکابوں سے بھی ٹھوکر لگاتا تھا۔

(۹) اس نے زمین کی تاریکی اور روشنی دونوں حصوں کی سیاحت کی۔

(۱۰) وہ ظاہر و باطن دونوں علوم کا حامل تھا۔ [۱]

لیکن پہلی توجیہ تو اس قیاس پر مبنی ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسری توجیہ کی بنیاد ایک ناقابلِ اعتماد روایت پر ہے جو سفیان ثوری اور مجاہدؒ سے منقول ہے اس میں ہے کہ چار بادشاہ وہ ہیں جنھوں نے تمام عالم پر حکومت کی ہے ان میں سے دو مسلمان ہیں اور دو کافر؛ حضرت سلیمان (علیہ السلام) ذوالقرنین اور نمرود و بخت نصر۔ [۲] یہ روایت اس لئے معلول ہے کہ اگر تھوڑی

[۱] فتح الباری ج ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ و دائرۃ المعارف بستانی ج ۸ ص ۱۱۱۔ [۲] تاریخ ابن کثیر ج ۲ و فتح الباری ج ۶

دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) اور ذوالقرنین دونوں کی حکومت تمام عالم پر رہی ہے اگرچہ تاریخی حیثیت سے یہ صحیح نہیں ہے تب بھی نمرود اور بخت نصر کے جو مفصل حالات کتب تواریخ میں محفوظ ہیں وہ اس روایت کے مضمون کا انکار کرتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں بادشاہوں کی حکومت شام، عراق، مصر، حجاز اور فارس کے علاوہ بالواسطہ یا بلا واسطہ دنیا کے کسی حصہ پر بھی ثابت نہیں ہے اور آخر الذکر بادشاہ کا زمانہ تو بلحاظ عہد تاریخ اتنا قریب ہے کہ اس کی حکومت اور رقبہ حکومت کی تفاصیل تو معاصرانہ شہادتوں، تاریخی روایتوں اور حفریات کے اکتشافات کی بنا پر بہت مشہور اور واضح ہیں۔ اس لئے یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے۔ اور تیسری توجیہ سے متعلق جو روایت ہے اس کو حافظ ابن حجرؒ نے منکر اور ابن کثیرؒ نے ضعیف اور نہ قابل اعتماد کہا ہے[۱]۔ اور چوتھی توجیہ جو حسن بصریؒ کی جانب منسوب ہے محض قیاسی ہے اور پانچویں توجیہ جو حضرت علیؓ سے منقول ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس کے دو طریق روایت میں سے ایک ضعیف اور نا قابل۔ اور دوسرا طریقہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے متن پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں یہ الفاظ ہیں لم یکن نبیا ولا ملکا۔ ذوالقرنین نہ نبی تھے اور نہ فرشتہ "حالانکہ اسی روایت کی ابتدا میں ہے" بعثہ اللہ الی قومہ، اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی جانب مبعوث کیا تھا" یہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ نبی تھے، البتہ حافظ نے اس اشکال کے جواب میں ایک کمزور سا جواب یہ کہکر دیدیا" الا ان یحمل البعث علی غیر رسالۃ النبوۃ مگر یہ کہ یوں کہدیا جائے کہ اس کی بعثت نبوۃ کے طور پر نہیں تھی"[۲]۔

ہمارے نزدیک اس پر یہ اہم اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے حاکمانہ اقتدار کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں یہ روایت ان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی، وہ کہتا ہے کہ ذوالقرنین وسیع مملکت کا مالک اور کامیاب بادشاہ ہو گذرا ہے مگر یہ روایت اس کو صرف ایک مبلغ ثابت کرتی ہے جس کی قوم تک نے اس کو نہیں تسلیم کیا اور اس کے درپے آزار رہی۔ علاوہ ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کے متعلق جو معجزانہ واقعہ مذکور ہے اگر یہ صحیح تھا تو قرآن عزیز

---

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳ و فتح الباری ج ۶ ص [۲] فتح الباری ج ۶۔

کس طرح اس کو فروگذاشت کر سکتا تھا جبکہ یہ ذوالقرنین کی عظمت کو چند در چند بلند کر دیتا ہے ؟ ۔
اس لئے یہ توجیہ بھی جرح اور ضعف سے محفوظ نہیں ہے اور ممکن ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ قول قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے سوا کسی دوسری شخصیت سے متعلق ہو اور نیچے کے راویوں نے اپنے فہم سے اس واقعہ کے ساتھ چسپاں کر دیا ہو۔ اور ساتویں، اور نویں ہر دو توجیہات کو ابن کثیر نے "منکر" یعنی ناقابلِ اعتماد کہا ہے[۱] اور چھٹی، آٹھویں اور نویں توجیہات محض اٹکل کے تیر اور بے سند ہیں[۲]

یہ ہیں وہ اقوال جو یا بلحاظِ نقل ضعیف اور منکر ہیں اور یا بے سند محض اٹکل کے تیر ہیں۔ اسی بنا پر حافظ ابن حجرؒ تو ان کو فقط نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان اقوال میں سے بھی کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دیتے جو ان کے نزدیک بلحاظ روایت و نقل سقم سے پاک ہیں۔ البتہ حافظ ابن کثیر نے زہری کے قول کو راجح کہا ہے یعنی وہ چونکہ مشرق اور مغرب دونوں حدوں تک پہنچا اور ان کے درمیان کا مالک رہا ہے اس لئے ذوالقرنین کہلایا[۳] یہ بات اگرچہ کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے لیکن مشارق الارض ومغاربھا" کے مفہوم میں وہی کلام ہے جو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں اور آئندہ تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کریں گے۔

علماءِ سلف سے ذوالقرنین کے نام اور لقب سے متعلق جو اقوال منقول ہیں اور جن سے اس کی شخصیت کے تعین میں مدد لی جاتی ہے ان کا حال تو آپ تفصیل کے ساتھ معلوم کر چکے اب ذوالقرنین کے بعض حالات کا جو تذکرہ اس ضمن میں پایا جاتا ہے وہ بھی تعارض و اضطراب سے خالی نہیں ہے مثلاً ازرقی کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کیا اور پھر ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) کے ہمراہ کعبہ کا طواف کیا[۴]۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا اور علی بن احمد کی روایت میں ہے کہ ذوالقرنین جب حج کے ارادہ سے نکلا تو پیادہ پا روانہ ہوا، اس کی اطلاع حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ہوئی تو وہ اس کے استقبال کے لئے نکلے اور[۵]

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۲۔ [۲] فتح الباری ج ۶ والبدایہ والنہایہ ج ۲ [۳] البدایہ والنہایہ ج ۲
[۴] فتح الباری ج ۶۔

اس کے لئے دعاءِ خیر کی" یہ روایت ذوالقرنین کو قدیم الاسلام ثابت کرتی ہے۔

اسی طرح تعینِ شخصیت میں کوئی اس کو سامیہ اولیٰ میں سے بیان کرتا ہے اور کوئی حمیری بادشاہوں میں سے اور کوئی خضر (علیہ السلام) کو اس کا وزیر کہکر خضرؑ کی عمر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد تک دراز ثابت کرتا ہے حالانکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حالات میں ثابت کیا جاچکا ہے کہ اس قسم کی تمام روایات غیر مستند اور اہلِ کتاب سے ماخوذ ہیں۔

غرض ذوالقرنین کے نام اس کے لقب کی وجہ تسمیہ اور تعیینِ شخصیت کے متعلق علماء سلف کے یہاں اس قدر مختلف اور مضطرب روایات پائی جاتی ہیں کہ ان کو سامنے رکھکر ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت کا پتہ لگانا ناممکن ہوجاتا ہے اور حافظ ابن حجرؒ کے اس ارشاد کے باوجود۔

فھذہ الآثار یشدّ بعضہ	پس یہ آثار ایک دوسرے کو مضبوط بناتے اور قوت
بعضًا ویدل علی قدم	پہنچاتے ہیں اور ذوالقرنین کے قدیم العہد ہونے پر
عھد ذی القرنین۔	دلالت کرتے ہیں۔

یہ اشکال حل نہیں ہوتا کہ جبکہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے عہد کے کافر بادشاہ نمرود کے حالات و واقعات قرآن کے علاوہ سیر و تاریخ کی کتابوں کے ذریعہ بھی بہت زیادہ روشنی میں آچکے ہیں اور بائبل بھی اکثر حالات کو روشنی میں لاتی ہے تو اگر ذوالقرنین عہدِ ابراہیمی کی ایسی عظیم الشان ہستی تھی تو ان چند مختصر اور منتشر آثار کے علاوہ اس کے حالات و واقعات کیوں تاریخی حیثیت سے اس طرح سامنے نہیں آئے جس سے اس کی شخصیت صاف طور پر نمایاں نظر آتی۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے وابستہ ایسے جلیل القدر انسان کا ذکر قرآن نے کیوں واقعاتِ ابراہیم (علیہ السلام) کے سلسلہ میں نہیں کیا اور سورۂ کہف میں اس جانب کیوں اشارہ تک نہیں کیا کیا یہ بات قابلِ تعجب نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالف کافر بادشاہ کی مخالفت اور حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کا تو قرآن شد و مد کے ساتھ ذکر کرے مگر مشارق و مغاربِ ارض پر حکمراں ایسے بادشاہ کا اس سلسلہ میں کوئی ذکر نہ کیا جائے جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام کے ہاتھ پر

ایمان لایا یا ان کی اطاعت وفرمانبرداری کا اظہار کرکے ان کا مؤید ثابت ہوا۔ اس لئے یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ قرآن، مرفوع احادیث، توراۃ اور تاریخ میں عہدِ ابراہیمی کے اندر یا اس کے قریب کسی ایسے بادشاہ کا ثبوت نہیں ملتا جس کا ذکر سورۂ کہف میں "ذوالقرنین" کہکر کیا گیا ہے اور جو اقوال وآثار اس سلسلہ میں مذکور ہیں وہ اس شخصیت کی تاریخی حیثیت ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔

متاخرین کی رائے

علماءِ متاخرین میں سے بعض علماء نے تو اسی غلط بات کو اختیار کرلیا کہ سکندر یونانی (مقدونی) ہی قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہے اور بعض علماء نے فقط علماءِ سلف کے قول کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس کے خطا وصواب پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور بعض نے بغیر کسی دلیل کے یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو زیرِ بحث ذوالقرنین فرمادیا۔

مگر ان سب اقوال سے جدا مولانا ابوالکلام نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے البتہ وہ ضرور قابلِ توجہ ہے۔ بلکہ دلائل وبراہین کی قوت کے لحاظ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تحقیق بلاشبہ صحیح اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف اور تاریخی حقائق کی مطابقت کے پیشِ نظر ہر طرح لائقِ ترجیح ہے۔

تفسیری مطالب کے سلسلہ میں ہم کو موصوف کے ساتھ شدید اختلاف بھی رہتا ہے اور اتفاق بھی لیکن اس خاص مسئلہ میں چونکہ ان کی رائے علماءِ سلف سے بالکل مختلف تھی اس لئے کڑی تنقیدی نظر کی محتاج تھی چنانچہ کافی غور وخوض اور گہری نظر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جبکہ یہ طے شدہ امر ہے کہ علماءِ سلف کی جلالتِ قدر اور علمی عظمت وبرتری کے باوجود علمی تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں علماءِ متاخرین نے علماءِ متقدمین سے سینکڑوں مسائلِ علمی میں اختلافِ رائے کا اظہار کیا ہے۔ خصوصاً تاریخی مباحث میں اور جدید ذرائع معلومات نے ایسے انکشافات کئے ہیں جن کے ذریعہ ہم بہت سے ایسے مسائل کو بآسانی حل کرلیتے ہیں جو علماءِ سلف کے زمانہ میں لاینحل رہے ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کی اس تحقیق کا "خواہ تاریخی حقایق کے لحاظ سے وہ کتنی ہی وقیع کیوں نہ ہو" محض اس لئے انکار نہیں کردینا چاہیئے کہ وہ

ان کی اپنی تحقیق ہے۔

مولانا آزاد نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے وہ اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے اور اس طویل مضمون کا یہاں نقل کرنا قطعاً غیر مناسب ہے البتہ ہم اپنی کاوش و تحقیق سے جس حد تک اس کے ساتھ مطابقت کر سکتے ہیں اس ہی کو سپردِ قلم کرنا موزوں خیال کرتے ہیں۔ ؎

یہود و قریش اور انتخابِ سوالات

ایک مرتبہ پھر اس روایت پر غور فرمائیے جو محمد بن اسحٰق اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے نقل فرمائی ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے متعلق مشرکینِ مکہ نے جو سوالات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے وہ دراصل یہودِ مدینہ کی تلقین پر کئے گئے تو اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہود کو ان واقعات سے ایسی کیا دلچسپی تھی کہ جس کی بنیاد پر انھوں نے ان کا انتخاب کیا اور ان کے صحیح جوابات کو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت و رسالت کی صداقت کا معیار ٹھیرایا۔ اصحابِ کہف سے متعلق تو تفصیل کے ساتھ گذشتہ صفحات میں بحث آچکی ہے لیکن ذوالقرنین کے بارے میں کیوں سوال کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نے اس سوال میں درحقیقت ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جو ان کی مذہبی زندگی کے سلسلہ میں بہت ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جس کو وہ اپنی ملی و اجتماعی حیات میں کسی وقت بھی فراموش نہیں کر سکتے کیونکہ اس شخصیت کی بدولت بنی اسرائیل نے بابل کی غلامی سے نجات پائی اور ان کے قومی مرکز قبلۂ صلوٰۃ اور مقدس مقام یروشلم (بیت المقدس) ہر قسم کی تباہی اور بربادی کے بعد اسی کے ہاتھوں دوبارہ آباد ہوا چنانچہ ان اہم امور کی بنا پر یہود کے نزدیک وہ "نجات دہندہ" "خدا کا مسیح" اور "خدا کا چرواہا" کہلایا کیونکہ ان کے نبیوں کے مقدس صحیفوں میں اس کے متعلق یہی القاب درج تھے اور اس کی عظمت کا اظہار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے سوالات میں اس شخصیت کے مسئلہ

؎ اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصۂ بیان سے سخت اختلاف ہے جو انھوں نے علماءِ سلف کے خلاف یاجوج و ماجوج کے آخری خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے اس لئے کہ یہ حصۂ تحقیق بلاشبہ باطل ہے یہ بحث عنقریب ذکر میں آئے گی۔

کو بھی منتخب کیا بلکہ اسی کو زیادہ اہمیت دی جیسا کہ قرآن کے اسلوب بیان "یَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ" سے واضح ہوتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ جبکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور اس کے تمام سچے پیغمبروں کے دین کو اور اپنے دین کو ایک ہی "دین" سمجھتے ہیں خصوصاً انبیاء بنی اسرائیل کی عظمت و عزت اور ان کی صداقت و حقانیت کا اظہار فرماتے ہیں پس اگر وہ حقیقتہً خدا کے سچے پیغمبر ہیں تو "اُمّی" ہونے کے باوجود ضرور وحی الٰہی کے ذریعہ اس شخص کے واقعات پر روشنی ڈال سکیں گے جس کی وجہ سے مہبطِ انبیاءِ بنی اسرائیل (یروشلم) اور انبیاءِ بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کو ایک بت پرست بادشاہ کی غلامی اور تباہ کاریوں سے نجات ملی اور جو خدا کے کلمہ کو سربلند کرنے میں انبیاءِ بنی اسرائیل کا معاون و مددگار ثابت ہوا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۶۰۰ ق م میں عراق میں دو عظیم الشان حکومتیں اپنے قاہرانہ و جابرانہ تسلط کے ساتھ قائم تھیں ایک آشوری حکومت اور اس کا دارالحکومت نینویٰ تھا اور دوسری بابلی حکومت اور اس کا دارالحکومت بابل تھا۔ لیکن ۶۱۲ ق م میں نینویٰ کی حکومت کو زوال آگیا اور اب بابلی حکومت بلاشرکتِ غیرے دونوں حکومتوں کے مقبوضات کی مالک اور وقت کی بہت بڑی طاقت بن گئی، یہی زمانہ تھا جبکہ بابل کے تخت پر بخت نصر (بنوکدنذر)[1] سریر آرائے سلطنت ہوا یہ بادشاہ ذاتی طور پر بھی بہت بہادر اور صاحبِ تدبیر تھا مگر ساتھ ہی سخت جابر و ظالم بھی تھا کتبِ تاریخ میں مشہور ہے کہ یہ صرف ملکوں کو فتح ہی نہیں کرتا تھا بلکہ قوموں کو غلام بنا کر بھیڑوں کی طرح بابل کو ہنکاتا اور بڑے بڑے متمدن اور بے نظیر شہروں کو برباد کر کے کھنڈر چھوڑ جاتا تھا۔

ادھر ایک عرصہ سے بنی اسرائیل کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کو گھن لگ چکا تھا اور بداعمالیوں اور بدکرداریوں نے اس درجہ ان کو ذلیل و خوار کر دیا تھا کہ جو انبیاء (علیہم السلام) ان کی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے اور ان کی بدکرداریوں پر ان کو وعظ و نصیحت اور تنبیہ کرتے تو یہ ان کو قتل کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بخت نصر خدا کا عذاب بن کر ان پر چڑھ آیا،

---

[1] اس نام کا املا دو طرح منقول ہے (بنوکدنزار)۔ (بنوکدنذر)۔

اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بکریوں کے گلہ کی طرح ہنکالے گیا اور بیت المقدس جیسے خوبصورت اور مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ حادثہ بنی اسرائیل کے لیے ایسا ہوشربا تھا کہ اس نے ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالا اور وہ انتہائی مایوسی کی حالت میں بابل کے اندر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ [1]

بنی اسرائیل پر گذرے ہوئے ان واقعات کی خبر اگرچہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے حضرت یسعیاہ (شعیا) اور حضرت یرمیاہ (علیہما السلام) نے وحی و الہام کے ذریعہ پیش آنے سے قبل ہی سنادی تھی مگر اس زمانہ میں وہ اپنی نافرمانیوں میں اس درجہ سرشار و سرمست تھے کہ انھوں نے ان پیشنگوئیوں کی مطلق پرواہ نہیں کی، اب جبکہ یہ ہولناک واقعات سر پر سے گذرنے لگے تو ان کی آنکھیں کھلیں مگر ایسے وقت کھلیں کہ رنج و افسوس اور حزن و ملال سب بیکار تھا اور کوئی ترکیب نہیں تھی کہ وہ اس عذاب سے نجات پا سکیں۔

لیکن ان تمام مایوسیوں کی سخت اور ہولناک تاریکی میں ان کے لئے اگر کوئی شعلۂ امید باقی تھی تو وہ ان ہی انبیاء علیہم السلام کی پیشنگوئیوں کا وہ حصہ تھا جس میں حضرت یسعیاہ نبی نے تقریباً ایک سو ساٹھ سال قبل اور حضرت یرمیاہ نبی نے ساٹھ سال قبل یہ بشارت بھی دی تھی کہ بیت المقدس کی تباہی سے ستر سال کے بعد بنی اسرائیل دوبارہ اپنے وطن میں آزاد ہو کر واپس آجائیں گے اور خدا کا ایک مسیح (مبارک) خدا کا چرواہا (نگہبان) کہ جس کا نام خورس ہوگا وہ بنی اسرائیل کی نجات اور یروشلم کی دوبارہ آبادی کا باعث بنے گا اور اس کے ہاتھوں یہود کی اجتماعی زندگی کا نیا دور شروع ہوگا۔

بخت نصر جب بیت المقدس کے تمام اسرائیلیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تو ان میں بعض انبیاء بنی اسرائیل بھی تھے جو بابل جا کر اپنے حکیمانہ اقوال اور کریمانہ اخلاق کی وجہ سے اس درجہ ہردلعزیز بنے کہ دشمن بھی ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوا چنانچہ حضرت دانیال (علیہ السلام) بابلی حکومت کے آخری دور میں مشیر خاص تھے۔

---

[1] واقعہ کی تفصیلات "بیت المقدس" کے عنوان میں زیر بحث آچکی ہیں۔

اب جبکہ وہ وقت قریب آیا کہ بنی اسرائیل غلامی سے نجات پائیں تو ان ہی برگزیدہ نبی (دانیال علیہ السلام) کو الہام و مکاشفہ کے ذریعہ اس نجات دہندہ کو ایک تمثیل کی شکل میں دکھایا گیا اور ساتھ ہی جبرئیل علیہ السلام (ناموس اکبر) نے دانیال نبی کو اس کی تعبیر بھی بتائی جو اسی خورس کے حق میں تھی جس کا ذکر یسعیاہ نبی کی پیشینگوئی میں آچکا تھا۔

ذوالقرنین اور انبیا بنی اسرائیل کی پیشینگوئیاں

یہود کے نجات دہندہ، خدا کے مسیح اور اس کے چرواہے کے متعلق وہ پیشینگوئیاں کیا ہیں جن کو دیکھکر یہود بابل کی سرزمین میں انتہائی مایوسیوں کے باوجود اس وقت کے لئے چشم براہ تھے پہلے ان کو نقل کر دیا جائے تاکہ زیر بحث مسئلہ کے لئے تحقیق کی جانب قدم اٹھایا جا سکے۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں حضرت یسعیاہ (علیہ السلام) کی پیشینگوئی سامنے آتی ہے جو یہودیوں کے یوم نجات سے ایک سو ساٹھ سال قبل سنائی گئی تھی۔

"اے اسرائیل تجھ کو مجھے فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے تیری خطاؤں کو بادل کی مانند اور تیرے گناہوں کو گھٹا کی مانند مٹا ڈالا میری طرف پھر آ کہ میں نے تیرا فدیہ دیا ہے۔ اے سماء آسمانو گاؤ، کہ خداوند نے یہ کیا۔ . . . . خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے کہ میں خداوند سب کا بنانے والا ہوں، میں نے ہی اکیلا آسمانوں کو تانا اور آپ تنہا زمین کو فرش کیا ہے۔ دروغگوان کے نشانوں کو باطل ٹھیراتا اور فال گیروں کو دیوانہ بناتا ہوں اور حکمت والوں کو رد کر دیتا اور ان کی حکمت کو حماقت ٹھیراتا ہوں۔ جو اپنے بندہ کے کلام کو ثابت کرتا اور اپنے رسولوں کی مصلحت کو پورا کرتا ہوں۔ جو یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا۔ جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی کو پوری کریگا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائیگی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔" [1]

[1] یسعیاہ نبی کا صحیفہ باب ۴۴ آیت ۲۱ تا ۲۸

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دوہرائے ہوئے دروازے اس کے لئے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کئے جائیں گے۔ میں تیرے آگے چلوں گا اور ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا۔ میں پیتل کے دروازوں کے جدا جدا پٹوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔ اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا۔ اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لیکے بلایا ہے۔ میں نے اپنے بندہ یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لئے تجھے تیرا نام صاف صاف لیکے بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھ کو نہیں جانتا۔ سلہ

اور دوسری پیشینگوئی حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) کی ہے جو بشارت کے وقوع سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی گئی تھی۔

وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو، منادی کرو مت چھپاؤ۔ کہو کہ بابل لیا گیا بعل رسوا ہوا۔ مردوک سراسیمہ کیا گیا۔ اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیونکہ اتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کریگی یہاں تک کہ کوئی اس میں نہ رہیگا۔ وہ بھاگے ہیں وہ روانہ ہوئے کیا انسان کیا حیوان ان دنوں میں اور اس ہی وقت خدا کہتا ہے بنی اسرائیل آئیں گے وہ اور بنی یہوداہ ایک ساتھ وہ روتے ہوئے چلے جائیں گے اور خداوند اپنے خدا کو ڈھونڈیں گے۔ وہ اس طرف متوجہ ہو کے صیہون کی راہ پوچھیں گے کہ آؤ ہم آپ ہی خداوند سے مل کے اس کے ساتھ ایک ابدی عہد کریں جو کبھی فراموش نہ ہو۔ ۔ ۔

. . . .

بابل میں سے بھاگو اور کسدیوں (بابلیوں کی سرزمین سے نکلو اور ان بکریوں کی مانند ہو جو گلوں کے

سلہ یسعیاہ نبی کا صحیفہ باب ۴۵ آیات ۴-۱ سلہ باب ۵۰ آیات ۶-۱

تب آگے جاتے ہیں کہ دیکھو میں اتر (شمال) کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کرونگا اور بابل پر لے آؤں گا ۔[۵۱]

"قوموں کو مادیوں (میڈیا) کے بادشاہوں کو اور اس کے عاملوں کو اور اس کے حاکموں کو اور اس کی سلطنت کی ساری سرزمین کو مخصوص کرو کہ اس پر چڑھیں"۔[۵۲]

"رب الافواج یوں کہتا ہے کہ بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھادی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیئے جائیں گے"۔[۵۳]

اور دانیال (علیہ السلام) کا خواب یا مکاشفہ یہ تھا۔

"بیل شازار (بخت نصر کا جانشین) بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں مجھے ہاں مجھ دانی ایل کو ایک رویا نظر آئی بعد اس کے جو شروع میں مجھے نظر آئی تھی اور میں نے عالم رویا میں دیکھا اور جس وقت میں نے دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن کے قصر میں تھا جو صوبہ عیلام میں ہے پھر میں نے رویت کے عالم میں دیکھا کہ میں اولائی کی ندی کے کنارہ پر ہوں۔ تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے اور وہ دو سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے اٹھا ہوا۔ میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھم اتر دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا نہ کوئی اس کے ہاتھ سے چھڑا سکا پھر وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا۔ اور میں اس سوچ میں تھا کہ دیکھا کہ ایک بکرا پچھم کی سمت سے آکر تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوا اور اس بکرے کے دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا اور وہ اس دو سینگ والے مینڈھے کے پاس جسے میں نے ندی کے سامنے کھڑا دیکھا آیا اور اپنے زور کے قہر سے اس پر دوڑ گیا اور میں نے اسے دیکھا کہ وہ مینڈھے کے قریب پہنچا اور اس کا غضب اس پر بھڑکا اور مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور

---

[۵۱] باب ۵۰ آیات ۹-۸ [۵۲] باب ۵۱ آیت ۲۸ ۔ [۵۳] باب ۵۱ آیت ۵۸

مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا سامنا کرے سلہ

اور دانیال (علیہ السلام) کے مکاشفہ اور رویا کی تعبیر یہ ہے۔

"اور ایسا ہوا کہ جب مجھ دانی ایل نے یہ رویت دیکھی تھی اور اس کی تعبیر کی تلاش کرتا تھا تو دیکھا کہ میرے سامنے کوئی کھڑا تھا جس کی صورت آدمی کی سی تھی۔ اور میں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ اولائی کے درمیان پکار کے کہا کہ اے جبریل اس شخص کو اس رویت کے معنی سمجھا چنانچہ وہ جہاں میں کھڑا تھا نزدیک آیا اور جب پہنچا تو میں ڈر گیا اور اوندھے منہ گرا۔ پھر اس نے مجھے کہا اے آدم زاد سمجھ کیونکہ یہ رویت آخری زمانہ میں انجام ہوگی . . . . اور کہا کہ دیکھ میں تجھے سمجھاؤں گا کہ قہر کے آخر میں کیا ہوگا کیونکہ مقررہ وقت پر ہی کام کا انجام ہوگا۔ وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو مادہ (میڈیا) اور فارس کا بادشاہ ہے اور وہ بالوں والا بکرا یونان کا بادشاہ اور وہ بڑا سینگ جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے سو اس کا پہلا بادشاہ ہے۔ سلہ

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے۔

کیونکہ خداوند یہ کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گذر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا . . . .
خداوند کہتا ہے اور میں تمہاری اسیری کو موقوف کراؤں گا اور تمہیں ساری قوموں میں سے اور سب جگہوں میں سے جن میں میں نے تم کو ہانک دیا ہے جمع کروں گا۔ خداوند کہتا ہے اور میں تمہیں اس مکان میں جہاں سے میں نے تمہیں اسیر کروا کے بھیجا پھر لے آؤں گا۔" سلہ

اور عزرا کی کتاب میں ہے۔

اور شاہِ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو۔ خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی

سلہ دانی ایل باب ۸ آیات ۷ سلہ دانی ایل باب ۸ آیات ۱۵-۲۱ سلہ یرمیاہ باب ۲۹ آیات ۱۰-۱۴

کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا، شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لئے ایک مسکن بناؤں پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے؟ اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو کہ یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے [1]

اور خورس بادشاہ ہی خداوند کے گھر کے ان برتنوں کو جنھیں نبوکدنضر یروشلم میں سے لے گیا تھا اور اپنے دیوتاؤں کے گھر میں رکھا تھا نکال لایا اور شاہِ فارس خورس نے انھیں خزانچی متردات کے ہاتھ سے نکلوایا اور اس نے انھیں یہوداہ کے امیر شیس بضر کو گن دیا [2]

اور زکریا نبی کی کتاب میں ہے۔

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ وہ شخص جس کا نام ش ہے اور وہ اپنی جگہ سے اُگے گا اور وہ خداوند کی ہیکل کو بنائے گا ہاں وہی خداوند کی ہیکل کو بنائیگا اور وہ صاحب شوکت ہوگا [3]

ان واضح اور صاف پیشینگوئیوں کی اگر تحلیل کی جائے تو ان سے حسبِ ذیل اہم امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) جس ہستی نے بنی اسرائیل کو بابل کی غلامی سے نجات دی اس کا نام خورس تھا اور وہ فارس اور میڈیا دو ملکوں کا متفقہ بادشاہ تھا۔

(۲) دانیال نبی کے مکاشفہ اور جبرئیل علیہ السلام کی تعبیر نے ان دو حکومتوں کے اتحاد کی بنا پر ہی خورس کو دو سینگوں والا (ذوالقرنین) بادشاہ کہا اور اسی تخیل کی بنا پر بنی اسرائیل میں اس کا لقب "ذوالقرنین" مشہور ہوا۔

(۳) انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں اس بادشاہ کو خدا کا مسیح، بنی اسرائیل کا نجات دہندہ اور خدا کا چرواہا کہا گیا ہے۔

(۴) یہودیوں میں قومی عصبیت اور نسلی تعصب کے شدید سے شدید تر ہونے کے باوجود انہی

---

[1] عزرا کی کتاب باب آیات ۱-۳ [2] ایضاً باب ۱ آیات ۷-۸ [3] زکریا نبی کی کتاب باب ۶ آیت ۱۲۔

واقعات کی بنیاد پر وہ غیر اسرائیلی شخص کو ایسے اوصاف سے یاد کرتے ہیں جو صرف اپنے انبیاء کے حق میں ہی کہنے کے عادی ہیں۔

(۵) واقعاتِ تاریخی نے یہ ثابت کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی پیشینگوئیوں کے مطابق خورس ہی نے یہودیوں کو بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کیا۔

(۶) یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں اس کو اُترسے آنا بتایا گیا ہے، خورس، بابل سے اتر (شمال) ہی کی جانب (فارس و میڈیا) سے آیا تھا اس لئے وہی اس پیشینگوئی کا مصداق ہے۔

(۷) زکریا نبی کی پیشینگوئی میں اس کو اُگنے والی "شاخ" بتایا گیا ہے، اس سے یہ مطلب ہے کہ اس کی نمود اور اس کا ظہور غیر معمولی صورتِ حالات میں ہوگا جیسا کہ عموماً ایسی شخصیتوں کے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے ہوتا رہا ہے کہ جن سے اس کو کوئی خاص کام لینا ہوتا ہے۔

خورس اور تاریخی شواہد

ان اجزاء پر بحث کرنے سے قبل چند تاریخی شواہد بھی پیشِ نظر رکھنے ضروری ہیں جن کا اس معاملہ سے خاص تعلق ہے۔

محققینِ تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حملۂ اسکندر سے پہلے کا عہد، دوسرا طوائف الملوک کا عہد اور تیسرا ساسانی سلاطین کا عہد اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان تینوں عہدوں میں سے فارس کی عظمت اور اس کے عروج کا عہد خورس (سائرس) کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتا ہے اور اس عہد کے حالات فارس کے رقیب یونان کے مؤرخین کے ذریعہ سے ہی روشنی میں آسکے ہیں جن میں سے بعض سائرس کے معاصر بھی ہیں۔ اس بادشاہ کو یہودی خورس، یونانی سائرس فارسی گورش اور کے ارش اور عرب کیخسرو کہتے ہیں۔

عرب مؤرخین کے یہاں بھی حکومتِ فارس کے یہ تین عہد جدا جدا نظر آتے ہیں چنانچہ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں ان تینوں عہدوں کے متعلق جو اشارات کئے ہیں وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کیونکہ وہ طوائف الملوک سے قبل کے حالات میں کسرٰیِ فارس کے درباری عظمت و شوکت کا جس طرح ذکر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ یہ دورِ حکومتِ فارس کے عروج و

عظمت کا دور تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ طوائف الملوک کا وسطی عہد، فارس کے لئے بہت خراب اور زوال کا عہد تھا۔ لیکن اردشیر بن بابک ساسانی نے اس کو ختم کر کے فارس کو اسی عروج پر دوبارہ پہنچا دیا، جس عروج پر پہلے عہد (عہدِ خورس) میں تھا۔

فاستمر الامر کذالک قریباً من خمسمائۃ	اور ملوک الطوائف کا یہ عہد تقریباً پانچ سو سال تک رہا
سنۃ حتی کان اردشیر بن بابک من	تاآنکہ اردشیر بن بابک ساسانی نے ظہور کیا تب
بنی ساسان . . . . فاعاد ملکہم	اس نے کھوئے ہوئے ملکوں کو واپس لیا اور پہلے عہد
الی ما کان علیہ ورجعت الممالک	کی حالت پیدا کردی اور تمام تقسیم شدہ حصۂ ملک
برمتہا الیہ الخ [۱]	پھر ایک مستقل حکومت کا جزو ہو گئے۔

اسی طرح ابنِ عبد البر نے القصد والامم میں ان ہر سہ عہدوں کا ذکر کرتے ہوئے افریدون اور منوچہر کے تذکرہ میں یہ فرمایا ہے۔

وھذہ الطبقۃ الاولی الی ان غلب	فارس کے بادشاہوں کا یہ پہلا طبقہ ہے جو دارا پر سکندر کے
الاسکندر دارا و رتبت ملوک الطوائف	حملہ تک شمار ہوتا ہے درمیان میں ملوک الطوائف کا
ثم ملکت الاکاسرۃ اولھم اردشیر	دور رہا اور اس کے بعد شاہانِ کسریٰ کا زمانہ ہے جو
بن بابک الخ [۲]	اردشیر سے شروع ہوتا ہے۔

۳۱۲ق م میں بابل و نینوی کی حکومتیں بہت عروج و اقبال پر تھیں اور خورس سے قبل اسی دور میں ایران کی حکومت دو جدا جدا حصوں پر تقسیم تھی۔ شمال مغربی حصہ کو میڈیا (ماہات) کہتے تھے اور مغربی حصہ کو فارس اور دونوں حصوں میں قبائلی سردار حکومت کرتے تھے اور یہ قبائلی حکومتیں ان کے زیرِ اثر اور تابع تھیں لیکن ۶۱۲ق م جب نینوی کی آشوری حکومت تباہ ہو گئی تو اگرچہ میڈیا آزاد ہو گیا اور قبائلی حکومت کی جگہ آہستہ آہستہ شاہی حکمرانی کی داغ بیل پڑنے لگی تھی تاہم بابل کے پادشاہ بختِ نصر کے قاہرانہ اقتدار کے سامنے ایران کے ابھرنے کا کوئی امکان نظر

---

[۱] تاریخ ابنِ کثیر ج ۲ ص ۱۸۲-۱۸۳ - [۲] ص ۳۱ -

نہیں آتا تھا مگران ہی حالات کے اندر ۵۵۹ ق م میں قدرت نے ایک نئی نیر یا ہخا منش خاندان کی ایک غیر معمولی ہستی کو نمایاں کیا کہ جوابتداء میں اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست انشان کا رئیس تھا مگر ۵۵۹ ق م میں حیرت زا طور پر اسکے عدل وانصاف، سیاست وتدبر، خدا ترسی اور حلم نے فارس اور ماہات دونوں حکومتوں کو بغیر جنگ وجدل کے اس کے قبضہ میں دیدیا اور دونوں حکومتوں کے قبائلی حکمرانوں نے برضا ورغبت اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا یہی وہ ہستی ہے جس کو اہلِ فارس گورش یا کے اش اور یہود خورس کہتے ہیں۔

مغربی مہم | خورس نے جب فارس اور میڈیا کی حکومتوں کو متحد کرکے فرماں روائی کا اعلان کیا تو اس سے قریب ہی زمانہ میں اس کو ایک "مغربی مہم" پیش آئی اور اس وجہ سے پیش آئی کہ خورس سے بہت پہلے میڈیا اور ایران کے مغرب میں واقع حکومت لیڈیا (ایشیاء کوچک) کے درمیان رقیبانہ جنگ ہوتی تھی مگر خورس کے معاصر لیڈیا کے بادشاہ کرڈیسس کے باپ نے خورس (گورش) کے نانا استیاگس کے باپ سے صلح کرلی تھی اور باہم ازدواجی رشتہ قائم کرکے مستقل طور سے جنگ کا خاتمہ کردیا تھا لیکن اب جبکہ خورس نے فارس اور میڈیا دونوں کو متحد کرکے ایک مضبوط سلطنت قائم کرلی تو ایشیاء کوچک کا بادشاہ کرڈیسس اس کو برداشت نہ کرسکا اور اس نے باپ کے کئے ہوئے تمام عہد وپیمان کو توڑ کر میڈیا پر حملہ کردیا تب گورش بھی مجبورًا اپنے دارالحکومت ہمدان سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور دو ہی جنگوں کے بعد تمام ایشیاء کوچک پر قبضہ کرلیا چنانچہ مشہور یونانی مؤرخ ہیرو ڈوٹس کہتا ہے کہ گورش کی یہ مہم ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پٹیریا کے معرکہ سے صرف چودہ دن کے اندر اس نے لیڈیا کے مستحکم اور مضبوط دارالحکومت کو مسخر کرلیا اور کرڈیسس قید ہوکر مجرم کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ اب اگرچہ بحر اسود تک تمام ایشیاء کوچک اس کے زیر نگیں تھا مگر پھر بھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ غربی ساحل پر جا پہنچا یعنی دارالحکومت سے چودہ سو میل فاصلہ طے کرکے مغربی کنارہ جا کھڑا ہوا۔[1]

اہلِ جغرافیہ کہتے ہیں کہ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (سائرس)

ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کی حالت یہ ہے کہ یہاں سمرنا کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیرے نکل آنے کی وجہ سے تمام ساحل جھیل کی طرح بن گیا ہے اور بحر ایجین کے اس ساحل کا پانی خلیج کی وجہ سے بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت سورج غروب ہوتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ خورس نے اگرچہ "ایشیائے کوچک" کو مردانہ وار فتح کر لیا لیکن وقت کے دوسرے بادشاہوں کی طرح اس نے ممالک مفتوحہ پر ظلم روا نہیں رکھا اور نہ ان کو وطن سے بے وطن کیا حتیٰ کہ سارڈیس کی پبلک کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلاب رونما ہو گیا ہے انقلاب ہوا مگر فقط شخصیت کا یعنی ان کو کرڈیسس کی جگہ خورس جیسا عادل بادشاہ مل گیا۔ چنانچہ ہیروڈوٹس لکھتا ہے۔

"سائرس (خورس) نے اپنی فوج کو حکم دیدیا کہ دشمن کی فوج کے سوا اور کسی انسان پر ہاتھ اٹھایا جائے اور دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے اور کرڈیسس اگر تلوار بھی چلائے تب بھی اس کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے۔ [1]

نیز حکومت کے متعلق اس کا عقیدہ وہی تھا جو ایک صالح اور نیک بادشاہ کا ہونا چاہیے چنانچہ یونانی مؤرخ ژی سیاز لکھتا ہے۔

"اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لئے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فائدہ پہنچے"۔ [2]

مشرقی مہم یہی مؤرخ ہیروڈوٹس بیان کرتا ہے کہ گورش نے ابھی بابل کو فتح نہیں کیا تھا کہ اس کو ایران کے مشرق میں ایک اہم معرکہ آرائی پیش آئی کیونکہ مشرق بعید کے بعض وحشی اور صحرانشین قبائل نے سرکشی اور بغاوت کی تھی اور یہ باختر (بکٹیریا) کے قبائل تھے اور بعض تاریخی حوالجات سے یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ جس مقام کو آج کل مکران کہتے ہیں اس جگہ کے خانہ بدوش قبائل نے یہ سرکشی کی تھی یہ مقام بلاشبہ ایران کے لئے مشرق بعید کا حکم رکھتا ہے اس لئے کہ اس کے بعد پہاڑ ہیں جنھوں نے آگے بڑھنے

[1] و [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون "سائرس"۔

کے لئے راہ روک دی ہے۔

تیسری (شمالی) مہم | بابل کی فتح کے علاوہ تاریخ گورش کی ایک اور مہم کا ذکر کرتی ہے اور یہ ایران سے شمال کی جانب پیش آئی، اس مہم میں وہ بحرِ کاسپین (خزر) کو داہنی جانب چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک پہنچا ہے، ان ہی پہاڑوں میں اس کو ایک درہ ملا ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھاٹک کی طرح نظر آتا ہے۔ اس مقام پر جب وہ پہنچا ہے تو ایک قوم نے اس سے یاجوج وماجوج قبائل کے تاراج کی شکایت کی ہے کہ وہ اس درہ میں سے نکل کر حملہ آور ہوتے اور ہماری خانماں و تاراج کرکے ہم کو برباد و تباہ کر ڈالتے ہیں چنانچہ اس نے لوہا اور تانبا استعمال کرکے اس پھاٹک کو بند کر دیا اور دھات کی ایک سد قائم کر دی جس کے آثار و نشان اس وقت بھی موجود ہیں چنانچہ ہیروڈوٹس اور زینوفن دونوں یونانی مؤرخ تصریح کرتے ہیں کہ گورش نے فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کے لئے خاص انتظامات کئے۔

اور یہ حقیقت عنقریب واضح ہو جائے گی کہ گورش کے زمانہ میں یاجوج وماجوج قبائل میں سے بھی سیتھین تھے جو حملہ آور ہو کر قریب کی آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔

فتح بابل | اب جبکہ گورش یا خورس کی فتوحات اس درجہ وسیع ہو چکی تھیں کہ ایران کے مغرب اقصٰی میں وہ بحرِ شمال سے لے کر بحیرۂ اسود (بحرِ ایجین) کے آخری ساحل تک قابض تھا اور مشرقِ اقصٰی میں مکران کے پہاڑوں تک بلکہ دارا کے رقبۂ حکومت کی تفاصیل کو مستند مان لیا جائے تو دریا۔ سندھ تک فتح کر چکا تھا[۱] اور شمال میں کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک حکمراں تھا تو اس کو عراق کی مشہور اور زبردست متمدن مگر قاہر و جابر حکومت بابل کی جانب متوجہ ہونا پڑا چنانچہ اس کی تفصیل بھی تاریخ ہی کی زبانی سنئے۔

خورس سے تقریباً پچاس برس پہلے بابل کی حکومت پر نبوکدنذر (بخت نصر) نظر آتا ہے اور اس زمانہ کے صنمی عقائد کے مطابق وہ نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ بابلی اصنام میں سے سب سے بڑے صنم کا مظہر اور دیوتا بھی سمجھا جاتا تھا اور اس لئے اس کا حق تھا کہ وہ جس حکومت کو چاہے اپنے قہر و غضب کا شکار بنا کر اس کے باشندوں کو ہولناک اور سخت عذاب میں مبتلا کرے، ان کو ہلاک کرے یا غلام بنا کر

[۱] دائرۃ المعارف بستانی جلد ۴ (ایران)۔

ان پر وحشیانہ مظالم کو روا رکھے، اس لئے اس بادشاہ کے مظالم بے پناہ اور اس کے تسخیر ممالک کا طریقہ سخت وحشیانہ تھا جیساکہ گذشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے اس نے اپنے دورِ حکومت میں یروشلم (بیت المقدس) پر تین مرتبہ حملے کئے اور فلسطین کو تباہ و برباد کر کے تمام باشندوں کو مویشیوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا ایک یہودی مؤرخ جوزیفس کہتا ہے "کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لیجاتا جس طرح بنوکدزار بنی اسرائیل کو ہنکا کر لے گیا" سلہ

بابل کی حکومت آشوری حکومت کی تباہی کے بعد اور بھی زیادہ مضبوط اور قاہر سلطنت ہوگئی تھی اور اس زمانہ میں قرب و جوار کی طاقتوں میں کسی کو بھی یہ جراءت نہیں تھی کہ وہ اس جابر حکومت کے قہر و ظلم کا استیصال کرسکیں لیکن فتح بیت المقدس کے کچھ عرصہ بعد بخت نصر مر گیا اور اس کا جانشین نابونی دس مقرر ہوا مگر اس نے حکومت کا تمام بار شاہی خاندان کے ایک شخص بیل شازار پر ڈال دیا۔ یہ شخص اگرچہ بہت عیاش اور ظالم تھا مگر بخت نصر کی طرح بہادر اور جری نہیں تھا، اس کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے قیدیوں میں سے حضرت دانیال (علیہ السلام) نے اپنی حکیمانہ فراست سے بابلی دربار کو اس درجہ مسخر کرلیا تھا کہ وہ حکومت کے مشیرِ خاص سمجھے جاتے تھے۔ حضرت دانیال نے بیل شازار کو بار بار اس کے مظالم اور عیاشانہ زندگی کے خلاف تہدید و تنبیہ کی مگر اس نے کچھ شنوائی نہیں کی حتی کہ انھوں نے حکومت کے معاملات سے کنارہ کشی کرلی۔

توراۃ کے بیان کے مطابق اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بیل شازار نے اپنی ملکہ کے اکسانے پر ایک شب یہ حکم دیا کہ یروشلم سے جو ہیکل کے مقدس ظروف بنوکدزار لوٹ کر لایا تھا وہ لائے جائیں اور ان میں شراب پلائی جائے۔ یہ جشن ہو ہی رہا تھا کہ کسی غیبی ہاتھ نے بادشاہ کے سامنے دیوار پر ایک نوشتہ لکھدیا۔ توراۃ میں ہے۔

اسی گھڑی میں کسی آدمی کے ہاتھ کی انگلیاں ظاہر ہوئیں انھوں نے شمعدان کے مقابل بادشاہی محل کی دیوار کے گچ پر لکھا اور بادشاہ نے ہاتھ کا وہ سرا جو لکھتا تھا دیکھا تب بادشاہ کا چہرہ متغیر ہوا

سلہ دائرۃ المعارف للبستانی (بابل)

اور اس کے اندیشوں نے اُسے گھبرا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور نوشتہ جو لکھا گیا سو یہ ہے منے منے تقتیل اوفرسین ۔ [1]

تب شاہ نے گھبرا کر نجومیوں اور فال گیروں کو بلایا مگر کوئی اس کا مطلب نہ بتا سکا آخر ملکہ کے مشورہ سے دانیال (علیہ السلام) کو بلایا انھوں نے اول اس کے مظالم اور اس کی عیاشی کے خلاف پند و نصیحت فرمائی پھر بتایا کہ تو نے چونکہ بیت المقدس کے ظروف کی توہین کرکے اس ظلم کی تکمیل کردی اس لئے نوشتہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا، تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا تیری مملکت پارہ پارہ ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دیدی گئی ۔ [2]

ادھر یہ واقعہ پیش آیا کہ اہل بابل عرصہ سے بیل شازار کے مظالم سے چھٹکارا پانے کی تجویزیں سوچ رہے تھے کہ ان کے بعض سرداروں نے یہ مشورہ کیا کہ قریب کی زبردست طاقت ایران سے مدد حاصل کی جائے اور اس کے عادل فرمانروا سے یہ عرض کیا جائے کہ وہ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائے اور اس کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ اہل بابل ہر طرح اس کی مدد کرنے کو آمادہ ہیں چنانچہ ۵۴۰ قم میں بابلی سرداروں کا ایک وفد خورس کے پاس اس وقت پہنچا جبکہ وہ اپنی مشرقی مہم میں مصروف تھا۔ خورس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ وہ اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر ضرور بابل پر حملہ کرے گا اور ان کو بیل شازار جیسے ظالم و عیاش بادشاہ سے نجات دلائے گا ۔ خورس جب اپنی مہم سے فارغ ہو گیا تو حسب وعدہ اس نے بابل پر حملہ کر دیا۔

تمام مؤرخین باتفاق رائے کہتے ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ ناقابل تسخیر کوئی مقام نہیں تھا اس لئے کہ اس کی شہر پناہ اس درجہ نہ صرف موٹی اور مستحکم تھی کہ کوئی فاتح اس کی تسخیر کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن خورس کی عدل گستری اور رحم کے حالات دیکھ کر بابل کی رعایا خود اس درجہ اس کی گرویدہ تھی کہ حکومت بابل کا ایک گورنر گوب ریاس خود اس کے ہمراہ تھا اور بقول ہیروڈوٹس اس ہی نے دریا میں نہر کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری جانب کر دیا اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں

---

[1] دانیال کا صحیفہ باب ۵ آیات ۲۵ - ۵ - [2] ایضاً آیات ۲۸ - ۲۵ -

داخل ہوگئی اور خورس کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی شہر فتح ہوگیا اور بیل شازار مارا گیا۔ سلہ

خورس کا مذہب خورس کے مذہب کے متعلق توراۃ اور تاریخ دونوں متفق ہیں کہ جس طرح اس نے اپنے ملک کے منقسم حصوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کر کے ایک بڑی شاہنشاہیت قائم کی اور دوسروں کی سطوت و حکومت کے تابع ہونے کی بجائے بابل و نینوی کی زبردست طاقتوں کو اپنا تابعِ فرمان بنایا اور جس طرح وقت کے جابر و قاہر شاہنشاہوں کے برعکس اس نے عدل و رحم پر اپنی حکومت کو مستحکم اور استوار کیا اسی طرح وہ دین و مذہب کے بارے میں بھی ایران کے مروجہ مذہب کے خلاف دینِ حق کا تابع اور ایمان باللہ اور توحیدِ الٰہی کا داعی تھا۔

چنانچہ عزرا (عزیر علیہ السلام) کی کتاب میں تعمیر بیت المقدس سے متعلق اس کا یہ واضح اور صاف اعلان مذکور ہے۔

اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلم بند بھی کرایا۔ فرمایا: شاہِ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لئے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے؟ اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔ سلہ

مجھ خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے . . . . . اور خدا کے گھر کے سنہرے اور روپہلے برتن بھی جنھیں بنوکدنذر

سلہ اس مقام پر توراۃ نے دارا کو فاتح بابل کہا ہے یہ سخت التباس ہے جو توراۃ کے بیان میں پیدا ہو گیا ہے اور جگہ جگہ خورس کی جگہ دارا اور دارا کی جگہ خورس کا ذکر کر کے معاملہ کو خلط ملط کر دیا ہے دراصل بابل کو پہلے خورس ہی نے فتح کیا ہے اس کے انتقال کے بعد جب اہلِ بابل نے بغاوت کر دی تو دارا نے دوبارہ حملہ کر کے اس بغاوت کو فرو کیا۔ سلہ باب آیا ۱ تا ۳۔

یروشلم کی ہیکل میں سے نکال لایا . . . . . اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ میں پہنچائے جائیں اور خدا کے گھر میں رکھے جائیں۔ [۱]

غورس کی منادی اور نوشتہ کے نشان زدہ جملوں کو پڑھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ ان مضامین میں صرف یہ اعلان نہیں ہے کہ یہود کو نجات دلا کر بیت المقدس کی تعمیر کی بھی اجازت دیجاتی ہے بلکہ اس سے زیادہ یہ بھی ہے کہ مجھ کو خدا نے یہ حکم کیا ہے کہ میں اس کا گھر دوبارہ تعمیر کروں اور یہ کہ خدا اسی ہستی کا نام ہے جو یروشلم کا خدا ہے اور بیت المقدس خدا کا مقدس گھر ہے۔

اب اسی کے ساتھ اس کے جانشین دارائے اول کا وہ فرمان بھی ملاحظہ ہو" جو یہودیوں کی اس عرضی کے جواب میں دیا گیا ہے جس میں بعض صوبہ داروں کی شکایت تھی کہ وہ بیت المقدس کی تعمیر میں آڑے آتے ہیں" دارا لکھتا ہے۔

"پس نہر پار کے صوبہ دار تتنی اور ستر بوزنی اوران کے افارسکی رفیق جو نہر پار ہوں . تم وہاں سے دور ہوجاؤ، تم اس بیت اللہ کے کام میں دست اندازی مت کرو، یہودیوں کا ناظم اور یہودیوں کے بزرگ لوگ خدا کے گھر کو اس کی جگہ تعمیر کریں . . . . . . پر وہ خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوں غارت کرے۔ میں دارا حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہئے" [۲]

اس فرمان میں دارا نے بلند آہنگی کے ساتھ یہ ظاہر کیا ہے کہ بیت المقدس بلاشبہ بیت اللہ ہے اور وہ بددعا کرتا ہے کہ بادشاہ ہو یا معمولی شخص جو بھی اس بیت اللہ کو خراب کرنے کا ارادہ کرے خدا اس کو غارت کر دے۔

توراۃ کی ان صاف اور واضح شہادتوں کے بعد "جو خورس کا مسلمان ہونا ظاہر کرتی ہیں" یہ چند تاریخی شہادتیں بھی قابل مطالعہ ہیں۔

دارا نے اپنے زمانۂ حکومت میں ایک اہم تاریخی کام یہ کیا ہے کہ پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں پر کتبے

---

[۱] باب ۶ آیات ۵-۱ - [۲] عزرا باب ۶ -

نقش کرادیئے ہیں جو اس کے اور خورس کے عہدِ زریں کو روشنی میں لاتے ہیں، ان مختلف کتبات میں سے ایک کتبہ ایران کے مشہور شہر اصطخر میں دریافت ہوا ہے، یہ کتبہ قدیم تاریخ کا نادر ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں دارا نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور صوبوں کے نام تک گنا دیئے ہیں اور ایسی تفصیلات دی ہیں جن سے اس کے مذہب و عقیدہ اور طریقِ حکومت تک پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اسی کتبہ میں دارا کا یہ عقیدہ مذکور ہے۔

"خدائے برتر اہورموزدہ ہے اس نے زمین پیدا کی، اسی نے آسمان بنایا، اسی نے انسان کی سعادت بنائی اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمراں اور آئین ساز بنایا ہے"

"اہورموزدہ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے بادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن و امان قائم کیا۔ میں اہورموزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے، میرے خاندان کو اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے۔ اے اہورموزدہ میری دعا قبول کر!"

"اے انسان! اہورموزدہ کا تیرے لئے حکم ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر، صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ، گناہ سے بچتا رہ!" [۱]

دارا کے کتبات میں اصطخر کے کتبہ سے بھی زیادہ اہمیت اس کے "کتبۂ بے ستون" کو حاصل ہے، اس میں اس نے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنے سریر آرائے سلطنت ہونے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

دارا نے اس کتبہ میں گوماتہ کو موگوش (مجوسی) اور اس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہونے کو اہورموزدہ کے فضل کی جانب منسوب کیا ہے اور ہیروڈوٹس اور دوسرے یونانی مؤرخ یہ اور اضافہ کرتے ہیں کہ دارا کے خلاف یہ بغاوت میڈیا (ایران) کے قدیم مذہب کے پیروؤں (مجوسیوں) کی جانب سے ہوئی تھی۔ دارا کے زمانہ میں گوماتہ کے علاوہ پراورتیش اور چترتخمہ دو اور مجوسیوں (موگوشوں) نے علم بغاوت بلند کیا اور دارا کے ہاتھ سے پہلا ہمدان میں اور دوسرا اربیل میں قتل ہوا۔ [۲]

[۱] ترجمان القرآن ماخوذ از "جارالیسن سن" فاتوگریٹ مانیرز آف دی انشینٹ ایسٹرن - [۲] دائرۃ المعارف بستانی ج ۲

پھر خورس اور دارا کے "مومن" ہونے اور ایران کے قدیم مذہب "مجوسی" سے بیزار رہنے پر سب سے بڑی شہادت دارا کا وہ تبلیغی اعلان ہے جو اس نے دانیال (علیہ السلام) کے دشمنوں کے خلاف اس وقت شائع کیا تھا جبکہ دانیال نبی کو ان کے دشمنوں نے شیر ببر کے سامنے ڈال دیا تھا اور حضرت دانیال معجزانہ طور پر صحیح و سالم بچ گئے تھے۔

تب دارا بادشاہ نے ساری قوموں اور گروہوں اور اہلِ لغت کو جو روئے زمین پر بستے تھے نامہ لکھا:۔

"تمہاری سلامتی ترقی پائے، میں یہ حکم کرتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانی ایل کے خدا کے آگے ترساں و لرزاں ہوں کیونکہ یہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال ہے اور آخر تک رہے گی، وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے، اور آسمان اور زمین میں وہی نشانیاں دکھلاتا اور عجائب و غرائب کرتا ہے اسی نے دانی ایل کو شیر ببروں کے چنگل سے چھڑایا ہے۔ پس یہ دانی ایل، دارا کی سلطنت اور خورس فارسی کی سلطنت میں کامیاب رہا۔" [1]

ان تاریخی مصادر سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دارا اور اس کے پیشرو خورس کا مذہب، ایران کے قدیم مذہب "موگوش" [2] (مجوسی مذہب) سے جدا اور مخالف تھا اور یہ کہ دارا جس ہستی کو اہورموزدہ کہکر پکارتا ہے اور اس کے جو اوصاف بیان کرتا ہے اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کا پیشرو دینِ حق" پر تھے اور عربی کا "اللہ" سریانی کا "الوہیم" اور عبرانی کا "ایل" اور ایران کا "اہورموزدہ" ایک ہی مقدس ہستی کے نام ہیں۔ کیونکہ دارا کہتا ہے کہ وہی یکتا و بے ہمتا ہے اور وہی خالق کائنات ہے اور خیر و شر تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نیز وہ توحید خالص پر ایمان کے ساتھ ساتھ آخرت پر ایمان رکھتا اور صراطِ مستقیم کی تلقین اور گناہوں سے اجتناب کی تعلیم کا اظہار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ عقائد کی یہ تفصیلات مجوسی مذہب کے بالکل خلاف ہیں۔ اور اسی لئے دارا مجوسیوں پر کامیابی حاصل کرنے کو اہورموزدہ کا فضل و کرم قرار دیتا ہے۔

رہا یہ امر کہ خورس اور دارا وقت کے کس مذہب حق کے پیرو تھے؟ تو اس کا جواب مختصری تمہید

---

[1] دانیال کی کتاب باب آیات ۲۸-۲۵۔ [2] موگوش فارسی لفظ ہے اور مجوس اس کا معرب ہے۔

کے بعد بآسانی دیا جا سکتا ہے۔

ایرانِ قدیم کا مذہب

ادیان و مذاہب کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وسط ایشیا کی آرین قوموں کا مذہبی تخیل بنیادی طور پر ہمیشہ سے مشترک رہا ہے اور یہ سب مظاہرِ قدرت کے پرستار اور اصنام پرستی کے ذریعہ اس عقیدہ کے علمبردار نظر آتے ہیں پھر آہستہ آہستہ آسمان پر سورج کو اور زمین پر آگ کو تقدیس کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں یہی دونوں روشنی اور حرارت کا مبدا ہیں اور روشنی اور حرارت ہی عالم کے تمام نظام میں کارفرما ہے چنانچہ قدیم یونان، ہندوستان اور ایران وغیرہ کے مذاہب میں یہ چیز مشترک نظر آتی ہے البتہ جزئیات میں یہ فرق رہا ہے کہ مثلاً یونان اور ہندوستان کے ضمنی عقائد میں دیوتاؤں کو اچھائی اور برائی دونوں پر قدرت حاصل ہے لیکن ایران کے اصنامی عقیدہ کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ کائنات کا تمام نظام دو مخالف قوتوں کی کارفرمائی میں ہے ایک خیر اور ... کے دیوتا ہیں جو خیر اور تمام بھلائی کے مالک و متصرف ہیں اور دوسرے شر اور بدی کے دیوتا ہیں جن سے صرف بدی اور برائی کا صدور ہوتا ہے یعنی خالقِ خیر ایک جدا قوت ہے اور خالقِ شر دوسری قوت اور تمام عالم پر ان ہی دو متضاد قوتوں کی حکومت ہے اور ان ہی کے تصادم پر نظام کائنات میں خیر و شر کا غلبہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے یہاں خدائے واحد کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور چونکہ وہ خیر کو روشنی اور شر کو تاریکی خیال کرتے ہیں اس لئے آگ کو روشنی کا مبدء قرار دے کر یزداں (خیر کا دیوتا) کی قربت حاصل کرنے کے لئے قابلِ پرستش سمجھا گیا اور آتش پرستی کو مذہب کا جزءِ اعظم بنا لیا گیا۔

چنانچہ فارس اور میڈیا یعنی ایران کا یہی قدیم مذہب تھا جس کے پیرو موگوش (مجوس) کہے جاتے تھے

ایران اور مذہب زردشت

لیکن تقریباً ۶۶۰ ق م اور ۵۸۳ ق م کے درمیان شمال مغربی ایران یعنی قفقاز اور آذربیجان کے اس نواح میں جو وادی ارس کے نام سے مشہور ہے ایک ملہم من اللہ ہستی کا ظہور ہوا یہ ابراہیم زردشت کی شخصیت تھی انھوں نے ایران کے مجوسیوں میں دینِ الٰہی کا اعلان کیا اور رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا۔

انھوں نے بتایا کہ کائنات میں خیر و شر کے دیوتاؤں کا تصور باطل ہے بلکہ سارے عالم پر

صرف ایک ہی ہستی بلا شرکتِ غیرے مالک اور متصرف ہے وہ یکتا و بے ہمتا ہے، قدیر و حلیم ہے نور و قدوس ہے، اور یہ اہور موزدہ کی پاک ہستی ہے، یہی تمام کائنات کی خالق ہے تم جن کو خیر کے دیوتا سمجھتے ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ اہور موزدہ کی مخلوق اور اس کے حکم سے اہور خیر کے کارپرداز "امش اسپند" (فرشتے) ہیں اور تم نے جن کو شر کا دیوتا سمجھ لیا ہے وہ سرتاسر باطل کے سوا کچھ نہیں بلکہ یہاں شر کا مرکز اسی اہور موزدہ کی مخلوق "اہرمن" (شیطان) کی ہستی ہے۔ یہی انسانوں کے دلوں میں شر کو بھڑکا کر تاریکی کی جانب لے جاتی ہے۔ "انسان" ان دو متضاد اثرات میں گھرا ہوا ہے اور اہور موزدہ نے اس کو اپنے سچے نبیوں کے ذریعہ روشنی اور تاریکی دونوں کے اثرات سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے پس آگ کی پرستش محض گمراہی ہے اور انسانی شقاوت و سعادت کا معاملہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم (آخرت) ہے اور وہاں دو جدا جدا مقامات ایک نکوکاروں کے لئے اور دوسرا بدکاروں کے لئے ہے اس لئے ہم کو گناہوں سے پرہیز کرنا اور نیکی کو اختیار کرنا چاہیے اور اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہیے۔

یہ تھی ابراہیم زردشت کی وہ تعلیم جس کے متعلق آج عرب اور یورپ کے محقق مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اواخر چھٹی صدی قبل مسیح میں یہ آواز زردشت کی زبانی میڈیا اور فارس کے قدیم مذہب کے خلاف ایران میں سنی گئی۔[1]

یہی مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ ابراہیم زردشت، دانیال اکبر یا ارمیاہ (علیہما السلام) کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے اور ایران کے قدیم مذہب کی ہدایت کے لئے مبعوث کئے گئے۔

ابراہیم زردشت کی تعلیم "دینِ حق کی تعلیم" تھی اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ان پر نازل شدہ الہامی کتاب "اوستا" کے مضامین کی ابتدا ایسے ہی جملوں سے ہوتی ہے جن کا مفہوم سچی الہامی کتابوں میں مشترک پایا جاتا ہے یعنی شیطانی وساوس سے پناہ اور خدائے رحمان و رحیم کی مدح و ثنا، چنانچہ قرآن سے قبل کی الہامی کتابوں کی طرح اگرچہ "اوستا" بھی محرف ہو چکی ہے تاہم اس میں

[1] حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸ و یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ مقالہ پروفیسر گرنڈ ج ۲ ص ۱۱۳۔

یہ جملے اب بھی محفوظ ہیں جن سے مضامین کی ابتداء ہوتی ہے اور ساتیر آسمانی میں ان کو اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

(۱) ہوزامیم فہ مزدان ہزہزاس ہرشیور ہر دیور۔ پناہیم بیزداں (اہورموزدہ) ازمنش زشت و خوے بدگمراہ کنندہ بدراہ ناخوب برندہ، رنج دہندہ، آزار رسانندہ (یعنی شیطان)۔

(۲) فہ شید شمتای ہرشندہ ہرششگر زمرہان فرابیدور۔ بنام ایزد بخشایندہ بخشائشگر مہربان، دادگر۔

اب اگر اسی کے ساتھ خورس (کیخسرو) اور داریوش (دارا) کے ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو توراۃ میں بیت المقدس کی تعمیر سے متعلق ہیں اور ان کتبات کی عبارات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے جو دارا کی جانب سے منقوش کئے گئے ہیں اور جن میں مجوسی عقاید کے خلاف خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے تو پھر یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے کہ خورس، اس کے بیٹے کیقباد دوم[1] (کم بی سیز) اور دارا کا مذہب بلاشبہ ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف دینِ حق کا مذہب تھا اور جبکہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابراہیم زروشت اور خورس (کے ارش) کا زمانہ ایک رہا ہے اور خورس اور دارا کے عقائد زردشت کی تعلیم کے عین مطابق ہے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خورس پہلا بادشاہ ہے جس نے ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف اس دینِ حق کو قبول کیا اور کچھ تعجب نہیں کہ یہود کو خورس کے ساتھ اس درجہ شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ خورس ایسے مذہب کا پیرو تھا جو ان کے نبی دانیال اکبر یا یرمیاہ (علیہما السلام) کے شاگرد اور فیض یافتہ ہادی (زردشت) کی جانب منسوب ہے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ زردشت کی تعلیمِ حق کو ایران زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور دارا پر حملۂ اسکندر کے بعد یعنی ایران کے پہلے عہدِ تاریخی کے ختم پر وہ بھی مسخ اور محرف کر دیا گیا چنانچہ مؤرخین کا بیان ہے کہ ۳۳۰ق م کے بعد زردشتی مذہب کا انحطاط شروع ہو گیا اور ایک جانب

---

[1] کم بی سیز (کیقباد) خورس کے باپ کا نام بھی ہے اور بیٹے کا بھی۔

روم و یونان کے خارجی اثرات نے اس کو متاثر کیا اور دوسری جانب ایران کے قدیم مذہب "مجوس" نے دوبارہ سر اٹھایا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دارا کے قتل کے بعد ہی اس کے اصل خدوخال بگڑنے لگے اور اس میں تحریف و مسخ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ قدیم مجوسی مذہب کے امتزاج کے ساتھ اس نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ اور اب یہی مجوسی مذہب کے نام سے موسوم ہے۔

ایرانیوں (پارسیوں) کا اپنا بیان ہے کہ جب سکندر مقدونی نے اصطخر پر حملہ کیا تو اس نے شہر کو آگ لگا دی اور اس میں زردشت کا مقدس صحیفہ "اَوِستا" جل کر راکھ ہو گیا، گویا بیت المقدس پر حملہ کے وقت جو معاملہ بخت نصر نے یہود کی مقدس کتاب توراۃ کے ساتھ کیا وہی سکندر نے اوستا کے ساتھ کیا اور اس طرح دونوں مذاہب کے مقدس صحیفے دنیا سے مفقود ہو گئے۔ دائرۃ المعارف البستانی جلد

پھر تقریباً پانچسو سال کے بعد ایران کے تیسرے تاریخی عہد میں ساسانی حکومت کے بانی اردشیر بابکانی نے از سرِ نو "اَوِستا" کو مرتب کرایا پس ظاہر ہے کہ اب یہ صحیفہ "اصل اوستا" نہیں ہے بلکہ قدیم ایرانی مذہب، یونانی مذہب اور زردشتی مذہب کا ایک معجون مرکب ہے بلکہ اس کے نمایاں عقائد و اعمال بیشتر قدیم مجوسیت ہی سے ماخوذ نظر آتے ہیں۔ تاہم اس صحیفہ کا جو ناقص اور محرف حصہ آج پارسیوں کے ہاتھ میں ہے اس میں اصل مذہب کی جھلک اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے جس کے بعض حوالجات ہم اصحاب الرس کے واقعہ میں نقل کر چکے ہیں۔

مسلمانوں نے جب خیر القرون میں ایران کو فتح کیا تو ان کو ان ہی پیروان زردشت سے واسطہ پڑا جو صحیح دینِ زردشتی چھوڑ کر قدیم مجوسی مذہب پر واپس ہو چکے تھے اور ان میں ایک نبی اور اس کی کتاب کے تصور کے علاوہ کوئی بات زردشتی مذہب کی باقی نہیں رہی تھی اور اسی بنا پر قرآن نے بھی ان کو "مجوس" ہی کہہ کر ذکر کیا ہے اس لئے متقدم عرب مؤرخین نے یہ سمجھ لیا کہ مجوسی مذہب اور زردشتی مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس کے باوجود بعض متقدم محقق اور اصحابِ سیرۃ

ؔ۱ کیونکہ اس جدید مرکب مذہب میں بھی آتش پرستی مذہب کی بنیاد تھی اور اس کا پجاری اور مہنت اب بھی "مغ" ہی کہلاتا تھا اور مغ، موگوش اور مجوش ایک ہی شے ہیں۔

اس قدر پتہ دے سکے ہیں کہ ایران میں دو مذاہب نے یکے بعد دگرے اپنا اثر قائم کیا ہے۔ ایران اول "صابی مذہب" رکھتا تھا اور اس کے بعد اس نے زردشتی مذہب قبول کیا۔ لغتِ عرب میں "صابی" کے معنی "بددین" کے ہیں چنانچہ قریش مکہ اسی بنا پر اپنے خیال میں مسلمانوں کو صابی کہا کرتے تھے اس لئے "صابی" سے ان حضرات کی مراد غالباً اُسی مذہبِ قدیم سے ہے جو آتش پرستی، بت پرستی اور دیوتا پرستی پر قائم تھا۔

متاخرین علماء میں سے شاہ عبدالقادر نوراللہ مرقدہٗ بھی تردد کے ساتھ "المجوس" کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں "مجوس آگ پوجتے ہیں اور ایک نبی کا نام بھی لیتے ہیں معلوم نہیں پیچھے بگڑے یا سرے سے غلط ہیں۔" مگر آج عرب اور یورپ کے محققین اہلِ تاریخ بغیر کسی تردد کے دلائل و براہین کی روشنی میں اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ زردشت کا مذہب ایران کے قدیم مذہب سے جدا "دینِ حق" تھا جس میں مظاہر پرستی، اصنام پرستی، آتش پرستی سب ممنوع تھی اور خدائے واحد کی پرستش کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں تھی۔

چنانچہ مصر کے مشہور عالم فرج اللہ زکی نے اُس قول کی پرزور تردید کی ہے[۱] جس میں یہ کہا گیا ہے کہ زردشت نے اول یرمیاہ (علیہ السلام) کی شاگردی کی مگر جب کسی بات پر یرمیاہ نبی اس سے خفا ہوگئے تو وہ ان سے جدا ہوگیا اور آتش پرستی کا ایک نیا مذہب ایجاد کرلیا، ابنِ کثیرؒ نے بھی اس قول کو "قیل" کہہ کر نقل کیا ہے یعنی وہ بھی اس کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے۔

ذوالقرنین اور قرآنِ عزیز

ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں اگرچہ دو اہم مباحث یعنی "ذوالقرنین سے متعلق توراۃ کی پیشینگوئیاں اور تاریخی شہادتیں" سپردِ قلم ہوچکے لیکن ابھی ایک اہم مسئلہ یہ باقی ہے کہ کیا وہ شخصیت جس کے لئے توراۃ اور تاریخ سے روایات و شہادات پیش کی گئی ہیں درحقیقت قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہی کی شخصیت ہے؟ تو اس کے جواب سے قبل قرآنِ عزیز کی ان آیات کو پیش کردینا ضروری ہے جو سورۂ کہف میں اس واقعہ سے متعلق بیان کی گئی ہیں تاکہ بعد میں تطبیق کا

---

[۱] حاشیہ تاریخ ابنِ کثیر ج ۲ ص ۴۸۔

مسئلہ بخوبی واضح ہو سکے۔

قرآن عزیز (سورۂ کہف) میں ذوالقرنین کا واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ	(اے پیغمبر!) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں
قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝	تم کہہ دو۔ میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام الٰہی میں) پڑھ کر سنا دیتا
اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ	ہوں۔ ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی نیز اس کے لئے
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝ فَاَتْبَعَ سَبَبًا	ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔ تو (دیکھو) اس نے
حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ	(پہلے) ایک مہم کے لئے ساز و سامان کیا (اور پچھم کی طرف
وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ	نکل کھڑا ہوا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے
وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۝ قُلْنَا	کی جگہ پہنچ گیا وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک
يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ	سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے اور اس کے قریب
تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ	ایک گروہ کو بھی آباد پایا۔ ہم نے کہا۔ اے ذوالقرنین! (اب
فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ	یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں) تو چاہے انھیں عذاب میں ڈالے
ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ	چاہے اچھا سلوک کرکے اپنا بنالے۔ ذوالقرنین نے کہا" ہم
يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ	ناانصافی کرنے والے نہیں۔ جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا
عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ	دینگے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بد
اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ	اعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کریگا اور جو ایمان لائے گا
جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ	اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلے اسے بھلائی ملے گی اور
لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ	ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جن میں اس کے لئے
سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ	راحت و آسانی ہو" اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی
الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ	اور (پورب کی طرف) نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی
عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ	آخری حد تک پہنچ گیا اس نے دیکھا سورج ایک گروہ پر

مِنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ ۚ
وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝
ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ
بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ
دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ
يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا
يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ
مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى
الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا
عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ
سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ
خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِىْ
زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى
بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ
حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ
قَالَ اٰتُوْنِىْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ
قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ
يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا
لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا
رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ ۚ

نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے، معاملہ یونہی تھا
اور جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اس کی ہمیں پوری خبر ہے۔
اس نے پھر ساز و سامان تیار کیا (اور تیسری مہم میں نکلا) یہانتک
کہ دو (پہاڑوں کی) دیواروں کے درمیان پہنچ گیا، وہاں اس نے
دیکھا پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات
کہی جائے تو کچھ نہیں سمجھتی۔ اس قوم نے (اپنی زبان میں) کہا،
"اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آکر لوٹ مار کرتے
ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک
روک بنادیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لئے کچھ خراج مقرر
کردیں" ذوالقرنین نے کہا "میرے پروردگار نے جو کچھ میرے
قبضہ میں دے رکھا ہے، وہی میرے لئے بہتر ہے (تمہارے خراج
کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں) میری مدد کرو
میں تمہارے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار
کھڑی کردوں گا" اس کے بعد اس نے حکم دیا "لوہے کی سلیں
میرے لئے مہیا کردو" پھر جب (تمام سامان مہیا ہوگیا اور)
دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کردی
تو حکم دیا (بھٹیاں سلگاؤ اور) اسے دھونکو پھر جب (اس قدر
دھونکا گیا کہ) بالکل آگ (کی طرح لال) ہوگئی، تو کہا "گلا ہوا تانبا
لاؤ اس پر انڈیل دیں" چنانچہ (اسی طرح) ایک ایسی سد بن گئی
نہ تو (یاجوج و ماجوج) اس پر چڑھ سکتے تھے نہ اس میں سرنگ لگا
سکتے تھے! ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا "یہ (جو کچھ ہوا)

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ	تو فی الحقیقت، میرے پروردگار کی مہربانی ہے جب میرے پروردگا
جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ	کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئے گی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ
وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ۝ وَتَرَكْنَا	ریزہ کردے گا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے
بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ	ٹلنے والی نہیں! اور اس دن ہم ایسا کریں گے کہ ان میں سے ایک
بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ	قوم دوسری قوم پر موجوں کی طرح آپڑیں گی اور پھونکا جائیگا
فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝	نرسنگھا (صور) پس اکٹھا کریں گے ہم ان کو۔

قرآنِ عزیز کی ان آیات میں ذوالقرنین کا جو واقعہ مذکور ہے اگر اس کو ان واقعات کے ساتھ تطبیق دیجیے جو گذشتہ صفحات میں توراۃ اور تاریخ قدیم کے حوالجات سے نقل کئے گئے ہیں تو آپ خود یہ فیصلہ دینگے کہ تاویلات، تخمینی قیاس آرائیوں اور غیر معلوم احتمالات سے محفوظ رہ کر ذوالقرنین کا اطلاق خورس کے سوا اور کسی شخصیت پر نہیں ہوتا۔

مگر اس فیصلہ کی حقیقت پر عبور حاصل کرنے کے لئے از بس ضروری ہے کہ سورۂ کہف کی زیرِ مطالعہ آیات کے مطالب کا تجزیہ کرکے ان کے ساتھ خورس سے متعلق تاریخی واقعات کی مطابقت کو واضح اور روشن کر دیا جائے۔

پس ذوالقرنین کے متعلق قرآنِ عزیز نے کن حقائق کا اظہار کیا ہے اور خورس سے متعلق واقعات کس طرح ان حقایق کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں سطورِ ذیل میں ترتیب وار قابلِ مطالعہ ہیں۔

(۱) قرآنِ عزیز کا اسلوبِ بیان کہتا ہے کہ اس نے ذوالقرنین کا واقعہ دوسروں کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور سوال کرنے والوں نے اسی لقب کے ساتھ اس کو یاد کیا ہے۔ قرآن نے اپنی جانب سے یہ لقب تجویز نہیں کیا۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَیْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝ (اے پیغمبر!) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں۔ تم کہدو! میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلامِ الٰہی میں) پڑھ کر سناتا ہوں۔

(تطبیق (۱)) صحیح روایات سے یہ ثابت ہو چکا کہ یہ سوال یہودیوں کی تلقین سے قریشِ مکہ نے کیا تھا اور سوال میں یہ مذکور تھا کہ ایسے بادشاہ کا حال بتاؤ جو مشرق و مغرب میں پھر گیا اور جس کو توراۃ

میں صرف ایک جگہ اس لقب سے یاد کیا گیا ہے اور توراۃ یہ کہتی ہے کہ دانیال علیہ السلام کے مکاشفہ میں ایران کے ایک بادشاہ کو ایسے مینڈھے کی شکل میں دکھایا گیا جس کے دو سینگ نمایاں تھے اور جبریل فرشتہ نے اس دو سینگوں والے مینڈھے (ذوالقرنین) کی تعبیر یہ دی کہ اس سے وہ بادشاہ مراد ہے جو فارس اور میڈیا دو بادشاہتوں کا مالک ہوگا اور یسعیاہ نبی کی پیشنگوئی اور تاریخ دونوں اس پر متفق ہیں کہ ایران کا یہ بادشاہ خورس تھا جس نے فارس اور میڈیا دونوں کو ملا کر شاہنشاہی کی، یہودیوں کو اس سے اس لئے دلچسپی تھی کہ ان کے انبیاء علیہم السلام کے الہامات کے مطابق وہ ان کا نجات دہندہ تھا۔ چنانچہ یہودیوں کا دیا ہوا یہ لقب "ذوالقرنین" خود ایران کے شاہی خاندان میں اس درجہ مشہور و مقبول ہوا کہ انھوں نے خورس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنایا تو اس میں بھی تاریخی یادگار کے طور پر دانیال علیہ السلام کے خواب کو مصور کر کے دکھایا اور چونکہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں ایک جگہ اس کو عقاب بھی کہا گیا ہے۔

"میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں جو ابتداء سے انتہا تک احوال اور قدیم وقتوں کی باتیں جو اب تک پوری نہیں ہوئیں بتاتا ہوں اور جو کہتا ہوں میری مصلحت قائم رہے گی اور میں اپنی ساری مرضی پوری کروں گا جو عقاب کو پورب سے لاؤں گا اس شخص کو جو میرے ارادوں کو پورا کرے گا۔[1]

اس لئے اصطخر کے قریب خورس کا جو سنگی مجسمہ نکلا ہے اس کو اس مجموعی تخیل ہی پر بنایا گیا ہے کہ اس کے سر کے دونوں جانب دو سینگ ہیں اور سر پر ایک عقاب ہے اور خورس کے سوا دنیا کے کسی بادشاہ کے متعلق یہ تخیل موجود نہیں ہے۔

پس یہ دلیل ہے اس امر کی کہ یہود کو اپنے نجات دہندہ، خدا کے مسیح اور خدا کے چرواہے کے ساتھ اس درجہ دلچسپی تھی کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا معیار اس بادشاہ کے واقعات کے علم کو قرار دیا۔ اور اسی کے پیش نظر قرآن نے اس بادشاہ (خورس) کا مناسب حال ذکر کیا۔

(۲) قرآن کہتا ہے کہ وہ بہت صاحب شوکت بادشاہ تھا اور خدا نے اس کو ہر قسم کے ساز و سامان

---

[1] باب ۴۶ آیات ۹-۱۱۔

حکومت سے نوازا تھا۔ "اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا۔ ہم نے اس کو حکمرانی عطا کی اور اس کے لئے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔"

(ت۔۲) خورس (گورش) کے متعلق توراۃ اور قدیم و جدید تاریخی حوالوں سے یہ ثابت ہو چکا کہ اس نے نہ صرف ایران کی مختلف قبائلی حکومتوں کو ہی ایک شاہنشاہی میں منسلک کر دیا تھا بلکہ بابل و نینوی کی عظیم الشان حکومتوں پر بھی قابض ہو کر اپنی جغرافیائی حیثیت میں ایسی وسیع مملکت کا مالک ہو گیا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے اس کو تمام ساز و سامانِ زندگی و حکومت سے مالامال کر دیا۔

(۳) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے تین قابلِ ذکر مہم سرکی ہیں۔

(ت۔۳) معتبر تاریخی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ خورس نے تین قابلِ ذکر مہم سرکیں۔

(۴) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے پہلے پچھم (مغرب) کی جانب ایک مہم سر کی۔ "فَاَتْبَعَ سَبَبًا حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ" پس اس نے (ایک مہم کے لئے) ساز و سامان کیا، اور پچھم کی جانب نکل کھڑا ہوا، یہاں تک کہ چلتے چلتے سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچا وہاں اُسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے۔"

(ت۔۴) یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس اور بعض دوسرے مؤرخین کے حوالے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خورس کو سب سے پہلی اور اہم مہم پچھم کی جانب پیش آئی جبکہ لیڈیا (ایشیارِ کوچک) کے بادشاہ کرڈلیس کے غدارانہ طرزِ عمل کے خلاف اس کو لیڈیا پر حملہ کرنا پڑا، یہ مقام ایران سے جانبِ مغرب واقع ہے اور اس کا دارالحکومت "سارڈلیس" ایشیارِ کوچک کے آخری مغربی ساحل کے قریب آباد تھا، بقول ہیروڈوٹس خورس کی یہ مہم ایسی معجزانہ انداز میں تھی کہ وہ مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا چودہ روز کے اندر ایشیارِ کوچک کے آخری ساحل پر جا کھڑا ہوا اور سارڈلیس جیسے محکم و مضبوط شہر کو تسخیر کر لیا۔ اب اس کے سامنے سمندر کے سوا اور کچھ نہ تھا، سمرنا کے قریب بحر ایجین (Aegan Sea.) کا یہی وہ ساحل ہے جو اپنے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے رکھنے کی وجہ سے جھیل بن گیا ہے اور اس کا پانی بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت جب سورج ڈوبتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا سیاہ دلدل میں

ڈوب رہا ہے" تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ"۔

(۵) قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں کی قوم پر ذوالقرنین کو ایسا غلبہ دے دیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے ان کے ساتھ معاملہ کرے، چاہے ان کی بغاوت کی پاداش میں ان کو سزا دے اور چاہے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کر کے ان کو معاف کر دے۔" وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا، قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا"

(ت ۔ ۵) تاریخی حوالوں اور ہیروڈوٹس اور زینوفن کے تاریخی اقوال سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ خورس (کے ارش) نے لیڈیا کو فتح کر کے عام بادشاہوں کی طرح اس کو برباد نہیں کیا بلکہ عادل، نیک اور صالح بادشاہ کی طرح عفو کا اذن عام کر دیا اور ان کو بے وطن نہیں ہونے دیا۔ بلکہ کرڈیسس کی گرفتاری کے سوا یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلاب حکومت ہوا ہے البتہ کرڈیسس کی جراءت مردانہ کے امتحان کے لئے اول اس کو چتا میں جلانے کا حکم دیا مگر جب وہ مردانہ وار چتا کے اندر بیٹھ گیا تو اس کو بھی معاف کر دیا اور اس کے ساتھ اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا۔

(۶) قرآن نے ذوالقرنین کا جو مقولہ نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومن بھی تھا اور "عادل و صالح" بھی۔ وہ کہتا ہے۔ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلٰى رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ۝ وَأَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝ ۔ ذوالقرنین نے کہا: "ہم ناانصافی کرنے والے نہیں ہیں جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلہ میں اس کو بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لئے آسانی و راحت ہو۔

(ت ۔ ۶) توراۃ میں خورس کا یروشلم سے تعلق فرمان، اور دارا کے کتبات و اعلانات مذکورہ توراۃ، "اوستا" کی اندرونی شہادت، اور تاریخی بیانات، یہ سب شہادتیں ناقابل انکار حد تک یہ ثابت کرتی ہیں کہ خورس اور دارا مومن تھے اور وقت کے سچے دین کے پیرو بلکہ اس کے مبلغ و منادی تھے۔ وہ

ابراہیم زردشت کے تبع، خدائے واحد کے پرستار اور آخرت کے قائل تھے اور ان کا دین انبیاء بنی اسرائیل ہی کی تعلیم کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا جو دارا کے بعد بہت ہی جلد محرف و مسخ ہو کر رہ گیا۔

(۷) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے دوسری مہم مشرق (پورب) کی جانب سر کی اور وہ چلتے چلتے جب سورج نکلنے کی آخری حد پر پہنچا تو اس کو وہاں خانہ بدوش قبائل سے واسطہ پڑا۔ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا۝ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا۝ اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور پورب کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا سورج ایک ایسے گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔

(ت۔۷) تاریخ کہتی ہے کہ خورس کو دوسری قابلِ ذکر مہم مشرق (پورب) کی جانب پیش آئی جبکہ مکران کے خانہ بدوش قبائل نے سرکشی کی، جو کہ اس کے دارالحکومت سے اقصائے مشرق میں پہاڑی علاقہ تک آباد تھے اور جن سے متعلق مہم کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں بیان کی جا چکیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ قرآن عزیز نے ذوالقرنین کی مغربی اور مشرقی قابلِ ذکر مہمات کے لئے "مغرب الشمس" اور "مطلع الشمس" کی تعبیر اختیار کی ہے اس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ذوالقرنین ساری دنیا کا بلاشرکت غیرے حکمراں بن گیا تھا اور اس نے دنیا کے دونوں جانب کے آخری ربع مسکوں تک اپنے قبضہ میں کر لیا تھا حالانکہ یہ تاریخی واقعات کے لحاظ سے کسی بھی بادشاہ کے لئے ثابت نہیں ہے اور نہ قرآن نے اس مقصد کے لئے یہ تعبیر اختیار کی ہے بلکہ اس کی صاف اور واضح مراد یہ ہے کہ ذوالقرنین اپنے مرکزِ حکومت کے لحاظ سے اقصاءِ مغرب اور اقصاءِ مشرق تک پہنچا ہے اور مغرب میں وہ اس حد تک پہنچ گیا تھا جہاں خشکی کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے اور مشرق میں اس حد تک پہنچا کہ وہاں خانہ بدوش قبائل کے سوا کوئی شہری آبادی نہیں تھی۔ یہ مطلب اس درجہ واضح ہے کہ اگر بے دلیل غلط فہمی کی وجہ سے مسطورہ بالا قول منقول نہ ہوتا تو ہر شخص زبان کے محاورہ کے لحاظ سے یہی سمجھتا جو ہم نے سمجھا ہے چنانچہ آج بھی ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے اقصائے مشرق اور اقصائے مغرب سے وہ دور دراز

ملک مراد لیتے ہیں جو ہمارے مشرق و مغرب میں واقع ہیں اور ان الفاظ کو اس بات میں منحصر نہیں کر دیتے کہ مشرق اور مغرب کے وہ کنارے مراد ہیں جن کے بعد معمورۂ عالم کا کوئی حصہ بھی باقی نہ رہا ہو، البتہ دلائل یا قرائن کے ذریعہ کبھی کبھی یہ معنی بھی مراد ہو جاتے ہیں۔

اقصائے مغرب و مشرق کی اس اصطلاح کو جو قرآن نے ذوالقرنین کے سلسلہ میں بیان کی ہے اگر اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین (خورس) سے متعلق توراۃ نے چونکہ یہی تعبیر کی تھی اس لئے بہت ممکن ہے کہ قرآن نے سائلین کو اس کا واقعہ سنانے کے وقت اسی اصطلاح کو اختیار کرنا پسند کیا ہو۔ دیکھئے یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں خورس کے حق میں بعینہٖ یہی تعبیر موجود ہے۔

خداوند اپنے خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے۔ . . . . . میں نے اپنے بندے یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لئے تجھے تیرا نام صاف صاف لیکے بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھے نہیں جانتا، میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں، میرے سوا کوئی خدا نہیں۔ میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہیں پہچانا تاکہ لوگ سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کی اطراف سے سورج غروب ہونے (مغرب الشمس) کی اطراف تک جانیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں اور میرے سوا کوئی نہیں [1]

اور زکریا نبی کے صحیفہ میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے۔

"رب الافواج فرماتا ہے کہ دیکھ میں اپنے لوگوں کو سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کے ملک سے اور سورج کے غروب ہونے (مغرب الشمس) کے ملک سے چھڑا لوں گا اور میں انھیں لاؤں گا اور وہ (بنی اسرائیل) یروشلم کے درمیان سکونت کریں گے۔ [2]

ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں "مطلع الشمس" اور "مغرب الشمس" سے معمورۂ عالم کے دونوں جانب کے آخری کونے مراد نہیں ہیں بلکہ جن کا ذکر ہے ان کی حکومت یا مقام سکونت سے

---

[1] باب ۴۵۔ آیات ۱-۶۔ [2] باب ۸ آیت ۸۔

مشرقی اور مغربی جہات مراد ہیں۔

(۸) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین کو تیسری قابل ذکر مہم پیش آئی اور جب وہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں دو پہاڑوں کی پھانکیں ایک درہ بناتی تھیں تو ان کے درے اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان اور بولی سے ناواقف تھی، انھوں نے ذوالقرنین پر (کسی طرح) یہ واضح کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان سے نکل کر ہم کو یاجوج وماجوج ستاتے اور زمین میں فساد انگیزی کرتے ہیں، کیا آپ ہماری اتنی مدد کریں گے کہ ہم سے مالی ٹیکس لے کر ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک "سد" بنا دیں تاکہ ان کے اور ہمارے درمیان وہ حدِ فاصل ہو جائے اور روک بن جائے۔ ذوالقرنین نے کہا میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اس لئے مجھے اجرت کی ضرورت نہیں البتہ اس کے بنانے میں میری مدد کرو۔ ان لوگوں نے ذوالقرنین کے حکم سے لوہے کے ٹکڑے جمع کئے اور ان سے ذوالقرنین نے دونوں پہاڑوں کے درمیان "سد" بنادی اور پھر تانبا پگھلا کر اس آہنی دیوار کو مستحکم کر دیا۔

(ت۔۸) تاریخ کی ناقابلِ انکار شہادتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خورس کو جانب شمال میں ایک قابلِ ذکر مہم پیش آئی جس میں کاکیشیا (جبل قوقایا کوہِ قاف) کے پہاڑی سلسلے میں ایسے دو پہاڑوں کے قریب ایک قوم ملی جن کی پھانکوں کے درمیان قدرتی درہ تھا اور پہاڑ کی دوسری جانب سے سیتھین قبائل کے جنگلی اور غیر مہذب لٹیرے دَل کے دَل آکر اس قوم پر حملہ کرتے اور لوٹ مار کرکے درہ کے راستہ واپس ہو جایا کرتے تھے، خورس جب اس جگہ پہنچا تو اس آبادی کے لوگوں نے حملہ آور لٹیروں کی شکایت کرتے ہوئے اس سے پہاڑوں کے درمیان "سد" (دیوار) بنانے کی درخواست کی، خورس نے ان کی درخواست کو منظور کیا اور لوہے اور تانبے سے ملا کر ایک سد قائم کر دی جس کو وقت کے گاگ اور میگاگ غیر مہذب (سیتھین) قبائل اپنی درندگی اور خونخواری کے باوجود نہ توڑ پھوڑ سکے اور نہ اس کے اوپر سے اتر کر حملہ آور ہو سکے اور اس طرح پہاڑوں کے درے کی آبادی ان کے حملوں سے محفوظ ہو گئی۔

اگرچہ غیر مہذب قبائل کے حملوں سے تحفظ کی خاطر دنیا کے مختلف حصوں میں ایسی

متعدد چھوٹی اور بڑی "سد" (دیواریں) بنائی گئی ہیں لیکن ایسی سد جو لوہے اور تانبے سے مخلوط دو پہاڑوں کی پھانکوں کے درمیان بنائی گئی ہو خورس کی بنائی ہوئی اس سد کے سوا جو کاکیشیا (جبل قوقایا) میں پائی جاتی ہے کوئی سد دنیا میں اب تک دریافت نہیں ہوئی اس لئے دلائل کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کی سد کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں اُس کے پیشِ نظر خورس ہی ذوالقرنین ہے اور درۂ داریال ہی کی سد قرآن کی تفصیلات کے مطابق ہے۔

یاجوج وماجوج کون ہیں اور "سد" کی حقیقت کیا ہے چونکہ یہ دو زیرِ تحقیق مسائل ابھی بحث میں نہیں آئے اس لئے ذوالقرنین سے متعلق مطابقتِ قرآن کا یہ پہلو ہنوز تشنۂ دلیل ہے۔ ہٰذا سطورِ ذیل میں ان دونوں مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے تاکہ اصل حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

یاجوج وماجوج

ذوالقرنین کی شخصیت کو زیرِ بحث لانے کے بعد دوسرا مسئلہ یاجوج وماجوج کی تعیین کا ہے۔ مفسرین اور مؤرخینِ اسلام نے رطب ویابس روایات کا وہ تمام ذخیرہ نقل کر دیا ہے جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ چند روایات کے علاوہ اس سلسلہ کی تمام روایات خرافات وہفوات کا مجموعہ ہیں جو عقلاً ونقلاً کسی طرح لائقِ اعتماد نہیں ہیں اور اسرائیلیات کا لایعنی طومار ہیں۔

ان تمام روایات میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یاجوج وماجوج ایک ایسے قبائل کا مجموعہ ہیں جو جسمانی اور معاشرتی اعتبار سے عجیب وغریب زندگی کے حامل ہیں۔ مثلاً وہ بالشت ڈیڑھ بالشت یا زیادہ سے زیادہ ایک ذراع کا قد رکھتے ہیں اور بعض غیر معمولی طویل القامت ہیں اور ان کے دونوں کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک اوڑھنے اور دوسرا بچھانے کے کام میں آتا ہے، چہرے چوڑے چکلے اور قد کے ساتھ غیر تناسب ہیں، ان کی غذا کے لئے قدرت سال بھر میں دو مرتبہ سمندر سے ایسی مچھلیاں نکال کر پھینک دیتی ہے جن کے سر اور دم کا فاصلہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ دس روز وشب اگر کوئی شخص اس پر چلتا رہے تب اس فاصلہ کو قطع کر سکتا ہے۔ یا ایک ایسا سانپ ان کی خوراک ہے

جو پہلے قرب وجوار کے تمام بری جانوروں کو ہضم کر جاتا ہے اور پھر قدرت اس کو سمندر میں پھینک دیتی ہے اور وہ وہاں میلوں تک بحری جانوروں کو چٹ کر لیتا ہے اور پھر ایک بادل آتا ہے اور فرشتہ اس عظیم الجثہ اژدہے کو اٹھا کر اس پر رکھ دیتا ہے اور بادل اس کو ان قبائل میں لیجا کر ڈال دیتا ہے اور یہ کہ یاجوج و ماجوج ایک ایسی برزخی مخلوق ہیں جو آدم علیہ السلام کے صلب سے تو ہیں مگر حوا (علیہا السلام) کے بطن سے نہیں ہیں۔

ان روایات کو نقل کرتے ہوئے یاقوت نے معجم البلدان میں یہ رائے ظاہر کی ہے۔

ولست اقطع بصحتہ او ہ تہ لاختلاف الروایات فیہ واللہ اعلم بصحتہ وعلی کل حال فلیس فی صحتہ امر السد ریب الخ (ج ۵ ص ۵۳)	اور میں نے جو کچھ روایات نقل کی ہیں ان کے اختلافات کے پیش نظر میں کسی طرح ان کی صحت کو باور نہیں کر سکتا اور اس معاملہ کی اصل حقیقت کا حال خدا ہی خوب جانتا ہے اور بہر حال اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جہاں تک سد کا معاملہ ہے اس کے صحیح ہونے میں مطلق شک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں یہ ارشاد فرماتے ہیں۔

ومن زعم ان یاجوج وماجوج خُلقوا من نطفۃ آدم حین اُحتلم فاختلط بتراب فخلقوا من ذالک وانھم لیسوا من حواء فھو قول حکاہ الشیخ ابو زکریا النووی فی شرح مسلم وغیرہ ضعفوہ وھو جدیر بذلک اذ لا دلیل علیہ بل ھو مخالف لما ذکرناہ من ان جمیع الناس الیوم من ذریۃ نوح بنص القرآن	اور جس شخص نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یاجوج اور ماجوج حضرت آدمؑ کے ایسے نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں جو احتلام کی حالت میں نکلا اور مٹی میں رل مل گیا اور یہ مخلوق وجود میں آگئی اور یہ حضرت حواء کے بطن سے نہیں ہیں تو یہ ایک قول ہے جس کو شیخ ابو زکریا نووی نے شرح مسلم میں حکایت کیا ہے اور ان کے علاوہ علماء نے اس کی تغلیط کی ہے اور بلاشبہ یہ قول اس قابل ہے کہ اس کو صحیح نہ سمجھا جائے اس لئے کہ یہ قطعاً بے دلیل بات ہے بلکہ اس قول کے بالکل خلاف ہے جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ نص قرآن سے یہ ثابت ہے کہ کائنات کی موجودہ انسانی

هكذا من زعم انهم على اشكال	مخلوق کا ہر فرد حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے ہے۔ اس
مختلفة واطوال متباينة جدًا	طرح یہ قول بھی غلط اور بے دلیل ہے کہ یاجوج وماجوج
فمنهم من هو كالنخلة السحوق	عجیب عجیب مختلف شکلوں اور متضاد قد وقامت کی
ومنهم من هو غاية في القصر	مخلوق ہیں بعض ان میں سے اتنے لمبے ہیں کہ گویا کھجور کا بہت
ومنهم من يفترش اذنًا من اذنيه	طویل درخت ہو اور بعض بہت ہی کوتاہ قامت اور بعض کے کان
ويتغطى بالاخرة۔	ایسے ہیں کہ ایک کو وہ بچھا لیتے اور دوسرے کو اوڑھتے ہیں۔
فكل هذه بلا دليل ورجم بالغيب	سو یہ تمام اقوال قطعًا بے دلیل اور محض اٹکل کے تیر ہیں اور
بغير برهان والصحيح انهم من	صحیح بات یہ ہے کہ وہ عام بنی آدم کی طرح ہیں اور ان ہی
بني ادم وعلى اشكالهم وصفاتهم [1]	کی طرح شکل وصورت اور (جسمانی) اوصاف رکھتے ہیں۔

اور اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

وهذا قول غريب جدًا لا دليل	اور یہ قول بلا شبہ ایک اچنبا قول ہے کہ جس کے لئے نہ عقلی
عليه لا من عقل ولا من نقل ولا	دلیل ہے اور نہ نقلی اور بعض اہلِ کتاب نے جو اس سلسلہ میں
يجوز الاعتماد منها على ما يحكيه	حکایات بیان کی ہیں اس مقام پر کسی طرح اُن پر بھروسہ
بعض اهل الكتاب لما عندهم	کرنا درست نہیں ہے اس لئے کہ ان کے یہاں تو اس قسم کے
من الاحاديث المفتعلة [2]	من گھڑت قصوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وقد ذكر ابن جرير منها عن وهب بن	اور ابنِ جریرؒ نے اس مقام پر وہب بن منبہؒ سے ذوالقرنین کی
منبه اثرًا طويلًا عجيبًا في سير ذي القرنين	سیاحت اور سد کی تعمیر اور اس سے متعلق کیفیات کے بارہ میں
وبنائه السد وكيفية ما جرى له وفيه	ایک طویل وعجیب اثر نقل کیا ہے دراصل وہ ایک طویل اور
طول وغرابة ونكارة في اشكالهم و	اجنبی داستان ہے اور اس میں ان (یاجوج ماجوج) کی شکلوں

[1] ج ۲ ص ۱۱۰ ۔ [2] ج ۶ ص ۱۷۲ سورۂ کہف۔

صفاتهم وطولهم وقصر بعضهم واذانهم الخ ؎۱

صورتوں، ان کے طویل وکوتاہ ہونے اوران کے کانوں کے متعلق اجنبی اور غیر معقول باتیں ہیں۔

اورحافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس عجیب وغریب قول کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

ووقع فی فتاوی الشیخ محی الدین یاجوج وماجوج من اولاد ادم لا من حواء عند جماهیر العلماء فیکونون اخوتنا لاب کذا قال ولم نر هذا عن احد من السلف الا عن کعب الاحبار ویرده الحدیث المرفوع انهم من ذریة نوح ونوح من ذریة حواء قطعا۔ ؎۲

اور شیخ محی الدین (نووی) کے فتاوی میں مذکور ہے کہ یاجوج اور ماجوج حضرت آدمؑ کی نسل سے تو ہیں مگر حضرت حوائؑ کے بطن سے نہیں ہیں جمہور علماء کا یہی خیال ہے اور اس طرح وہ حوائؑ کے بطن سے بنی آدم کے علاتی بھائی ہیں مگر ہم نے کعب احبار کے علاوہ سلف میں سے کسی ایک شخص کو بھی اس کا قائل نہیں پایا اوراس قول کو وہ حدیث مرفوع قطعاً رد کرتی ہے جس میں یاجوج اور ماجوج کو نوح علیہ السلام کی نسل سے بتایا گیا ہے اور حضرت نوحؑ بلاشبہ حضرت حوائؑ کے بطن سے ہیں۔

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

وقد اشار النووی وغیره الی حکایة من زعم ان ادم نام فاحتلم فاختلط منیه بتراب فتولد منه ولد یاجوج وماجوج من نسله وهو قول منکر جدا لا اصل له الا عن بعض اهل الکتاب الخ ؎۳

اور نووی اور بعض دوسروں نے ایک ایسے شخص کی بیان کردہ حکایت کی جانب اشارہ کیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ آدمؑ خواب میں تھے کہ ایک مرتبہ ان کو احتلام ہوگیا اوران کے قطرات منی مٹی میں رل مل گئے بس اس سے یاجوج اور ماجوج کی نسل مخلوق ہوگئی تو یہ قول ہے جو سرتاسر بیہودہ اور بے اصل ہے اور بعض اہل کتاب کی حکایت کے سوائے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

؎۱ ج ۶ ص ۱۶۲۔ ؎۲ فتح الباری ج ۱۳۔ ص ۹۱ - ؎۳ ایضاً ج ۶ ص ۲۹۵۔

اور حافظ ابن کثیر اپنی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ثم هم من ذریة نوح لان الله تعالیٰ اخبر انه استجاب لعبده نوح فی دعائه علی اهل الارض بقوله (رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا) وقال تعالیٰ (فانجیناه واصحاب السفینة) وقال (وجعلنا ذریته هم الباقین) ؎۱

پھر وہ (یاجوج و ماجوج) نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ اس نے اہلِ زمین کے متعلق نوحؑ کی یہ دعا مقبول کر لی (اے رب تو زمین پر کسی کافر کو باقی نہ چھوڑ) اور پھر حق تعالیٰ نے فرمایا (پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی) اور پھر فرمایا (اور ہم نے اس کی ذریت ہی کو باقی رہنے والوں میں چھوڑا)۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ جبکہ قرآن عزیز ان آیات میں یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بددعا کے بعد بنی آدم میں سے حضرت نوح اور اصحابِ کشتی یا دوسرے الفاظ میں حضرت نوحؑ کی ذریت اور چند مسلمانوں کے علاوہ کسی کو زندہ اور باقی نہیں چھوڑا اور اب دنیائے انسانی حضرت نوحؑ ہی کی اولاد ہے تو پھر یہ کہنا کہ یاجوج اور ماجوج بنی آدم میں سے ایک مستقل مخلوق ہے اور ذریت نوح میں سے نہیں ہے قطعاً بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ اور اس کی تائید میں حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اگر یہ حوا کے بطن سے نہ تھے اور اس لئے ذریتِ نوحؑ میں سے بھی نہیں تھے تو طوفانِ نوح میں یہ مخلوق کہاں تھی اور نص قرآنی کے خلاف یہ کیسے محفوظ رہی؟۔

اور حضرت قتادہ سے جو منقول ہے وہ بھی اس قول کو رد کرتا ہے

ویاجوج وماجوج قبیلتان من ولد یافث بن نوح (الحدیث) ؎۲

اور عبدالرزاق نے کتاب التفسیر میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج دو قبیلے ہیں جو یافث بن نوح کی نسل سے ہیں۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ یاجوج و ماجوج حضرت نوحؑ کی نسل سے ہیں اور اگرچہ اس کی سند میں فی الجملہ ضعف ہے مگر اس کے مطاوع اور مؤید بعض

؎۱ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۰۔ ؎۲ فتح ج ۶ ص ۲۹۷ ۔ ؎ دعویٰ کہ موجودہ کل کائنات صرف نوحؑ کی ذریت میں لائق غور ہے

دوسری صحیح روایات ہیں چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے بخاری کی اس مرفوع روایت کے متعلق جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے۔

والغرض منہ ھنا ذکر یاجوج و ماجوج والاشارۃ الی کثرتھم وان ھذہ الامۃ بالنسبۃ الیھم نحو عشر عشر العشر و انھم من ذریۃ ادم رداً علی من قال خلاف ذالک۔ ؎	امام بخاری کی اس روایت بیان کرنے کی غرض یہ ہے کہ یاجوج اور ماجوج کا حال بیان کیا جائے اور ان کی کثرتِ تعداد کی جانب اشارہ ہے اور یہ کہ امتِ محمدیہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقابلہ میں وہ ہزاروں گنا زیادہ ہیں اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح نسلِ آدم میں شامل ہیں اس سے ان لوگوں کا رد کرنا مقصود ہے جو اس کے خلاف ان کو عام انسانی مخلوق سے جدا مانتے ہیں۔

یہ چند نقول ہیں ان محققین کے ذخیرۂ اقوال سے جو حدیث تفسیر اور علمِ تاریخ کی ماہر ہستیاں ہیں، ان اقوال سے یہ بات قطعاً واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ یاجوج ماجوج عام دنیائے انسانی کی طرح ربع مسکوں کے باشندے اور ان کی نسل بنی آدم کی عام نسل کی طرح ہے اور وہ کوئی عجوبۂ روزگار مخلوق نہیں ہیں اور نہ برزخی مخلوق۔ اور اس قسم کی جو روایات پائی جاتی ہیں ان کا اسلامی روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ اسرائیلیات کے بے سروپا ذخیرہ کا جزء ہیں اور ان تمام روایات کا سلسلہ کعب احبارؓ پر جا کر ختم ہوتا ہے جو یہودی النسل ہونے کی وجہ سے ان قصوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ اور اسلام لانے کے بعد یا تو تفریح کے طور پر ان کو سنایا کرتے تھے اور یا اس لئے کہ اس رطب و یابس میں سے جو دور از کار باتیں ہوں وہ رد کردی جائیں اور جن سے قرآن اور احادیثِ نبوی کی تائید ہوتی ہو ان کو ایک تاریخی حیثیت میں لے لیا جائے مگر نقل کرنے والوں نے اس حقیقت پر نظر نہ رکھتے ہوئے اس پورے طومار کو جو "غرقِ مے ناب اولیٰ" کا مصداق تھا اسی طرح نقل کرنا شروع کر دیا جس طرح حدیثی روایات کو نقل کیا جاتا تھا۔ اور اگر

؎ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۸۔

سلف صالحین اور متاخرین میں وہ بے نظیر ہستیاں نہ پیدا ہوتیں جنھوں نے روایات و احادیث کے تمام ذخیرے کو "نقد و تبصرہ" کی کسوٹی پر پرکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا تو نہ معلوم کہ آج اسلام کو کس قدر بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

پس اس وضاحت کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یاجوج اور ماجوج کا مصداق کون سے قبائل ہیں اور ان قبائل کا کائناتِ انسانی کے ساتھ کیا تعلق رہا ہے؟ یہ مسئلہ درحقیقت ایک معرکۃ الآرار مسئلہ ہے اور اقوامِ عالم کی بہت سی قوموں پر اثر انداز ہے۔ نیز سورۂ انبیاء کی آیت "حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ" سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

بہرحال اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلہ پر کچھ لکھیں مقدمہ اور تمہید کے طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی آبادی کے تمام گوشوں میں جو چہل پہل اور رونق نظر آتی ہے اور ربع مسکوں جس طرح بنی آدم سے آباد ہے اور تمدن و حضارت کی نیرنگیوں سے گلزار بنا ہوا ہے ان کی ابتدا بدوی اور صحرائی قبائل سے ہوئی ہے اور یہی قبائل صدیاں گذر جانے اور اپنے اصل مرکز سے جدا ہو جانے کے بعد تمدن و حضارت کے بانی بنتے اور متمدن قومیں شمار ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کی قوموں کے سب سے بڑے سرچشمے کہ جہاں سے سیلاب کی طرح اُمنڈ اُمنڈ کر انسانی آبادی پھیلی اور پھلی پھولی ہے اور مختلف ملکوں اور زمین کے مختلف خطوں میں جا کر بسی ہے صرف دو ہیں۔ ایک حجاز اور دوسرا چینی ترکستان یا کاکیشیا کا وہ علاقہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا مرتفع اور بلند حصہ شمار ہوتا ہے۔

حجاز ان تمام اقوام و قبائل کا سرچشمہ ہے جو سامی النسل یا سیمٹک (Semetic) کہلاتی ہیں۔ یہ قبائل ہزاروں سال سے اس بے آب و گیاہ سرزمین سے طوفان کی طرح اٹھتے اور بگولہ کی طرح دنیا کے مختلف حصوں پر پھیلتے رہے ہیں۔ اور بدوی اور صحرائی زندگی کے گہوارہ سے نکل کر زبردست تمدن اور عظیم الشان حضارت و شہرت کے بانی قرار پائے ہیں۔

عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیہ (ثمود) اسی سرزمین سے اٹھے اور اپنی عظیم الشان صناعی اور پرسطوت

حکومت وصولت کے ذریعہ صدیوں تک تمدن وحضارت کے علمبردار رہے۔ جدیس طسم اور اسی قسم کے دوسرے قبائل بھی جو آج امم بائدہ (ہلاک شدہ) کہلاتے ہیں اسی خاک کے پروردہ تھے۔ اذوا ءِیمن (شاہانِ حمیر) اور عمالقہ مصر و شام و عراق کے جلال وجبروت اور وسعتِ سلطنت کا یہ عالم تھا کہ ایک عرصہ تک فارس اور روم بلکہ ہندوستان کے بعض حصے بھی ان کے احکام کے محکوم اور ان کی حکومت کے باجگزار رہ چکے ہیں۔ غرض سامی النسل اقوام وقبائل خواہ بدوی اور صحرائی ہوں یا حضری اور متمدن شہری سب اسی خاک حجاز (عرب) کے ذرات تھے جو اپنی وسعت کے بعد آپس میں اس قدر اجنبی ہو گئے تھے کہ بدوی اور شہری بلکہ فراعنۂ مصر (عمالقہ) اور اذوا ءِیمن (سلاطین حمیری) اور عرب مستعربہ" اسمعیلی عربوں" کے درمیان مطابقت پیدا کرنی بھی مشکل ہو گئی تھی اور اگر نسلی امتیازات خصوصیات اور زبان کی بنیادی یکرنگی ان کے باہم پیوند نہ لگاتی تو تاریخ کے کسی گوشہ کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ ابھر کر ان کی اخوتِ باہمی کا درس دیسکتا۔

اسی طرح قبائل واقوامِ عالم کا دوسرا سمندر اور بحرِ ناپیدا کنار چینی ترکستان اور منگولیا کا وہ علاقہ رہا ہے جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا بلند اور مرتفع حصہ ہے۔

اس مقام سے بھی ہزاروں سال کے عرصہ میں سینکڑوں قبائل لٹھے اور دنیا کے مختلف گوشوں تک پہنچے اور وہاں جا کر بس گئے۔ یہیں سے انسانوں کی موجیں اٹھیں اور وسطِ ایشیا میں جا گریں۔ یہیں سے یورپ پہنچیں اور یہیں سے ہندوستان اور شمالِ مغرب تک پھیلتی چلی گئیں۔ ہندوستان میں بس جانے والوں نے اپنا تعارف "آرین" کے ساتھ کرایا۔ وسطِ ایشیا میں بسنے والوں نے "ایرانیہ" کہلا کر اپنے علاقہ کا نام ایران مشہور کیا۔ یورپ میں ہن گاتھ ڈانڈیال وغیرہ ان ہی قبائل سے ... پڑے اور بحرِ اسود سے دریائے ڈینوب تک بسنے والے سیتھین کہلائے اور یورپ وایشیا کے ایک بڑے حصہ پر چھا جانے والے رشین کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہ قبائل جب اپنے مرکز سے چلے تھے تو صحرائی، وحشی اور بدوی تھے لیکن اپنے مرکز سے ہٹ کر جب دوسرے مقامات پر پہنچے اور حضارت وتمدن سے آشنا ہوئے یا ضرورت نے آشنا کرایا

تو نئے نئے ناموں سے پکارے گئے۔ حتیٰ کہ اپنے مرکز کی ابتدائی حالت سے اس قدر بُعد ہو گیا کہ مرکز میں بسنے والے وحشی قبائل اور ان کے درمیان کوئی یکسانیت باقی نہ رہی بلکہ ایک ہی اصل کی دونوں شاخیں ایک دوسرے کی حریف بن گئیں اور شہری اقوام کے لئے ان کے ہم نسل وحشی قبائل مستقل خطرہ ثابت ہونے لگے جو آئے دن شہریوں پر تاخت و تاراج کرتے اور لوٹ مار کرکے پھر اپنے مرکز کی جانب واپس جاتے تھے۔

بہرحال تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ عہد تاریخی کے قبل سے پانچویں صدی مسیح تک اس علاقہ سے جو آج کل منگولیا تاتار کہلاتا ہے اسی قسم کے انسانی طوفان اٹھتے رہے ہیں۔ اور ان سے قریب اور ہمسایہ قوم "چینی" ان کے بڑے دو قبائل کو "موگ" اور "یوچی" کہتے رہے ہیں پس یہی "موگ" ہے جو تقریباً چھ سو برس قبل مسیح یونان میں میگ اور میگاگ بنا۔ اور عربی میں ماجوج ہوا اور غالباً یہی "یواجی" یونانی میں یوگاگ اور عبرانی اور عربی میں جوج اور یاجوج کہلایا۔ لیکن جب یہ قبائل دنیا کے مختلف حصوں میں جاکر آباد ہوئے اور بہت سے قبائل پہلے کی طرح اپنے مرکز ہی میں وحشی اور صحرائی بنے رہے تو اس اختلافِ تمدن و معیشت نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ ان قبائل کے وحشی اور صحرائی جنگجو تو اسی طرح یاجوج (گاگ Gog) اور ماجوج (میگاگ Magog) کے نام سے موسوم رہے مگر متمدن اور شہری قبائل نے مقامی خصوصیات و امتیازات کے ساتھ ساتھ اپنے ناموں کو بھی بھلا دیا اور نئے نئے ناموں سے شہرت پائی۔ اور پھر یہ تقسیم اس طرح قائم ہو گئی کہ تاریخ کے عہد میں بھی اس کو باقی رکھا گیا اور وسطِ ایشیا کے ایرانی ایشیائی اور یورپین روسی اور دیگر یورپین تو بیں اور ہندوستان کے آرین اصل کے اعتبار سے منگولین یعنی موگ (ماجوج) اور یواگ (یاجوج) نسل ہونے کے باوجود تاریخ میں ان ناموں سے یاد نہیں کئے جاتے اور یاجوج و ماجوج کا نام صرف ان ہی قبائل کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے جو اپنی گذشتہ حالتِ وحشت و بربریت اور غیر متمدن زندگی میں اپنے مرکز کے اندر موجود ہیں اور مختلف صدیوں میں قتل و غارت اور لوٹ مار کرنے کے لئے اپنے ہم نسل متمدن اقوام پر حملے کرتے رہے ہیں اور ان ہی کے وحشیانہ

حملوں کی حفاظت کے لئے اور مشرقی تاخت وتاراج سے بچنے کے لئے مختلف اقوام نے مختلف دیواریں اور سد قائم کیں اور ان ہی میں سے ایک وہ سد ہے جو ذوالقرنین نے ایک قوم کے کہنے پر دو پہاڑوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ملا کر تیار کی تاکہ وہ یاجوج اور ماجوج کے مشرقی حملوں سے محفوظ ہو جائے۔

یاجوج وماجوج کا ذکر توراۃ میں بھی ہے چنانچہ حزقیل علیہ السلام کے صحیفہ میں یوں کہا گیا ہے۔

اور خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے سزا دوں گا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں ماروں گا الخ [۱]

دیکھ میں تیرا مخالف ہوں اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار اور میں تجھے پلٹ دوں گا الخ [۲]

اور میں ماجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا الخ [۳]

اور اس دن یوں ہوگا کہ میں وہاں اسرائیل میں جوج کو ایک گورستان دوں گا یعنی رہ گذروں کی وادی جو سمندر کے پورب ہے اور اس کے رہ گذروں کی راہ بند ہوگی اور وہ وہاں جوج کو اور اس کی جماعت کو گاڑ دیں گے اور اسے ہامون جوج کی وادی نام رکھیں گے۔ [۴]

ان حوالوں میں جوج، ماجوج، روش، مسک اور توبال کا ذکر ہے اور ان کو خدا کا مخالف بتایا گیا ہے اور مظلوموں کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہرا دیگا اور ان کے جبڑوں میں بنسیاں ماریگا تاکہ وہ پلٹ جائیں اور یہ کہ قیامت کے قریب ان وحشی اور ظالم قبائل کو تباہ وبرباد کر دیا جائے گا اور ان کی موت سے عرصہ تک رہگذروں کے لئے راہیں بند ہو جائیں گی۔

ان ناموں کی تفصیل میں توراۃ کے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ جوج سے مراد گاگ (Gog.) ہے اور ماجوج سے میگاگ (Magog.) اور روش سے روس (Russia) اور مسک سے مراد

---

[۱] حزقیل باب ۳۸ آیت ۱-۳۔ [۲] ایضاً باب ۳۹ آیت ۱۔ [۳] ایضاً باب ۳۹ آیت ۶۔ [۴] ایضاً باب ۳۹۔ آیت ۱۱۔

ماسکو (Moscow.) اور توبال سے بحرِ اسود کا بالائی علاقہ مراد ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ توراۃ کی شہادت بھی اس سے اتفاق کرتی ہے کہ لفظ یاجوج اور ماجوج ان ہی قبائل کے لئے مخصوص ہوگیا تھا جو منگولیا اور کاکیشیا سے لیکر دور تک مشرق میں پھیلتے چلے گئے تھے اور یہ کہ حزقیل علیہ السلام کے زمانہ تک روس (Russia.) کا علاقہ تہذیب وتمدن اور حضارت سے عاری اور وحشی قبائل کا موطن اور مسکن تھا۔ اور قتل وغارت گری کا پیشہ کرتا تھا اور ظلم وستم ان کا روزمرہ کا مشغلہ تھا لہٰذا حضرت حزقیل علیہ السلام کی پیشینگوئیوں میں یہ بشارت دی گئی کہ وہ وقت قریب ہے جبکہ ان قبائل کی تاخت وتاراج کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک کے لئے بند ہوجائے گا۔ اس پیشینگوئی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جوج شمال کی جانب سے آئے گا تاکہ لوٹ مار کرے اور یہ کہ ماجوج پر اور جزیروں میں بسنے والوں پر سخت تباہی آئے گی اور یہ کہ اسرائیلی بھی ماجوج کے مقابلہ میں حصہ لیں گے

اب اگر تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو آپ پر یہ بخوبی واضح ہوجائیگا کہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح سے بحرِ خزر اور بحرِ اسود کا علاقہ وحشی اور خونخوار قبائل کا مرکز بنا ہوا ہے جو مختلف ناموں کے ساتھ موسوم ہوتے رہے ہیں بالآخر ان میں سے ایک زبردست قبیلہ نمودار ہوتا ہے جو تاریخ میں "سیتھین" کے نام سے مشہور ہے یہ وسطِ ایشیا سے بحرِ اسود کے شمالی کناروں تک پھیلا ہوا ہے اور اطراف میں مسلسل حملے کرتا رہتا اور متمدن اقوام پر تباہی لاتا رہتا ہے۔ یہ زمانہ بابل ونینوی کے عروج اور اشوریوں کے تمدن کے آغاز کا زمانہ تھا۔ پھر تقریباً ساڑھے چھ سو قبل مسیح میں ان کے ایک بڑے زبردست گروہ نے اپنی بلندیوں سے اتر کر ایران کا تمام مغربی حصہ تہ وبالا کر ڈالا۔

اب ۵۲۹ قبل مسیح میں سائرس (کیخسرو) کا ظہور ہوتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ اس کے ہاتھوں بابل کی تباہی، بنی اسرائیل کی آزادی اور میڈیا وفارس کی دو سلطنتوں کی یکجا طاقت کا نظارہ سامنے آتا ہے اور ٹھیک حزقیل علیہ السلام کی پیشینگوئی کے خصوصی امتیازات اس کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سیتھین قبائل کے مغربی حملوں سے حفاظت کے لئے اس کے ہاتھوں وہ سد قائم ہوتی ہے جس کا ذکر بار بار آرہا ہے۔

بہرحال ان تمام تاریخی مصادر سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حزقیل علیہ السلام کی پیشنگوئی کے مطابق وہ یاجوج وماجوج جن کی حفاظت کے لئے سائرس (ذوالقرنین) نے سد تیار کی یہی سیتھین قبائل تھے جو ابھی تک اپنی وحشیانہ خصائص وخصائل کے اسی طرح حامل تھے جس طرح ان کے پیشرو اپنے مرکز میں رہتے ہوئے ان امتیازات کے ساتھ یاجوج وماجوج کہلاتے رہے تھے اور یہ دراصل ایک مزید ثبوت ہے اس دعوی کے لئے کہ ذوالقرنین سائرس (کیخسرو) ہی ہے۔

یاجوج وماجوج کے متعلق جس قدر بحث اس وقت تک کی جاچکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں ہیں بلکہ دنیائے انسانی کی عام آبادی کی طرح وہ بھی حضرت نوح (علیہ السلام) کی ذریت میں سے ہیں اور یہ کہ یاجوج وماجوج منگولیا (تاتار) کے ان وحشی قبائل کو کہا جاتا رہا ہے جو یورپ اور روس کی اقوام کے منبع ومنشا ہیں اور چونکہ ان کی ہمسایہ قوم ان قبائل میں سے دو بڑے قبیلوں کو موگ اور یوچی کہتی تھی اس لئے یونانیوں نے ان کی تقلید میں ان کو میگ یا میگاگ اور یوگاگ کہا اور عبرانی اور عربی میں تصرف کرکے ان کو یاجوج وماجوج سے یاد کیا گیا۔

اب ان تاریخی حقائق کی تائید میں عرب مؤرخین اور محقق مفسرین ومحدثین کی تحقیق بھی قابل مطالعہ ہے تاکہ گذشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تصویب ہوسکے۔

حافظ عماد الدین بن کثیرؒ اپنی تاریخ میں تصریح فرماتے ہیں۔

ویافث ابو الترك فیاجوج وماجوج طائفة من الترك وهم مغول المغول وهم اشد بأسًا واكثر فسادًا من هؤلاء۔ [1]	اور یافث تاتاریوں کا نسلی باپ ہے پس یاجوج وماجوج تاتاریوں ہی کی ایک شاخ ہیں اور یہ منگولیا کے قبائل کے منگولی ہیں اور دوسرے تاتاریوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور اور بہت زیادہ فسادی اور لوٹ مار مچانے والے ہیں۔

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۰۔

اور اپنی تفسیر میں بھی اسی کی تائید فرماتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ قبائل یافث بن نوح ؑ کی نسل سے ہیں اور ان کا مولد و موطن منگولیا کا وہی علاقہ ہے جہاں سے قوموں کے طوفان اٹھے اور اٹھکر یورپ وغیرہ میں جا کر بسے ہیں۔

اور ابن اثیر نے کامل میں یہ تحریر فرمایا ہے۔

وقد اختلف الاقوال فیھم والصحیح انھم نوع من الترک لھم شوکۃ وفیھم شر وھم کثیرون وکانوا یفسدون فیما یجاورھم من الارض ویخربون ما قدروا علیہ من البلاد ویؤذون من یقرب منھم الخ (ج ۱ ص ۶۸)

یاجوج و ماجوج کے متعلق مختلف اقوال ہیں اور صحیح قول یہ ہے کہ وہ تاتاریوں ہی میں سے ایک قسم کے تاتاری ہیں وہ بہت طاقتور ہیں اور ان میں شر و فساد کا مادہ بہت ہے اور وہ بہت بڑی تعداد رکھتے ہیں و جوار کی زمین میں فساد پھیلاتے اور جس بستی پر (قابو پاتے) اس کو برباد کر ڈالتے تھے اور پڑوسیوں کو ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔

اور سید محمود آلوسیؒ روح المعانی میں لکھتے ہیں۔

ان یاجوج وماجوج قبیلتان من ولد یافث بن نوح علیہ السلام وبہ جزم وھب بن منبہ وغیرہ واعتمدہ کثیر من المتاخرین ۔ (ج ۱۶ ص ۳۶)

یاجوج و ماجوج یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے ہیں اور وہب بن منبہ اسی پر یقین رکھتے ہیں اور متاخرین میں سے اکثر کی یہی رائے ہے۔

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

وفی کلام بعضھم ان الترک منھم لما اخرجہ ابن جریر وابن مردویہ من طریق السدی من اثر قوی الترک سریۃ من سرایا یاجوج وماجوج الخ (ج ۱۶ ص ۳۶)

اور بعض کہتے ہیں کہ ترک (تاتاری) ان ہی میں سے ہیں جیسا کہ ابن جریر اور ابن مردویہ نے سدیؒ سے ایک قوی اثر نقل کیا ہے کہ ترک (تاتاری) یاجوج و ماجوج کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہیں۔

وفی روایۃ عبدالرزاق عن قتادۃ ان — اور عبدالرزاق نے حضرت قتادہ سے روایت کی ہے کہ

یاجوج وماجوج ثنتان وعشرون قبیلۃ[1] : جوج اور ماجوج بائیس قبائل کا مجموعہ ہیں۔

اس کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں یاجوج وماجوج سے متعلق جو کچھ نقل فرمایا ہے وہ بھی قولِ بالا کی ہی تائید کرتا ہے[2]۔ اور علامہ طنطاوی اپنی تفسیر جواہر القرآن میں لکھتے ہیں۔

"یاجوج وماجوج اپنی اصل کے اعتبار سے یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں اور یہ نام لفظ اجیج النار سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگ کے شعلہ اور شرارہ کے ہیں گویا ان کی شدت اور کثرت کی طرف اشارہ ہے اور بعض اہلِ تحقیق نے ان کی اصل پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ مغلوں (منگولیوں) اور تاتاریوں کا سلسلۂ نسب ایک شخص "ترک" نامی پر پہنچتا ہے اور یہی شخص ہے جس کو ابوالفدار ماجوج کہتا ہے۔

پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاجوج وماجوج سے مراد منگولین اور تاتاری قبائل ہی ہیں۔ ان قبائل کا سلسلہ ایشیا کے شمالی کنارہ سے شروع ہو کر تبت اور چین سے ہوتا ہوا محیط منجمد شمالی تک چلا گیا ہے اور غربی جانب ترکستان کے علاقہ تک پھیلا ہوا ہے۔ فاکہۃ الخلفاء اور ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق اور رسائل اخوان الصفا ان سب میں یہ کہا ہے کہ یہی قبائل یاجوج وماجوج کہلاتے ہیں۔"[3]

اور ابنِ خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں یاجوج وماجوج کے مستقر اور اس کے جغرافیائی حیثیت کو اس طرح واضح کیا ہے۔

ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جن کو قفجاق اور چرکس کہا جاتا ہے اور مشرق کی جانب یاجوج کی آبادیاں اور ان دونوں کے درمیان کوہِ قاف حدِ فاصل ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے کہ وہ بحر محیط سے شروع ہوتا ہے جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک چلا گیا ہے اور پھر بحر محیط

---

[1] ج ۱۶ ص ۳۶ - [2] ج ۱۳ ص ۹۰ [3] ج ۹ ص ۱۹۹ -

(   )سے جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھکتا ہوا پانچویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، یہاں سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑ جاتا ہے حتی کہ ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہاں پہنچ کر جنوب سے شمال مغرب کو ہوتا ہوا گیا ہے اور اسی سلسلۂ کوہ کے درمیان "سدِ سکندری" واقع ہے۔ . . . .

. . . . اور ساتویں اقلیم کے نویں حصہ کے وسط ہی میں وہ "سدِ سکندری" ہے جس کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اور جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے۔

اور عبد اللہ بن خردادبہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واثق باللہ (خلیفہ عباسی) کا وہ خواب نقل کیا ہے جس میں اس نے یہ دیکھا تھا کہ "سد" کھل گئی ہے چنانچہ وہ گھبرا کر اٹھا اور دریافتِ حال کے لئے "سلام ترجمان" کو روانہ کیا اور اس نے واپس آکر اسی سد کے حالات و اوصاف بیان کئے۔

اور ساتویں اقلیم کے دسویں حصہ میں ماجوج کی بستیاں ہیں جو مسلسل آخر تک چلی گئی ہیں یہ حصہ بحر محیط کے ساحل پر واقع ہے جو اس کے مشرقی شمالی حصہ کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے کہ شمال میں تو طول میں چلا گیا ہے اور بعض مشرقی حصہ میں عرض میں گیا ہے۔ [۱]

ابنِ خلدون نے یاجوج وماجوج اور سد کے متعلق اسی طرح اقلیم رابع، اقلیم خامس اور اقلیم سابع کی بحث میں بھی ضمناً بیان کیا ہے بلکہ اقلیم رابع میں یہ بھی تصریح ہے۔

وعلی قطعة من البحر المحیط هنالك وهو جبل یاجوج ماجوج وهذه الامم كلها من شعوب الترك۔ [۲]	اور اقلیم رابع کے جزء عاشر کا ایک حصہ بحر محیط کے اوپر واقع ہے اور یہ جبل یاجوج وماجوج ہے اور یاجوج و ماجوج یہ تمام قبائل ترک قبائل ہیں۔

گذشتہ بحث میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ منگولیا یا کاکیشیا کے یہ قبائل جب تک اپنے مرکز میں رہتے ہیں یاجوج ماجوج کہلاتے ہیں اور جب وہاں سے نکل کر کہیں بس جاتے اور صدیوں بعد متمدن ہو جاتے

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۹۰، بحث الاقلیم السادس۔ یہ واضح رہے کہ جبل قوقایا کوہ قاف اور جبال کاکیشیا ایک ہی چیز ہیں۔ (مولف) [۲] ایضاً ص ۷۱۔

ہیں تو پھر وہ اس نام کو بھلا دیتے ہیں اور دوسرے بھی ان کو اس وحشیانہ انتہا سے یاد نہیں کرتے کیونکہ پھر یہ اپنے مرکز سے اس قدر اجنبی ہو جاتے ہیں کہ مرکز کے وحشی قبائل ان کو بھی اپنا حریف بنا لیتے اور ان پر غارت گری کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی اپنے ہی ہم نسل مرکزی وحشی قبائل سے اسی طرح خوف کھانے لگتے ہیں جس طرح دوسرے قبائل۔ چنانچہ اس مسئلہ کی تائید حافظ عماد الدین ابنِ کثیر کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے تحریر فرماتے ہیں۔

"حتی اذا بلغ بین السدین" وھما جبلان متناوحان بینھما ثغرۃ یخرج منھا یاجوج وماجوج علی بلاد الترک فیعیثون فیھا فسادًا ویھلکون الحرث والنسل۔ [۵۱]	سدین سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ان کے درمیان شگاف ہے۔ اسی شگاف سے یاجوج وماجوج ترکوں کے شہروں پر آپڑتے اور ان میں فساد مچا دیتے اور کھیتیوں اور نسلوں کو ہلاک اور برباد کر ڈالتے تھے۔

یعنی یاجوج وماجوج بھی اگرچہ منگولی (تاتاری) ہیں مگر پہاڑوں کے ورے جو تاتاری قبائل اپنے مرکز سے ہٹ کر آباد ہو گئے تھے اور متمدن بن گئے تھے۔ ہم نسل ہونے کے باوجود دونوں میں اس قدر تفاوت ہو گیا کہ ایک دوسرے سے نا آشنا بلکہ حریف بن گئے اور ایک ظالم کہلائے اور دوسرے مظلوم اور ان ہی قبائل نے ذوالقرنین سے سد بنانے کی فرمائش کی۔

اور بعض عرب مؤرخین نے تو "ترک" کی وجہ تسمیہ ہی یہ بیان کر دی کہ یہ وہ قبائل ہیں جو یاجوج وماجوج کے ہم نسل ہونے کے باوجود سد سے ورے آباد تھے اور اس لئے جب ذوالقرنین نے سد قائم کی اور ان کو اس میں شامل نہیں کیا تو اس چھوڑ دئے جانے کی وجہ سے وہ "تُرِک" کہلائے۔ [۵۲]

یہ وجہ تسمیہ اگرچہ ایک لطیفہ ہے تاہم اس امر کا ثبوت ضرور بہم پہنچاتی ہے کہ متمدن قبائل تمدن وحضارت کے جدا اپنے ہم نسل مرکزی قبائل سے اجنبی ہو جاتے تھے اور وہ یاجوج وماجوج نہیں کہلاتے تھے۔ اور لفظ یاجوج وماجوج صرف ان ہی قبائل کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں جو اپنے

---

[۵۱] تفسیر ج ۳ ص ۱۰۳ جدید ایڈیشن۔ [۵۲] البدایہ والنہایہ ج ۲۔

مرکز میں سابق کی طرح ہنوز وحشت، بربریت اور درندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

سد | یاجوج و ماجوج کے اس تعین کے بعد دوسرا مسئلہ "سد" کا سامنے آتا ہے یعنی وہ "سد" کس جگہ واقع ہے جو ذو القرنین نے یاجوج و ماجوج کے فتنہ و فساد کو روکنے کے لئے بنائی اور جس کا ذکر قرآنِ عزیز میں بھی کیا گیا ہے۔

تعینِ سد سے پہلے یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کی تاخت و تاراج اور شر و فساد کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم و ستم سے نالاں تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ان کی شمالی دستبرد سے محفوظ نہ تھے۔ اس لئے صرف ایک ہی غرض کے لئے یعنی قبائل یاجوج و ماجوج کے شر و فساد اور لوٹ مار سے بچنے کے لئے مختلف تاریخی زمانوں میں متعدد "سد" تعمیر کی گئیں۔ ان میں سے ایک "سد" وہ ہے جو "دیوارِ چین" کے نام سے مشہور ہے یہ دیوار تقریباً ایک ہزار میل طویل ہے۔ اس دیوار کو منگولی اتکو وہ کہتے ہیں اور ترکی میں اس کا نام بوقورقہ ہے۔

دوسری سد وسطِ ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے اور اس کے محلِ وقوع کا نام دربند ہے یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی اور شاہِ روم کے ندیم خاص سیلا برجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلافیجو نے بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے یہ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور صاحبقراں کی خدمت میں حاضر ہوا ہے تو اس جگہ سے گذرا ہے وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی "سد" موصل کے اس راستہ پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔ [1]

تیسری سد روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے اور بعض مؤرخین اس کو "الباب" بھی لکھدیتے ہیں۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں، ادریسی نے جغرافیہ میں، اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات کو بہت تفصیل سے

---

[1] جواہر القرآن ج ۹ ص ۱۹۸۔

ساتھ لکھا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے۔

"داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے۔ یہ شہر بحر خزر (کاسپین) غربی کے کنارہ واقع ہے اس کا عرض البلد ۴۳-۳ شمالاً اور طول البلد ۱۵-۴۸ شرقاً ہے اور اس کو دربند نوشیروان بھی کہتے ہیں اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے اور اس کے اطراف و جوانب کو قدیم زمانہ سے چار دیوار گھیرے ہوئے ہیں جن کو قدیم مورخین ابواب البانیہ کہتے آئے ہیں اور اب یہ خستہ حالت میں ہے اور اس کو باب حدید اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی سد کی دیواروں میں لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔"

اور جب اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں بڑھتے ہیں تو ایک درہ ملتا ہے جو درہ داریال کے نام سے مشہور ہے اور یہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے گذرا ہے، یہاں ایک چوتھی سد ہے جو قفقاز یا جبل قوقا یا جبل قاف کی سد کہلاتی ہے اور یہ سد دو پہاڑوں کے درمیان بنائی گئی ہے۔ بستانی اس کے متعلق لکھتا ہے۔

اور اسی کے قریب ایک اور سد ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے غالباً اس کو اہل فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہو گا کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال نہیں معلوم ہو سکا بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کر دی اور بعض نے کسریٰ و نوشیرواں کی جانب اور یاقوت کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلا کر اس سے تیار کی گئی ہے [۱]

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی "دربند" کے مقالہ میں اس آہنی دیوار کا حال قریب قریب اسی کے بیان کیا گیا ہے۔ [۳]

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں بنائی گئی ہیں اور ایک ہی ضرورت کے لئے بنائی گئی ہیں اس لئے ذوالقرنین کی بنائی ہوئی سد کے تعین میں سخت اشکال پیدا ہو گیا ہے اور اسی لئے مورخین میں اس مقام پر سخت اختلاف پاتے ہیں اور اس اختلاف نے ایک دلچسپ صورت اختیار کر لی ہے

---

[۱] دائرۃ المعارف ج ۷، ص ۶۵۲ - و معجم البلدان ج ۸ ص ۹ - [۲] دائرۃ المعارف ج ۷، ص ۶۵۲

[۳] نواں ایڈیشن ج ۷، لفظ دربند ص ۱۰۶۔

اس لئے کہ دربند کے نام سے دو مقامات کا ذکر آتا ہے اور دونوں مقامات میں سد یا دیوار بھی موجود ہے اور غرضِ بنا بھی ایک ہی نظر آتی ہے۔

تو اب دیوارِ چین کو چھوڑ کر باقی تین دیواروں کے متعلق قابلِ بحث یہ بات ہے کہ ذوالقرنین کی سد ان تینوں میں سے کونسی ہے اور اس سلسلہ میں جس دربند کا ذکر آتا ہے وہ کونسا ہے؟

مؤرخینِ عرب میں سے مسعودی قزوینی اصطخری حموی سب اسی دربند کا ذکر کر رہے ہیں جو بحرِ خزر پر واقع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے بھی دیوار ملتی ہے اور شہر کے بعد بھی دیوار ہے اگرچہ ایک دیوار چھوٹی ہے اور دوسری بڑی مگر شہر سد یا دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور ایران کے لئے یہ مقام خاص اہمیت رکھتا ہے اور دیوار سے پرے بسنے والے قبائل کی زد سے بچاتا ہے

البتہ ابو الفدا اور بعض اس سے ناقل مؤرخین کو یہ غلطی ہو گئی کہ انھوں نے بخارا اور ترمذ کے قریب دربند کو اور بحرِ خزر کے قریب دربند کو ایک سمجھکر ایک کے حالات کو دوسرے کے ساتھ خلط کر دیا ہے۔

مگر ادریسی نے دونوں کی جغرافیائی حالت کو مفصل اور جدا جدا بیان کر کے اس خلط کو دور کیا اور اصل حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔

اس کے باوجود حال کے بعض اہلِ قلم کو اس غلطی پر اصرار ہے کہ سدِ ذوالقرنین یا سدِ سکندری کے سلسلہ میں جس سد کا ذکر آتا ہے اس سے بحرِ خزر یا بحرِ قزوین کا دربند مراد نہیں ہے بلکہ بخارا و ترمذ کے قریب جو دربند حصار کے علاقہ میں واقع ہے وہ مراد ہے [1]

بہر حال یہ مورخین، بحرِ خزر اور کاکیشیا کے علاقہ دربند (باب الابواب) کی دیوار کے متعلق یہ واضح کرتے ہیں کہ قرآنِ عزیز میں جس سد کا ذکر ہے وہ یہی ہے مگر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ کوئی اس کو سدِ سکندری کہتا ہے اور کوئی سدِ نوشیروانی غرض دربند کے متعلق جب بھی مؤرخین کو خلط ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی محقق اس کو دور کر کے یہ ضرور واضح کر دیتا ہے کہ "سدِ ذوالقرنین" کا تعلق اس دربند سے ہے جو کاکیشیا میں بحرِ خزر کے کنارہ واقع ہے اس دربند سے نہیں ہے جو بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے۔

---

[1] صدق ۱۸ / اگست ۱۹۳۸ء مضمون "سدِ سکندری"

چنانچہ وہبؒ بن منبہ فرماتے ہیں۔

قرآنِ عزیز میں جو "بین السدین" آیا ہے تو سدین سے مراد "جبلین" ہے یعنی دو پہاڑ کہ جن کے درمیان سد قائم کی گئی پہاڑ کی یہ دونوں چوٹیاں بہت بلند ہیں اور ان کے پیچھے بھی آبادیاں ہیں اور ان کے سامنے بھی اور یہ دونوں منگولین سرزمین کے اس آخری کنارہ پر واقع ہیں جو آرمینہ اور آذربیجان کے متصل ہے۔ سلہ

اور علامہ ہرویؒ فرماتے ہیں۔

یہ دو پہاڑ کہ جن کے درمیان ذوالقرنین کی سد قائم ہے تاتاری قبائل کے ورے واقع ہیں۔ (یعنی سد ان کو اس جانب آنے سے روکنے کے لئے بنائی گئی ہے) ۵۲

اور امام رازیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

زیادہ صاف بات یہ ہے کہ ان دو پہاڑوں کا جائے وقوع جانبِ شمال میں ہے اور (تعیین میں) بعض نے کہا ہے کہ وہ دو پہاڑ آرمینہ اور آذربیجان کے درمیان واقع ہیں اور بعض نے کہا کہ تاتاری قبائل کی سرزمین کا جو آخری کنارہ ہے وہاں واقع ہیں۔

اور طبری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ شاہ آذربیجان نے جبکہ وہ اس کو فتح کر چکا تھا ایک شخص کو خزر (بحرِ قزوین) کے اطراف سے بلایا کہ وہ صاحبِ آذربیجان کو بالمشافہ سد کے حالات سنائے۔ اس نے بتایا کہ وہ پہاڑوں کے درمیان ایک بلند سد ہے اور اس کے اس جانب بہت بڑی خندق ہے جو نہایت گہری ہے۔

اور ابنِ خردادنے کتاب المسالک والممالک میں بیان کیا ہے کہ واثق باللہ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ گویا اس نے اس سد کو کھول ڈالا ہے اس خواب کی بنا پر اس نے اپنے بعض عمال کو اس کی تحقیق کے لئے بھیجا تاکہ وہ اس کا معائنہ کریں سو یہ لوگ باب الابواب سے آگے بڑھے اور ٹھیک سد کے مقام پر پہنچ گئے۔ انھوں نے واثق باللہ سے آکر بیان کیا کہ یہ سد لوہے کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے

سلہ و ۵۲ تفسیر البحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۶ ص ۱۶۳۔

جس میں پگھلا ہوا تانبا شامل کیا گیا ہے اور اس کا آہنی دروازہ مقفل ہے پھر جب انسان وہاں سے واپس ہوتا ہے تو راہنما اس کو ایسے چٹیل میدانوں میں پہنچاتے ہیں جو سمرقند کے محاذات میں واقع ہیں[۵۱] ابوریحان بیرونی کہتے ہیں کہ اس تعارف کا مقتضا یہ ہوا کہ وہ زمین کے ربع شمالی مغربی میں واقع ہے۔

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں۔

"یہ دو پہاڑ ارض تسعین جہتِ شمالی میں واقع ہیں اور کتاب حزقیل علیہ السلام میں جوج کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ وہ شمال کی جانب سے آخری دنوں میں آئیں گے اس سے بھی یہی مراد ہے اور کاتب چلپی کا میلان بھی اسی جانب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے آرمینہ اور آذربیجان کے پہاڑ مراد ہیں اور قاضی بیضاوی کی رائے بھی یہی ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہدیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رض سے بھی یہی روایت ہے اگرچہ اس قول کا تعاقب کیا گیا ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے۔ ان اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اس کا مصداق باب الابواب (دربند بحرِ قزوین) ہے حالانکہ ان ہی مؤرخین کے نزدیک اس کا بانی کسریٰ، نوشیرواں ہے۔[۵۲]

اور ابن ہشام "ترک" کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان میں سے ایک جماعت مسلمان ہوگئی تھی اس لئے جب ذوالقرنین نے آرمینیہ میں (یعنی ان پہاڑوں میں جو آرمینہ سے آگے دور تک چلے گئے ہیں) سدّ بنانی شروع کی تو ان کو سدّ کے اس جانب چھوڑ دیا، پس اس ترک کرنے پر وہ "ترک" کہلائے " ترکھم . . . . . فسمّوا الترك لذلك "[۵۳]

اور حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری (نوراللہ مرقدہٗ) عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں۔

"قرآنِ عزیز نے ذوالقرنین کے تیسرے سفر کی جہت کا ذکر نہیں کیا اور قرینہ یہ بتاتا ہے کہ وہ شمال کی جانب تھا اور اسی جانب اس کی سدّ ہے جو قفقاز کے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے . . . .

. . . . اور جس غرض کے لئے ذوالقرنین نے سدّ بنائی تھی اسی غرض کے لئے اور بادشاہوں نے بھی سدّ تعمیر کی ہیں۔ مثلاً چینیوں نے دیوارِ چین بنائی

[۵۱] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۱۳ وطبری جلد ص ۲۵۶ - [۵۲] خلاصہ روح المعانی ج ۱۶ ص ۳۵ - [۵۳] کتاب التیجان۔

جس کو ہنگولین انگووہ اور ترک بوقورقہ کہتے ہیں صاحب ناسخ التواریخ نے اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور اسی طرح بعض عجمی بادشاہوں نے دربند (باب الابواب) کی سد کی تعمیر کی اور اسی طرح اور سد بھی ہیں جو شمال ہی کی جانب ہیں۔ [1]

(۲)

اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں کاکیشیا کے علاقہ یا بحرِ قزوین کے کنارہ واقع دربند (باب الابواب) کے متعلق جو مقالہ ہے اس میں تحریر ہے۔

یہاں جو دربند ہے یزدگرد اول نے دوبارہ صاف کرایا اور اس کی مرمت کرائی۔ اس دیوار کو سکندرِ اعظم کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ [2]

اور دوسری جگہ بحرِ خزر کے متعلق تحریر ہے۔

"رسالہ اخوان الصفا میں جو بحرِ یاجوج وماجوج کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد بحرِ کاسپین یعنی بحرِ خزر ہے [3]

پس عرب مؤرخین، محدثین، مفسرین اور محققینِ تاریخ کے ان حوالجات سے چند امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) کوئی ایک مورخ بھی یہ صراحت نہیں کرتا کہ دربند ضلع حصار کی سد "سدِ سکندری" ہے۔

(۲) ابوالفداء اور بعض مورخین کو دربند کے متعلق یہ غلط ہوگیا ہے کہ وہ بحرِ قزوین والے دربند کا ذکر شروع کرتے ہیں اور پھر ترمذ و بخارا والے دربند (حصار) کے ساتھ اس کو ملا دیتے ہیں اور دونوں کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

(۳) باقی تمام محققین، مورخین ہوں یا محدثین و مفسرین امتیاز کے ساتھ یہ تصریح کر رہے ہیں کہ جو سد "سدِ سکندری" کے نام سے مشہور ہے وہ وہی سد ہے جو بحرِ قزوین کے قریب دربند (باب الابواب) میں واقع ہے۔

چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور دائرۃ المعارف بستانی میں بھی (جو کہ جدید و قدیم تحقیق کا ذخیرہ ہیں) یہی ہے۔ حتیٰ کہ برٹانیکا جلد ۳ ص ۵۲۶ طبع یازدہم میں جو دربند ضلع حصار کا مختصر حال بیان کیا ہے اس میں بھی اس سد کو سد سکندری نہیں بتایا بلکہ اس کے

---

[1] ملخص عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۱۹۸۔ [2] ج ا ص ۹۴۰۔ [3] ص ۱۱۴۲ بحث یاجوج وماجوج۔

عکس بحر قزوین والے دربند کی سد کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس کی نسبت سکندر کی جانب کی جاتی ہے اور اس لئے سدِ سکندری کے نام سے مشہور ہے۔

(۴) وہب بن منبہ، ابو حیان اندلسی، صاحب ناسخ التواریخ (جو ایران کا درباری مورخ ہے) بستانی اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ نے دربند بحرِ قزوین کے متعلق یہ توجہ دلائی ہے کہ سدِ ذوالقرنین اس دربند بحرِ قزوین ... ہے بلکہ اس سے بھی اوپر قفقاز کے آخری کنارہ پر پہاڑوں کے درمیان واقع ہے چنانچہ مولانا ابو الکلام نے اپنی تفسیر میں اس کو درۂ داریال کے نام سے ذکر کیا ہے۔

اب ان چاروں باتوں سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیجئے اور اس مسئلہ میں بھی سابق کی طرح قرآنِ عزیز ہی کو حکم بنائیے تاکہ معاملہ واضح سے واضح تر ہو جائے۔

"سدِ ذوالقرنین" کے متعلق قرآنِ عزیز نے دو باتیں صاف صاف بیان کی ہیں ایک یہ کہ وہ سد دو پہاڑوں کے درمیان تعمیر کی گئی ہے اور اس نے پہاڑوں کے درمیان اس "درہ" کو بند کر دیا ہے، جہاں سے ہو کر یاجوج و ماجوج اس جانب کے بسنے والوں کو تنگ کرتے تھے "حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ (ای بین الجبلین) وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ" یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان دونوں کے اس طرف ایک ایسی قوم کو پایا جن کی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھتا تھا وہ کہنے لگے اے ذوالقرنین بلاشبہ یاجوج و ماجوج اس سرزمین میں فساد مچاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ سد چونے یا اینٹ گارے سے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ لوہے کے ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے جس میں تانبا پگھلا ہوا شامل کیا گیا تھا "اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ حَتّٰىٓ اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰىٓ اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا" میں تمہارے اور ان کے (یاجوج و ماجوج کے) درمیان ایک موٹی دیوار قائم کر دوں گا۔ تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لا کر دو یہاں تک کہ پہاڑ کی دونوں پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان جب دیوار

---

[1] سدین کی تفسیر

کو برابر کر دیا تو اس نے کہا کہ دھونکو یہاں تک کہ جب دھونک کر اس کو آگ کر دیا، کہا لاؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا کہ اس پر ڈالوں۔ سہ

قرآن عزیز کی بتائی ہوئی ان دونوں صفات کو سامنے رکھکر اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ بغیر کسی تاویل کے ان کا مصداق کونسی سد ہو سکتی ہے اور کس سد پر یہ صفات ٹھیک صادق آتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس سد پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو دربند (حصار) میں واقع ہے۔ اس سد کے حالات ساتویں صدی کے ایک چینی سیاح نے ہی نہیں بیان کیے ۲ (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) شاہ رخ کے جرمنی مصاحب سیلدبرجر اور ہسپانوی سفیر کلافیجو نے بھی پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس کا مشاہدہ کیا ہے اور انھوں نے بھی یہ کہا ہے کہ یہاں آہنی پھاٹک لگے ہوئے ہیں مگر مورخین یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ سد (دیوار) پتھر اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے اور آہنی دروازوں کے علاوہ دیوار کسی جگہ بھی لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے اور لوہے کے پھاٹکوں کی وجہ سے اس کو بھی اسی طرح درۂ آہنی کہتے ہیں جس طرح دربند (بحر قزوین) کو درۂ آہنی کہا جاتا ہے۔

نیز یہ دیوار جس طرح پہاڑوں کے درمیان میں چلی گئی ہے اسی طرح اس کا ایک حصہ سطح زمین پر بھی بنایا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ صرف دو پہاڑوں کی پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان ہی میں قائم کی گئی ہو۔

پس اس دیوار کو سد ذوالقرنین کہنا قرآنی تصریحات کے قطعاً خلاف ہے اور غالباً اسی وجہ سے

سہ امام بخاری نے "ترجمۃ الباب" میں روایت کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے اس میں ہے۔

ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی، یا رسول اللہ میں نے سد کو دیکھی ہے وہ ایسی ہے جیسے مینی چادر "مثل البرد المحبر" آپ نے فرمایا تو نے ضرور اس کو دیکھا ہے "قد رأيته"

یہ روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس شخص نے لوہے تانبے سے مخلوط بنی ہوئی دیوار کو دیکھا کیونکہ "حبرہ" کے معنی اس زردی کے آتے ہیں جو دانتوں پر جمی ہوئی نظر آتی ہے اور مینی چادریں سیاہ و زرد یا سیاہ اور سرخ مخلوط دھاری دار ہوتی تھیں۔ اس روایت کے موصول ہونے نہ ہونے پر کلام ہے جو فتح الباری میں قابل مراجعت ہے

سلہ وسلہ الجواہر طنطاوی ج ۹ ص ۹۸۔

کسی ایک مورخ نے بھی (جو کہ دربند (حصار) اور دربند (بحرِ قزوین) کے درمیان امتیاز کر سکے ہیں) اس دیوار (سد) کو سدِ ذوالقرنین یا سدِ سکندری نہیں کہا۔

مگر تعجب ہے محترم مدیر صاحب صدق سے کہ انھوں نے قرآنی تصریحات کو سامنے رکھے بغیر تمام مؤرخین کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ دربند (حصار) کی دیوار (سد) ہی "سدِ سکندری" یعنی سدِ ذوالقرنین ہے۔ شاید وہ اس جدت کے لئے اس لئے مجبور ہوئے ہیں کہ ایک تو ان کا مسلک یہ ہے کہ سکندرِ مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسرے اس جانب میں سکندر کی فتوحات کی آخری حد اسی علاقہ تک ہے جیسا کہ ۱۰ اگست ۱۹۵۱ء کے صدق کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

"سکندر اعظم اپنی تسخیری فوج کشی میں اسی علاقہ تک گیا تھا"

ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کی صراحت کے بعد وہ مجبور ہیں کہ دربند (حصار) کی سد ہی کو سدِ ذوالقرنین تسلیم کریں مگر اس سے زیادہ یہ ظاہر ہے کہ اس سد پر نہ قرآن عزیز کی بیان کردہ صفات ہی کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ کوئی مورخ ہی اس کو سدِ سکندری یا سدِ ذوالقرنین کہتا ہے اور بالفرض اگر اس کو سکندر کی تعمیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی وہ سدِ ذوالقرنین کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ قرآنی صفات کے مطابق نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسرا نمبر دربند (بحرِ قزوین) کی دیوار (سد) کو زیرِ بحث لانے کا ہے اس کے متعلق یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس کو عرب باب الابواب اور الباب کہتے ہیں اور اہلِ فارس دربند اور درۂ آہنی نام رکھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی کثرت سے مورخین اس دربند کی دیوار (سد) کو سدِ سکندری کہتے چلے آئے ہیں مگر محققین یہ بھی کہتے چلے آئے ہیں کہ بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہے البتہ اس کو سدِ سکندری بھی کہہ دیتے ہیں اور کاکیشین وال (کاکیشیا کی دیوار) بھی اور دیوار نوشیرواں بھی۔

لیکن ہم اس بحث کو مؤخر کرتے ہوئے کہ اس کے متعلق یہ اضطراب بیانی کیوں ہے اس سد کو سدِ ذوالقرنین جب ہی مان سکتے ہیں کہ یہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ ہر دو صفات کے مطابق

پوری اترے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اس لئے کہ اس دیوار کے عرض وطول اور اس کے حجم کی تفصیل دیتے ہوئے تمام مورخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس دیوار کا بھی بہت بڑا حصہ سطح زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اور آگے بڑھکر پہاڑ پر بھی بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ ... دیوار بعض جگہ دوہری بھی اور اس میں متعدد لوہے کے پھاٹک بھی ہیں جن میں سے بعض بعض ... وں کے درمیان قائم ہیں اور پہاڑوں پر اس کے استحکامات بھی بہت ہیں۔ تاہم یہ دیوار لوہے کے ٹکڑوں اور تانبے سے نہیں بنائی گئی بلکہ عام دیواروں کی طرح پتھر اور چونہ ہی سے بنائی گئی ہے۔ پس اس کا بانی کوئی شخص بھی ہو اس دیوار کو سدذوالقرنین کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ا ... کو سد سکندری کہنا، سو ہمیں اس سے انکار کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر تاریخی حقائق اس دعوے کا ساتھ دیتے مگر حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی مورخین جب سکندر مقدونی کا ذکر کرتے اور اس کی وسعت فتوحات کو زیر بحث لاتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ سکندر اعظم کاکیشیا تک پہنچا ہے۔

او ... بقول مولانا ابوالکلام

لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلمبند کر دئے ہیں اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابل اطمینان تسلیم کرلی جائیں [1]

یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سکندر اعظم کی جانب یہ انتساب صحیح ہے۔

امریکہ کے ایک مشہور جغرافیہ دان کریم (Cram.) نے اپنے جغرافیہ کریمس یونیورسل اٹلس (Crame's Universal Atlas.) میں سکندر اعظم کی سلطنت ۳۳۱-۳۰۱ ق م کا جو مکمل نقشہ تیار کیا ہے اس میں بھی کاکیشیا کا علاقہ اس کی فتوحات سے سینکڑوں میل دور نظر آتا ہے۔

بہرحال اکثر مورخین ... تو اس کا بانی نوشیرواں کو بتاتے ہیں، اور جوزیفس سکندر کو اس کا بانی قرار دیتا ہے مگر بیان کردہ تاریخی حقائق کے پیش نظر نہ انوشیرواں کی نسبت صحیح ہے اور نہ

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۲۸ [2] ص ۲۰۸۔

سکندرِ اعظم کی اور اگر ان دونوں میں سے کسی کی نسبت کو بالفرض صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی اس کو سدِ ذوالقرنین کہنا اقتضائے قرآنی سے آنکھیں بند کر لینا ہوگا۔ پس دربند (حصار) ہو یا دربند (بحرِ خزر) دونوں کی سد "سدِ ذوالقرنین" نہیں ہے۔

"تیسری قابلِ تذکرہ سد" ہے جو دربند (قزوین) یا کاشین وال کے مغرب جانب میں ایک درہ کو بند کرتی ہے یہ درہ دربند سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں آگے بڑھتے ہوئے ملتا ہے اور درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور قفقاز اور تفلس کے درمیان واقع ہے یہ درہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے ہوکر گذرا ہے اور قدرتی طور پر پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے اس کو فارسی میں درۂ آہنی اور ترکی میں دامر کپو کہتے ہیں۔

اس درہ کے متعلق گذشتہ صفحات میں امام رازیؒ کی تفسیر سے اس تشریح کے بعد کہ یہ دو پہاڑ جن کے درمیان سد واقع ہے قفقاز میں ہے۔" ہم ابن خرداذ کی کتاب المسالک والممالک کا یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں کہ واثق باللہ نے جب اپنے خواب کی تعبیر کے پیشِ نظر "سدِ ذوالقرنین" کی تحقیق کے لئے تحقیقاتی وفد (ریسرچ کمیشن) مقرر کیا اور اس نے باب الابواب (دربند) سے آگے چل کر جب اس کا مشاہدہ کیا ہے تو تصریح کی ہے کہ یہ دیوار تمام کی تمام لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے بنائی گئی ہے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ان الواثق بالله رائى فى المنام كانه فتح هذا الردم فبعث بعض الخدم اليه ليعاينوه فخرجوا من باب الابواب حتى وصلوا اليه وشاهدوه فوصفوا انه بناء من لبن من حديد مشدود بالنحاس المذاب ... [illegible]

سلہ دربند نامہ ... ص ۲۱۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بعض معاصر بزرگ زیرِ بحث سد کے متعلق یہ شک ظاہر کرتے ہیں کہ یاقوت نے واثق باللہ کے تحقیقاتی وفد کی تفصیلات دیتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ اس سفر کی آمد و رفت میں چھ ماہ صرف ہوئے ہیں اگر ذوالقرنین کی سد درہ داریال کی سد ہوتی تو بغداد سے کاکیشین (کوہِ قاف) کی راہ ایسی طویل نہیں ہے کہ یہ وفد اتنی مدت میں واپس آتا۔

مگر یہ شک "صرف ایک قیاسی مغالطہ ہے اس لئے کہ اول تو یاقوت حموی نے اس واقعہ کی تفصیلات کو خود ہی اہمیت نہیں دی اور ایک داستان کی طرح اس کو ذکر کر دیا ہے۔ جیسا کہ سلام ترجمان سے منقول اس داستان کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے۔

قد كتبت من خبر السد ما وجدته فى الكتب میں نے سد کے حالات میں ان واقعات کو لکھ لیا ہے ...

پس جبکہ آج کے مشاہدے سے بھی یہ ثابت ہے کہ داریال کا یہ درہ پہاڑوں کی دو چوٹیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور تاریخی حقائق بھی اس کو تسلیم کرتے اور واضح کرتے ہیں، نیز واثق باللہ کے کمیشن نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ یہ دیوار لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے تیار کی گئی ہے، تو بلاشبہ یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ یہی دیوار وہ "سدِ ذوالقرنین" ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں کیا ہے۔ کیونکہ قرآن عزیز کے بتائے ہوئے دونوں وصف صرف اسی دیوار پر منطبق ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہبؒ، ابوحیان، ابن خردادبہ، علامہ انور شاہؒ اور مولانا آزادؒ جیسے محققین کی یہی رائے ہے کہ سدِ ذوالقرنین قفقاز کے اسی درہ کی سد کا نام ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم کو کہنے دیجئے کہ درۂ داریال کی یہ "سد" سائرس (گورش یا کیخسرو) کی تعمیر کردہ ہے اور "جیسا کہ ہم یاجوج و ماجوج کی بحث میں بیان کر چکے ہیں" یہ ان وحشی قبائل کے لئے اس نے بنائی تھی جو کاکیشیا کے انتہائی علاقوں سے آکر اور اس درہ میں سے گذر کر قفقاز کے پہاڑوں کے اس طرف بسنے والوں پر لوٹ مار مچاتے تھے اور یہ وہی سیتھین قبائل تھے جو سائرس کے زمانہ میں حملہ آور ہو رہے تھے اور اس وقت کے یاجوج و ماجوج کا مصداق یہی قبائل تھے اور ان ہی کی روک تھام کی ضرورت سے سائرس نے ایک قوم کی شکایت پر یہ "سد" تیار کی اور ارمنی نوشتوں میں اس سد کا جو قدیم نام "بہاک گورائی" (گور کا درہ) لکھا چلا آتا ہے اس گور سے مراد غالباً گورش ہے جو سائرس ہی کا فارسی نام ہے۔

اور اس کے قریب دربند (بحرِ خزر) کی دیوار اس کے بعد اسی غرض سے کسی دوسرے بادشاہ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰) ولست اقطع بصحتہا اور دتہ لاختلاف الروایات فیہ واللہ اعلم بصحتہ (معجم البلدان ج ۵) جن کو میں نے کتابوں میں لکھا پایا اور میں نے یہ جو کچھ بھی نقل کیا ہے میں ہرگز اس پر یقین نہیں کرتا کیونکہ اس سلسلہ میں مختلف روایات ہیں جن کی صحت پر دوسرے مدتِ سفر کی اس تصریح پر حسب کچھ کہا جا سکتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ تفصیلات بھی بیان کی جاتیں کہ ذرائع رسل و رسائل کیا تھے، درمیانی مقامات میں آمد و رفت کے موقعوں پر کس قدر قیام رہا اور مقامِ مطلوب میں مدتِ قیام کیا رہی جبکہ عراق سے کاکیشس (جبل قوقایا) کی پہاڑیوں تک تقریباً آٹھ سو نو سو میل کی یکطرفہ مسافت ہے۔

علاوہ ازیں اس واقعہ کا ذکر ابن خلدون ابن خردادبہ ابن کثیر رحمہم اللہ جیسے محقق مورخین و جغرافیہ دان بھی کرتے ہیں اور اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ واثق باللہ کا یہ وفد اسی زیرِ بحث "سد" تک گیا ہے اور واپس ہو کر اسی کے حالات اس نے خلیفہ کو سنائے ہیں۔

ہنوائی ہے اور انوشیرواں نے اپنے زمانہ میں اس کو دوبارہ صاف اور درست کرایا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے حوالہ سے ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور ان تینوں دیواروں (سد) میں سے سکندر کی بنائی ہوئی کوئی ایک سد بھی نہیں ہے اس لئے کہ سکندر کی فتوحات کی تاریخ جو کہ سامنے ہے اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سکندر کو اس غرض کے لئے کسی سد قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو کیونکہ اس کی حکومت کے سارے دور میں یاجوج و ماجوج قبائل کا کوئی حملہ تاریخ میں موجود نہیں ہے اور نہ دربند (حصار) تک پہنچ کر کسی قوم کا اس قسم کے وحشی قبائل سے دوچار ہونا اور سکندر سے اس کی شکایت کرنا تاریخی حقایق میں کہیں نظر آتا ہے۔

البتہ یہ بات ضرور قابلِ غور ہے کہ آخر دربند (بحرِ قزوین یا بحرِ خزر) کی دیوار کے متعلق سدِ سکندری کیوں مشہور ہوا، سو اس مسئلہ کے تمام حقائق کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد بآسانی اس کا یہ حل سمجھ میں آجاتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق یہود کی مذہبی روایات سے بہت زیادہ وابستہ ہے اور اسی لئے یہود کے سوال پر قرآنِ عزیز نے بھی اس کا ذکر کیا ہے تو اس بدعت اور غلط انتساب کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے جوزیفس نے اس کے متعلق یہ بلا دلیل بیان کیا کہ یہ سد "سدِ سکندری" ہے اور وہیں سے یہ روایت چل گئی۔ اور مورخینِ اسلام میں سے محمد بن اسحٰق نے بھی چونکہ سکندر یونانی کو ذوالقرنین بتایا اس لئے مسلمانوں نے بھی اس سد کو سدِ سکندری کہنا شروع کر دیا اور آخرکار اس انتساب نے شہرت حاصل کر لی۔

مذکورہ بالا سد کے متعلق اگرچہ اکثر عرب مورخین یہی کہتے جاتے ہیں کہ وہ انوشیرواں کی بنائی ہوئی ہے مگر "محققین" کی رائے یہ ہے کہ اس کے بانی کا صحیح علم نہیں حاصل ہو سکا البتہ تاریخی قیاسات سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اس کی مرمت اور درستی انوشیرواں نے اپنے زمانہ میں کرائی ہو اور اسی وجہ سے وہ انوشیرواں کی جانب منسوب کر دی گئی ہو۔ بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سد کو "سدِ سکندری" کہنا ایک افواہی انتساب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نیز سکندر مقدونی جو انگریزی

تاریخوں میں "گریٹ الیگزنڈر" کہا جاتا ہے۔ کسی طرح "ذوالقرنین" نہیں ہو سکتا اور نہ "سد ذوالقرنین" سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

یاجوج و ماجوج کا خروج

ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج اور سد کی بحث کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ یاجوج و ماجوج کے اس خروج کا ہے جس کا ذکر قرآنِ عزیز نے کیا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق علاماتِ قیامت سے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ "خروجِ یاجوج و ماجوج" کا مسئلہ کہ جس کی خبر قرآنِ عزیز نے بطور پیشین گوئی کے دی ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو محض ظنی قیاسات سے حل کر لیا جائے اور جبکہ اس مسئلہ کا تعلق قرآنِ عزیز کے "اخبارِ مغیبات" سے ہے تو پھر اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق بھی قرآنِ عزیز ہی کو پہنچتا ہے نہ کہ ظن و تخمین کو۔ قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں بیان کیا ہے اور اس مسئلہ سے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ صرف ان دو ہی سورتوں میں مذکور ہے۔

سورۂ کہف میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا	پس نہیں طاقت رکھتے وہ (یاجوج و ماجوج) اس سد پر چڑھنے کی
اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا. قَالَ هٰذَا	اور نہ وہ اس میں سوراخ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں (ذوالقرنین)
رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ	نے کہا یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے پھر جب میرے رب کا
رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ	وعدہ آئے گا تو اس کو گرا کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے پروردگار
وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا (کہف)	کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ	یہاں تک کہ جب کھول دئیے جائیں گے یاجوج اور ماجوج اور وہ
وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ	زمین کی بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اتر آئیں گے اور خدا کا سچا
وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ	وعدہ قریب آجائے تو اس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے
اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا	کفر کیا ہے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی (اور پکار

فِیْ غَفْلَۃٍ مِّنْ ھٰذَا بَلْ کُنَّا ظٰلِمِیْنَ ۔   اٹھیں گے) ہائے کمبختی ہماری کہ ہم بے خبر رہے ۔

ان دونوں مقامات میں قرآن عزیز نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ جس زمانہ میں "ذوالقرنین" نے "یاجوج وماجوج" پر سد قائم کی تو اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ یہ قومیں نہ اس کو پھاند کر اس جانب آسکتی تھیں اور نہ اس میں سوراخ پیدا کرکے اس کو عبور کر سکتی تھیں اور سد کی اس مضبوطی اور پائیداری کو دیکھکر ذوالقرنین نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ یہ سب کچھ خدا کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مجھ سے یہ نیک خدمت کرادی ۔

اور دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ جب قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تو یاجوج وماجوج بیشمار فوج در فوج نکل کر دنیا میں پھیل جائیں گے اور لوٹ مار و تباہی و بربادی مچادیں گے ۔

ان دونوں باتوں سے عام طور پر مفسرین سے یہ سمجھا ہے کہ یاجوج وماجوج "سدِ ذوالقرنین" میں اس طرح محصور ہوگئے ہیں کہ یہ سد قیامت تک اسی طرح صحیح وسالم کھڑی رہے گی اور جب یاجوج وماجوج کے خروج کا وقت آئے گا" اور وہ قیامت کے قریب اور علاماتِ قیامت میں سے ہوگا تو اس وقت یکبارگی "سد" گر کر ریزہ ریزہ ہوجائیگی اور اس لئے انھوں نے دونوں مقامات میں اسی فہم کے مطابق آیات کی تفسیر کی ہے. چنانچہ انھوں نے سورۂ انبیا کی اس آیت کا حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج کا یہ ترجمہ کرکے "یہانتک کہ جب یاجوج وماجوج سد توڑ کر کھول دئے جائیں گے" اس ارشادِ الٰہی کو ذوالقرنین کے اس مقولہ کے ساتھ جوڑ دیا جو کہف میں مذکور ہے۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ ۔ "پھر میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کر دیگا"۔

مگر آیات کے سیاق وسباق اور ان کے مفہوم پر غائر نظر ڈالنے سے یہ تفسیر آیاتِ قرآنی کا حق ادا نہیں کرتی ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے سورۂ کہف میں تو صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یاجوج وماجوج پر جب ذوالقرنین نے سد تعمیر کردی تو اس کے استحکام کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہدیا کہ جب میرے خدا کا وعدہ آجائے گا تو یہ سد ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور خدا کا وعدہ برحق ہے اور

اس کے خلاف ہونا محال و ممتنع۔

مگر اس جگہ یاجوج وماجوج کے اس خروج کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قیامت کے قریب وقوع میں آئیگا اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ یہ تو ذوالقرنین کا اپنا مقولہ ہے جو سد کے مستحکم اور مضبوط ہونے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اور خروج یاجوج وماجوج ان اخبار مغیبات میں سے ہے جو علامات ساعت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان کیا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اقوام عالم کے لئے ایک تنبیہ ہے کہ خدا کی یہ زمین اپنے آخری لمحات میں ایک سخت اور ہولناک عالمگیر حادثہ سے دوچار ہونے والی ہے۔

اور سورۂ انبیا میں صرف یہ مذکور ہے کہ قیامت کے قریب یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور وہ بہت سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب فساد بپا کرنے کے لئے امنڈ پڑیں گے اور اس جگہ سد کا اور سد کے ریزہ ریزہ ہو کر اس سے یاجوج وماجوج کے نکلنے کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے اور لفظ "فتحت" سے ایسا سمجھنا محض قیاس و تخمینی ہے جیسا کہ عنقریب واضح ہوگا۔

پس سورۂ کہف اور سورۂ انبیا دونوں میں اس واقعہ سے متعلق آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ سورۂ کہف میں تو پہلے اس واقعہ کی تفصیلات سنائی گئی ہیں جن کے متعلق یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خود یا مشرکین مکہ کے واسطہ سے سوال کیا تھا کہ ذوالقرنین کی شخصیت کے متعلق اگر کوئی علم رکھتے ہو تو اس کو ظاہر کرو؟ قرآن عزیز یعنی وحی الٰہی نے ان کو بتایا کہ ذوالقرنین ایک نیک اور صالح بادشاہ تھا۔ اس نے تین مہیں قابل ذکر سر کیں ایک مشرقِ اقصیٰ کی اور دوسری مغربِ اقصیٰ کی اور تیسری شمال کی جانب اور اس تیسری مہم میں اس کو ایک ایسی قوم سے سابقہ ہوا جس نے یاجوج وماجوج کی تباہ کاریوں کا شکوہ کرتے ہوئے اپنے اور ان کے درمیان سد قائم کر دینے کا مطالبہ کیا۔ ذوالقرنین نے ان کے مطالبہ کو اس طرح پورا کیا کہ اس جانب وہ جس درہ سے نکل کر حملہ آور ہوا کرتے تھے اس کو لوہے کی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے سے بند کر دیا اور دو پہاڑوں کے درمیان درہ پر ایک بہترین سد قائم کر دی۔ اور ساتھ ہی شکرِ خدا

بجالاتے ہوئے اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ یہ سد اس قدر مستحکم اور مضبوط ہے کہ اب یاجوج وماجوج نہ اس میں سوراخ کر سکیں گے اور نہ اس پر چڑھ کر ادھر آسکیں گے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ سد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح رہے گی بلکہ خدا کو جب تک منظور ہے یہ اسی طرح قائم ہے اور جب وہ چاہے گا کہ یہ روک باقی نہ رہے تو یہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور خدا کا وعدہ یعنی ہر شے کی طرح سد کا بھی فنا ہو جانا" پورا ہو کر رہے گا۔

یہود نے چونکہ صرف ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا تھا اس لئے سورۂ کہف میں اسی کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا اور یاجوج وماجوج کا محض ضمنی تذکرہ آگیا۔ اور سورہ انبیاء میں اللہ تعالیٰ مشرکین کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو بستیاں ہلاک کر دی گئیں اب ان کے باشندے دنیا میں زندہ نہیں واپس آئیں گے ہاں جب قیامت آجائے گی" اور وہ جب آئے گی کہ اس سے پہلے یاجوج وماجوج کا فتنہ پیش آئے گا" تب البتہ میدانِ حشر میں سب دوبارہ زندہ کرکے رب العالمین کے سامنے جوابدہ ہونے کے لئے جمع کئے جائیں گے۔

پھر چونکہ اس جگہ یاجوج وماجوج کے خروج کو قیامت کی علامت بیان کرکے اہمیت دی گئی ہے اس لئے ان کے نکلنے کو سد کے ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہونے کے ساتھ مقید نہیں کیا بلکہ سرے سے سد کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ جب ان کے خروجِ موعود کا وقت آجائے گا تو سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب امنڈ پڑیں گے اور تمام اقطاع وامصار میں پھیل جائیں گے۔

پس ان مجموعۂ آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ "سدِ ذوالقرنین" یاجوج وماجوج کے خروج سے پہلے ضرور ٹوٹ پھوٹ چکی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ یاجوج وماجوج کے موعود خروج کا وہ وقت ہوگا کہ قیامت کا وقت بالکل قریب ہو جائے اور اس کے بعد "نفخ صور" ہی کا مرحلہ باقی رہ جائے اس وقت یاجوج وماجوج کے تمام قبائل بے پناہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑیں گے اور تمام کائنات میں فسادِ عظیم برپا کریں گے۔

بہرحال ذوالقرنین کے مقولہ" اذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء" میں" وعدہ" سے یاجوج وماجوج

کا خروج موعود مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ بلاشبہ "سد" کا اندکاک ہو جائے گا اور وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور سورۂ انبیا میں خدائے تعالیٰ کے ارشاد "فتحت یاجوج و ماجوج" میں فتح سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سد توڑ کر نکل آئیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کثرت سے فوج در فوج نکل پڑیں گے گویا انہیں بند تھے اور آج کھول دیئے گئے ہیں۔

چنانچہ اہل عرب لفظ "فتح" کو جب جاندار اشیاء کے لئے استعمال کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ یہ کسی گوشہ میں الگ تھلگ پڑی ہوئی تھی اور اب اچانک نکل پڑی۔ اس لئے جب کوئی شخص کہتا ہے کہ "فتح الجراد" تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ٹڈیاں کسی جگہ بند تھیں اور اب ان کو کھول دیا گیا بلکہ یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ ٹڈی دل کسی پہاڑی گوشہ میں الگ پڑا تھا کہ اب اچانک فوج در فوج باہر نکل پڑا۔

پس یہاں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ یاجوج و ماجوج جیسے عظیم الشان قبائل جو عرصہ سے بایں کثرت و اژدہام دنیا کے ایک الگ گوشہ میں پڑے ہوئے تھے اس دن اس طرح امنڈ آئیں گے کہ گویا بند تھے اور اب اچانک کھول دیئے گئے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی تفسیر رأس المحدثین حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ نے بھی عقیدۃ الاسلام میں یہی فرمائی ہے اور بلاشبہ یہ تفسیر بغیر کسی تاویل کے صحیح اور درست ہے اور اس سلسلہ کے بہت سے خدشات کو دور کرنے کے لئے مفید۔

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

وینبغي ان یعلم ان قول	اور یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ ذوالقرنین کا یہ قول
ذی القرنین هذا رحمة من ربی	"هذا رحمة من ربی الآیہ" اس کا اپنا قول ہے اور کوئی قرینہ
فاذا جاء وعد ربي جعله دكاء	سیاق و سباق میں ایسا موجود نہیں ہے جس سے سد کے
وكان وعد ربي حقا۔ قول	ریزہ ریزہ ہونے کے "واقعہ" کو علامات قیامت میں سے
من جانبه لا قرينة على جعله	شمار کیا جائے اور شاید ذوالقرنین کو یہ علم بھی نہ ہو کہ اشراط

منہ من اشراط الساعۃ ولعلہ لاعلم لہ بذلک وانما اراد وعد اندکاکہ فان قولہ تعالیٰ بعد ذلک وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض للاستمرار التجددی نعم قولہ تعالیٰ "حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون" ھو من اشراط الساعۃ لکن لیس فیہ للردم ذکر فاعلم الفرق الخ (ص ۲۰۱)

ساعت میں سے خروج یاجوج و ماجوج بھی ہے اور اس نے "وعدربی" سے صرف اس کا کسی وقت میں ٹوٹ پھوٹ جانا مراد لیا ہو پس اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہم نے چھوڑا ان کو اس دن کہ اس حالت میں کہ بعض بعض پر ہند رہے ہیں "استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے یعنی برابر ایسا ہوتا رہیگا کہ ان میں سے بعض قبائل بعض پر حملہ آور ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ خروجِ موعود کا وقت آجائے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جو کہ سورۂ انبیا میں ہے "حتی اذا فتحت" تو البتہ یہ بلاشبہ علاماتِ قیامت میں سے ہے لیکن اس میں سد کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے پس اس فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے"

اور پھر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

واعلم ان ما ذکرتہ لیس تاویلا فی القرآن بل زیادۃ شئ من التاریخ والتجربۃ بدون اخراج لفظۃ من موضوعہ الخ (ص ۲۰۴)

اور یہ یاد رہے کہ میں نے ان آیات کی تفسیر میں جو کچھ کہا ہے وہ قرآن میں تاویل نہیں ہے بلکہ قرآنِ عزیز کے کسی لفظ کو اس کے اپنے موضوع سے نکالے بغیر تاریخ اور تجربہ کے پیش نظر مزید اظہارِ حال ہے۔

عام مفسرین نے بیان کردہ تفسیر سے الگ سورۂ کہف اور انبیا دونوں کی آیاتِ متعلقہ کے واقعات کو اشراطِ ساعت میں شمار کرتے ہوئے جو تفسیر فرمائی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے ترمذی اور مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے اور جس کا ترجمہ یہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج وماجوج روزانہ ذوالقرنین کی سد کو کھودتے رہتے ہیں اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہو جاتا ہے تو آپس میں کہتے ہیں کہ اب کام ختم کرو اب یہ اس قابل ہو گئی ہے کہ کل تم اس کو کھود کر گرا سکو گے مگر جب وہ اگلے روز پھر اس کام پر واپس آتے ہیں تو سد کو اسی حالت سے

بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم پاتے ہیں، یہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے مگر جب ان کی معین مدت کا وقت پورا ہو جائیگا اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا کہ اب وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں تو اس روز بھی سابق کی طرح اس کو کھودیں گے اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہوگا تو کام لینے والے کام کرنیوالوں سے کہیں گے اب واپس جاؤ کل انشاء اللہ تم اس کو کھود کر برابر کر سکو گے۔ اور آج چونکہ انشاء اللہ کہدیا اس لئے جب واپس آئیں گے تو اپنی محنت کو درست پائیں گے اور اس وقت وہ باقی محنت کر کے سد کو گرادیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے اور تمام روئے زمین کا پانی پی جائیں گے اور لوگ ان کے خوف سے قلعوں او پناہ گاہوں میں چھپ جائیں گے۔ پھر وہ دنیا کو مغلوب سمجھکر آسمان پر تیر پھینکیں گے کہ خدا اور عالم بالا سے جنگ کر کے اسکو بھی مغلوب کریں اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کرے گا تو وہ سمجھیں گے کہ ہم عالم بالا پر بھی غالب آگئے پھر اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جس سے وہ سب خود بخود مر جائیں گے۔

(ترمذی سورۂ کہف)

مگر ترمذی نے اس حدیث کو بیان کر کے حدیث کی حیثیت پر یہ حکم لگایا ہے کہ

ھذا حدیث حسن غریب انما نعرف	یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسی طریقہ سند سے ایسی
من ھذا الوجہ مثل ھذا	ہی اچھنبی باتیں جانا کرتے ہیں۔

یعنی ان کے نزدیک یہ روایت اپنے اعتبار سے منکر اور اچھنبی روایت ہے۔ اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ حکم لگاتے ہیں۔

اس حدیث میں مضمون کے لحاظ سے نکارت (اچھنبا) ہے اور اس کو مرفوع کہنا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنا غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبارؓ سے منقول ہے اور اس میں بھی یہ سب باتیں اسی طرح مذکور ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جو کہ اکثر کعب احبارؓ سے اسرائیلی قصے سنا کرتے تھے" اس کو ایک اسرائیلی کہانی کے طور پر بیان کیا ہوگا جس کو نیچے کے راوی نے یہ سمجھا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے درحقیقت یہ راوی کا وہم ہے اور کچھ نہیں ہے۔

اس حدیث کے متعلق میں نے یہ جو کچھ کہا ہے میرا اپنا خیال ہی نہیں ہے بلکہ امامِ حدیث احمد بن حنبلؒ بھی یہی فرماتے ہیں۔ (تفسیر ابنِ کثیر ج ۳ ص ۱۰۵)

ترمذی، ابنِ کثیر اور امام احمد کی ان تصریحات کے بعد اس روایت کی حیثیت ایک اسرائیلی قصہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی لہذا مفسرین کا محض اس روایت کی بنا پر سورۂ کہف کی زیرِ بحث آیات کی یہ تفسیر کرنا کہ "سدِ ذوالقرنین ٹھیک اس وقت ریزہ ریزہ ہوگی جبکہ اشراطِ ساعت میں سے موعود خروجِ یاجوج وماجوج پیش آئے گا" صحیح نہیں ہے۔

اور اگر ان کی تفسیر کا یہ حصہ صحیح مان لیا جائے تو پھر بھی وہ مذکورہ بالا روایت کے تسلیم کر لینے کے بعد قرآنِ عزیز کی آیت کے تعارض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اس لئے کہ قرآنِ عزیز (کہف) میں سد کے متعلق ذوالقرنین کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے "فما اسطاعوا ان یظهروہ وما استطاعوا لہ نقباً" اور اس کا مطلب تمام مفسرین نے بالاتفاق یہ بیان کیا ہے کہ یاجوج ماجوج اس سد میں کسی قسم کے ردوبدل پر قادر نہیں ہیں چنانچہ امام احمد اور ابنِ کثیر اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔

انھم لم یتمکنوا من نقبہ ولا نقب شئ منہ۔	بلاشبہ اب یعنی بنارِ سد کے وقت یاجوج وماجوج اس میں سوراخ کرنے یا کسی حصہ کو بھی کھودنے پر قادر نہیں رہے۔

تو اب مفسرین اس روایت کے اُن جملوں کے تعارض کو کس طرح دور فرمائیں گے جن میں یہ صراحت ہے کہ وہ اس کو کھود کر یا چاٹ کر گرنے کے قریب کر دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اس صحیح حدیث کے تعارض کو کس طرح دور کریں گے جس کو امام بخاریؒ نے بسندِ صحیح روایت کیا ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوابِ راحت سے بیدار ہوئے تو یہ حالت تھی کہ چہرۂ مبارک سرخ تھا اور یہ ارشاد فرما رہے تھے لا الٰہ الا اللہ ویل للعرب من شر قد اقترب فتح الیوم من ردم یاجوج وماجوج مثل ھذا وحلق قلت یارسول اللہ انھلک وفینا الصالحون؟ قال نعم اذا کثر الخبث۔

لا الٰہ الا اللہ عرب کے لئے ہلاکت ہے اس شر سے جو قریب آرہا ہے آج یاجوج وماجوج پر قائم شدہ

"سد" اس قدر کھول دی گئی ہے اور انگوٹھے پر انگلی رکھکر اور گول حلقہ بنا کر دکھایا حضرت زینبؓ بنت جحش فرماتی ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے جبکہ ہم میں صالحینِ امت بھی موجود ہوں گے۔ ارشاد فرمایا بیشک۔ ایسا ہوگا اگر امت میں خبائث کی کثرت ہو جائیگی۔

(بخاری و مسلم عن الزہری باب الفتن)

اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "سد" میں حلقۂ انگشت کی مقدار سوراخ ہو گیا ہے اور مفسرین کی اس تفسیر کے مطابق قیامت کے موعود وقت سے قبل یہ ناممکن ہے۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ اس صحیح بلکہ اصح روایتِ حدیثی میں "فتح" سے مراد شر اور فتنوں کا شیوع ہے اور اس کو استعارہ کے طور پر "فتح ردم" کہدیا گیا تو سورۂ انبیا کی آیت میں "فتحت" کے معنی میں یہ اصرار کیوں ہے کہ اس سے سد ٹوٹ کر کھلنا مراد ہے حالانکہ اس جگہ ردم یا سد کا تذکرہ تک نہیں ہے اور کیوں نہ اس سے بھی استعارہ مراد لیا جائے۔ اور کیوں وہ تفسیر نہ کی جائے جو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور اگر حدیث میں حقیقی نقب کا ذکر ہے تو یہ سورۂ کہف کی اس تفسیر کے خلاف اور معارض ہے جو مفسرین نے عام طور پر بیان کی ہے کہ سد کا یہ استحکام قیامت کے موعود وقت تک یونہی رہیگا اور سد کا اس سے قبل ٹوٹنا پھوٹنا ناممکن ہے۔

لیکن عام تفسیر کے برعکس اگر حضرت شاہ صاحب کی تفسیر کے مطابق ان دونوں مقامات کی تفسیر کی جائے کہ جس کی فی الجملہ تائید امام احمدؒ اور محدث ابنِ کثیرؒ کے اقوال سے بھی ہوتی ہے تو یہ سب مشکلات خود بخود دور ہو جاتی ہیں اور آیات کا مطلب اور حدیث کا مقصد بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔

چنانچہ ابنِ کثیرؒ آیت "وما استطاعوا لہ نقبا" کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

ای فی ذلک الزمان لان ھذہ صیغۃ خبر ماض فلا ینفی وقوعہ فیما یستقبل باذن اللہ لھم فی ذلک قدرًا وتسلیطھم علیہ	یعنی وہ (یاجوج و ماجوج) اس زمانہ میں سد کے متعلق ہر قسم کے ردو بدل سے بے بس ہو گئے ہیں اس لئے کہ "استطاعوا" کا صیغہ زمانہ ماضی کی اطلاع کیلئے وضع کیا گیا ہے۔ پس اس آیت میں اس بات کی ہرگز نفی نہیں نکلتی کہ زمانہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ ان کو

بالتدریج قلیلا قلیلا حتی یتم الاجل وینقضی الامر المقدور فیخرجون کما قال اللہ تعالیٰ "وھم من کل حدب ینسلون" [۱]

اس پر قدرت دے سکے وہ آہستہ آہستہ اور تدریجی طور پر اس سد کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ تا آنکہ وہ وقتِ موعود آپہنچے (جس کی خبر سورۂ انبیار میں دی گئی ہے) اور امر مقدر پورا ہوجائے اور تب وہ یک لخت یلغار کرکے اس طرح نکل پڑیں جس طرح سورۂ انبیار کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے" وھم من کل حدب ینسلون"

غرض اس عبارت کا مفہوم بھی وہی ہے جو حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ سے منقول ہوچکا ہے اور بغیر کسی تاویل کے آیت "وما استطاعوا الآیہ کا صاف طور پر یہی مطلب متعین ہوجاتا ہے کہ یہ ذوالقرنین کے زمانہ کی کیفیت خود ان ہی کی زبانی بیان ہو رہی ہے۔ یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں ہے کہ ذوالقرنین کی سدِ یاجوج وماجوج کے خروجِ موعود سے پہلے ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔

اور یہ مطلب ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ یاجوج وماجوج صرف اس ایک درے سے ہی نکلکر غارتگری نہیں کرتے تھے بلکہ ایشیا کے اس کونہ سے چین کے علاقہ منچوریا تک ان کے خروج کے بہت سے مقامات تھے پس اگر ان کے لئے سدِ ذوالقرنین نے درۂ داریال کی راہ ہمیشہ کے لئے مسدود کردی تھی تو دوسرے مقامات سے ان کا خروج کیوں نہیں ہوسکتا تھا؟

اسی لئے حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت "وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض" کی تفسیر یہ کی ہے کہ ذوالقرنین کے اس واقعہ میں چونکہ یاجوج وماجوج پر اس جانب سے روک قائم ہوجانے کا تذکرہ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے مقولہ کے بعد اپنی جانب سے اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اے مخاطبین تم جن یاجوج وماجوج قبائل کے متعلق یہ باتیں سن رہے ہو یہ بھی سن لو کہ ہم نے ان قبائل کے لئے یہ مقدر کردیا ہے کہ وہ آپس میں الجھتے رہیں گے۔ اور موج در موج باہم دست بگریباں ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ وہ وقت آجائے جبکہ قیامت بپا ہونے میں "نفخ صور" کے علاوہ اور کوئی مرحلہ باقی نہ رہے۔ اور سورۂ انبیار میں یہ ارشاد فرمایا کہ "نفخ صور" سے پہلے قیامت کی اشراط و

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۲

علامات میں سے ایک شرط یا علامت یہ پیش آئے گی کہ یاجوج وماجوج کے تمام قبائل اپنے نکلنے کے ہر مقام سے ایک ساتھ امنڈ آئیں گے اور دنیا کی عام غارت گری کے لئے اپنی مقامی بلندیوں سے تیزی کے ساتھ اترتے ہوئے کائنات کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گے" من کل حدب ینسلون" الحدب" لغت میں اوپر سے نیچے جھکنے کو کہتے ہیں۔ اس لئے "حدب" کے معنی اونچے مقام سے نیچے اترنے کے ہوتے ہیں اور "نسلان" عربی لغت میں پھسلنے کو کہتے ہیں اس لئے "ینسلون" کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس سرعت کے ساتھ امنڈ آئیں گے کہ یہ معلوم ہوگا گویا وہ کسی ٹیلے سے پھسل رہے ہیں۔ چنانچہ مفرداتِ امام راغب اور نہایہ ابنِ اثیر میں "حدب" اور "نسل ونسلان" کی بحث میں یہی لغوی تفصیل مذکور ہے۔

لہٰذا اس تفسیر سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ عزیز نے یاجوج وماجوج کے خروجِ موعود کی جو کیفیت بیان فرمائی ہے وہ ان ہی قبائل پر منطبق ہوتی ہے جو بحرِ کاسپین سے لیکر منچوریا تک پھیلے ہوئے ہیں اور جو دنیا کی بہت بڑی آبادی کے محور ہیں اور جار وقوع کے اعتبار سے عام سطح آبادی سے اس قدر بلند حصۂ زمین پر مقیم ہیں کہ جب کبھی نکل کر متمدن اقوام پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اوپر سے نیچے کو پھسل رہے ہیں پس آئندہ بھی جب اشراطِ ساعت کی شکل میں ان کا آخری خروج ہوگا تو ان کے تمام قبائل کا سیلاب ایک دفعہ ہی امنڈ آئیگا اور ایسا معلوم ہوگا کہ انسانوں کے سمندر کا بند ٹوٹ گیا ہے اور وہ اپنے مقامات کی ہر بلندی سے نیچے کی جانب بہہ پڑا ہے۔

قرآنِ عزیز کی آیاتِ زیرِ بحث کی یہ تفسیر الفاظ اور جملوں کو ان کے لغوی معنی سے اِدھر اُدھر ہٹائے اور ان میں تاویل کے بغیر اس قدر لطیف ہے کہ جس سے بہت سے وہ شکوک وشبہات یک قلم دفع ہو جاتے ہیں جو اس سلسلہ میں مفسرین کو پیش آئے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لئے غیر جاذب تاویلات کرنی پڑی ہیں۔ نیز مدعیانِ نبوت کو ان تاویلات سے فائدہ اٹھا کر الحاد وزندقہ پھیلانے کا موقعہ میسر آگیا ہے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی آیات کی اس تفسیر کے بعد اب حدیث بخاری کا مرحلہ باقی

رہ جاتا ہے کہ اس کی کیا مراد ہے ؟ حدیث " ویل للعرب من شر قد اقترب " اس بات پر تو صاف دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا میں ' جو نبی کے لئے وحی کی طرح صحیح اور حجت ہوتا ہے " یہ دکھایا گیا کہ سد یاجوج و ماجوج میں رخنہ پڑ جانے سے ایسا سخت حادثہ پیش آنے والا ہے جو عرب کے لئے ہولناک ثابت ہوگا لیکن یہ بات پوری طرح وضاحت کے ساتھ سامنے نہ آسکی کہ " فتح من ردم یاجوج وماجوج " میں لفظ " فتح " سے حقیقی معنی مراد ہیں کہ واقعی یاجوج وماجوج کی سد میں سے انگوٹھے اور انگلی کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار میں شگاف ہو گیا ہے یا پیشینگوئیوں کی طرح اس پیشینگوئی میں بھی " فتح " اور " خلق تسعین " کو استعارہ کی شکل میں بیان کیا گیا ہے ۔ نیز یہ کہ اس جملہ کا پہلے جملہ " ویل للعرب " سے کوئی ربط ہے یا یہ الگ الگ دو مستقل باتیں ہیں ؟

ان دونوں مسئلوں کے متعلق اہل تحقیق کی رائے مختلف ہے اور چونکہ اس رویا رصادقہ کی تعبیر خود ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار سے بسند صحیح منقول نہیں ہے ۔ اس لئے محدثین اور ارباب سیر نے یہ کوشش فرمائی ہے کہ وہ اس حدیث کے مصداق کو تقریبی طور پر متعین فرمائیں ۔

شیخ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ " ویل للعرب الخ " کے جملہ میں ان شرور و فتن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو آپ کی وفات کے بعد ہی امت میں رونما ہونے شروع ہو گئے اور جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں سب سے پہلے عرب (قریشی حکومت) کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا اور جن کی ہلاکتوں کا پہلا شکار اہل عرب ہی ہوئے اور بعد میں ان کا اثر تمام امت مرحومہ پر پڑا ۔

اور ردم (سد) میں انگلی اور انگوٹھے کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار رخنہ پیدا ہو جانے کا ذکر تقریبی ہے یعنی یہ مقصد نہیں ہے کہ واقعی اتنا چھوٹا سا رخنہ پڑ گیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سد ذوالقرنین کے استحکامات کی مدت ختم ہو گئی اور اب اس میں رخنہ پڑنے کی ابتدا ہو چلی ہے گویا اب وہ آہستہ آہستہ شکست و ریخت ہو جائے گی ۔ [1]

---

[1] عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۳۵ ۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ بھی قریب قریب یہی فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رویا رصادقہ کے بعد قتلِ عثمان (رضی اللہ عنہ) کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر متواتر فتن اور شرور کا سلسلہ جاری ہوگیا جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب (قریشی حکومت) تمام اقوام کے لیے ایسے ہوگئے جیسا کہ کھانے کے پیالہ پر کھانے والے جمع ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس تشبیہ کا ذکر بھی موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

وہ زمانہ قریب ہے کہ تم پر قومیں اس طرح ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جس طرح کھانے کے بڑے پیالہ پر کھانے والے ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں۔

قرطبیؒ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مخاطب عرب ہی ہیں اور رخنۂ سد کے متعلق دونوں محدثین کا رجحان اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حقیقی رخنہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ ایک تشبیہ ہے۔

ان ہر دو محدثین کی تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک "ویل للعرب الخ" والا جملہ شرور و فتن سے متعلق ہے اور "فتح من ردم" کے جملہ میں ایک ہی بات بیان کی گئی ہے اور یہ دونوں جملے اس طرح آپس میں مربوط ہیں کہ . . . . دونوں کو ایک ہی حادثہ سے متعلق سمجھا جائے۔

اور حافظ عماد الدین بن کثیرؒ اس بارہ میں کوئی فیصلہ کن رائے نہیں رکھتے اور متردد ہیں کہ زیر بحث حدیث "فتح من ردم یاجوج وماجوج" میں "فتح" سے حقیقی فتح (کھل جانا) مراد ہے یا استعارہ ہے کسی آئندہ ایسے حادثہ سے جو یاجوج وماجوج کے ہاتھوں پیش آنے والا ہے اور جس کا اثر براہ راست عرب (حکومتِ قریش) پر پڑے گا۔ لیکن کرمانی شارح بخاری بعض علماء سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اس پوری حدیث کو ایک ہی معاملہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں یاجوج وماجوج کے ایسے حادثہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ظہور قیامت کی علامت سے جدا درمیانی وقفہ میں پیش آنے والا ہے اور جو باعث ہوگا

---

[1] فتح الباری ج ۱۳ ص ۹۱۔

عرب کے زوال کا۔ اور "فتح ردم" استعارہ ہے اس بات سے کہ جو حادثہ آئندہ رونما ہونے والا ہے اس کی ابتدا ہوگئی ہے اور یہ وہ حادثہ تھا جو مستعصم باللہ خلیفہ عباسی کے زمانہ میں "فتنہ تاتار" کے نام سے برپا ہوا اور جس نے عرب طاقت کا خاتمہ کرکے رکھ دیا[1]۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یاجوج وماجوج قبائل کی اس تاخت وتاراج کے بعد جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ کے ضمن میں آیا ہے تاریخ میں ان قبائل کا پھر کوئی یادگار حملہ مذکور نہیں ہے۔

البتہ ساتویں صدی عیسوی میں ان کے لئے ذوالقرنین کی یہ روک بیکار ہوگئی اور انھوں نے بحرِ خزر اور بحرِ اسود کے اس درہ کے علاوہ جوان پر بند کردیا گیا تھا بحرۂ یورال اور بحرِ خزر کا درمیانی راستہ پالیا۔ نیز ادھر "سدِ ذوالقرنین" کے استحکامات میں بھی فرق آنا شروع ہوگیا تھا۔ اور اس طرح ذوالقرنین کے بعد اب یاجوج وماجوج سے ایک نئے فتنہ کا آغاز ہوچلا تھا اور صدیوں سے ان خاموش قبائلِ فتنہ جو میں پھر حرکت شروع ہوگئی تھی۔

لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رویاءِ صادقہ میں یہ دکھایا گیا کہ اگرچہ ابھی وہ وقت دور ہے جبکہ قیامت کے قریب تمام قبائل یاجوج وماجوج عالمِ انسانیت پر چھاجائیں گے لیکن وہ وقت قریب ہے جبکہ ذوالقرنین کے بعد ان کا ایک اہم خروج پھر ہوگا اور وہ عرب کی طاقت اور فرمانروائی کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اور اسی خروج کو اس طرح حسی طور پر دکھایا گیا کہ گویا (سد) دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوگیا ہے اور آہستہ آہستہ وہ دیوار گر کر منہدم ہوجانے والی ہے۔

چنانچہ زمانۂ نبوی میں یہ وہ وقت تھا کہ ان قبائل میں سے چند منگولین قبائل نے اپنے مرکز سے نکل کر قرب وجوار میں پھیلنا اور چھوٹے چھوٹے حملے کرنا شروع کردیا تھا۔ اور آخرکار چھٹی صدی ہجری میں چنگیز خاں ان کا قائد بن گیا اور اس نے منتشر قبائل کو ایک جگہ جمع کرنا شروع کیا اور پھر اس کے بیٹے اوکتائی خاں نے ایک بے پناہ طاقت کے ساتھ اٹھکر مغرب وجنوب پر حملہ کردیا اور ۶۸۶ھ میں آخر ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی عرب خلافت کا خاتمہ ہوگیا اور اس نے "خلافتِ عربیہ" کو تہ وبالا کرڈالا۔

[1] عمدۃ القاری ج ۱۱

تو یوں سمجھئے کہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس خود علاماتِ قیامت میں سے سب سے بڑی علامت ہے یعنی آپ خاتم النبیین ہیں اور پھر بھی قیامت کے وقت میں اور ذاتِ اقدس میں کافی غیر معین فاصلہ ہے۔ اسی طرح یہ فتنۂ تاتار بھی علامت قیامت " خروج یاجوج و ماجوج" کا ایک ابتدائی نشان ہے اور جس طرح خروجِ دجال و قتلِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی قریبی علامات ہیں۔ اسی طرح سورۂ انبیا میں ذکر کردہ خروج یاجوج و ماجوج بھی علاماتِ قیامت میں سے قریبی اور آخری علامت یا آخری شرط ہے، پس " فتح ردم" میں ان کی ابتدائی حرکت کی جانب اشارہ ہے جو رویائے صادقہ کے وقت شروع ہو چکی تھی اور " ویل للعرب" سے اس نتیجہ کا اظہار ہے جو عرب حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوا ہے۔

لیکن شیخ بدرالدین عینی نے بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں کرمانی کے بیان کردہ اس قول کی تردید کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تاتاری فتنہ کا بانی چنگیز خاں اور اس کا بیٹا ہلاکو خاں تھا اور ان کو یاجوج و ماجوج میں سے سمجھنا صحیح نہیں ہے لہٰذا اس حدیث کا مصداق اس فتنہ کو قرار دینا بھی غلط ہے۔ بہرحال حدیث " ویل للعرب" کی ان مختلف توجیہات سے جبکہ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس روایت کے مصداق کا تعین خود حدیث سے نہیں ہوتا بلکہ محدثین نے قرائن اور الفاظِ حدیث کی نشست کو پیشِ نظر رکھکر اپنی جانب سے مصداق متعین کرنے کی سعی فرمائی ہے اور پھر اس میں بھی اختلافِ رائے رہا ہے تو اب ان ہی کے بتلائے ہوئے اصول کو سامنے رکھکر ہم بھی کچھ کہنے اور حدیث زیر بحث کے مقصد کو متعین کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اگرچہ دوسرے اقوال کی طرح وہ بھی غیر منصوص اور قابل رد و قبول ہوگا۔

حدیث زیر بحث میں مستقبل میں پیش آنے والے جس فتنہ اور شر کی خبر دی گئی ہے اس کے دو جملے بہت اہم ہیں۔ ایک " ویل للعرب من شر قد اقترب" عرب کے لئے ہلاکت ہے اس شر سے جو بلاشبہ قریب آلگا ہے"۔ اور دوسرا " فتح الیوم من ردم یاجوج وماجوج وحلق تسعین" آج کے دن یاجوج و ماجوج کی سد سے انگوٹھے اور انگلی کے گول دائرہ کی مقدار میں کھول دیا گیا ہے"۔ اور

ان ہر دو جملوں کے درمیان واوِ عطف بھی نہیں ہے۔

لہٰذا الفاظِ حدیث پر کافی غور وخوض کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مسطورہ بالا ہر دو اقوال کی گنجایش ہے۔ یعنی حدیث کا پہلا جملہ یہ پتہ دیتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے اہم شر کی اطلاع دے رہے ہیں جس کا پہلا اثر یہ ہوگا کہ عرب کے لئے سخت ہلاکت کا سامنا ہوگا اور "خلافتِ قریش" زوال پذیر ہو جائے گی۔

اور دوسرا جملہ یا پہلے جملہ کی تائید میں . . پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امت میں جو اہم فتنے برپا ہونے والے ہیں اور جن کا ابتدائی اثر عرب کی ہلاکت کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ان فتنوں کے رونما ہونے کے لئے حسی علامت اس طرح سامنے آگئی ہے کہ یاجوج وماجوج پر بنائی ہوئی مستحکم سدِ ذوالقرنین میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا اور اس کی شکست وریخت ہونے لگی۔ گویا یہ رخنہ آئندہ اسلامی طاقت یا عرب طاقت میں جلد رخنہ پڑ جانے کے لئے ایک علامت ہے۔ چنانچہ یہ فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہو کر مختلف فتنوں کے بعد چند صدیوں میں قریشی حکومت کی ہلاکت وتباہی پر جا کر ٹھیرا اور اس طرح حدیث کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پس اس شکل میں "فتحِ ردم" آئندہ فتنوں اور شروں کے پیش آنے کی ایک علامت ہے جو امتِ اسلامیہ میں برپا ہو کر قربِ قیامت میں موعود خروجِ یاجوج وماجوج پر جا کر ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد دنیا کے درہم وبرہم ہو جانے سے قیامت ہو جائے گی۔

یا یوں کہئے کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ کی صرف تائید ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تفسیر ہے اور پہلا جملہ درحقیقت نتیجہ اور ثمرہ ہے دوسرے جملہ کا اور مطلب یہ ہے کہ عرب (قریشی حکومت) کی ہلاکت کا وقت آپہنچا۔ گویا یاجوج وماجوج کا وہ بند جو ذوالقرنین نے بہت مستحکم باندھا تھا اس میں اب رخنہ پڑ گیا اور معنیً اس میں شکست وریخت شروع ہو گئی اور یہ تمہید ہے اس فتنہ کی جو اسی جانب سے اٹھیگا اور قریشی حکومت کا خاتمہ کر دے گا۔

پس اس تعبیر کے لحاظ سے تاتاری فتنہ کی وہ تاریخ سامنے لائی جائے گی جو گذشتہ صفحات

میں پیش کی گئی ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حدیث کی بیان کردہ پیشینگوئی کے مطابق اس فتنہ کی ابتدا، دورِ رسالت سے شروع ہوگئی تھی اور پھر کس طرح وہ خلیفۂ عباسی مستعصم باللہ کے دورِ حکومت میں قریشی حکومت کے استیصال کا باعث ہوئی۔

پس اگر ان دونوں جملوں کے درمیان جو ربط اور تعلق ہے اس میں اس قدر وسعت تسلیم کرلی جائے کہ وہ محدثین کی بتائی ہوئی توجیہ" یعنی اہم شرور فتن کا شیوع" اور کرمانی کے بیان کردہ ایک قول کے مطابق توجیہ" یعنی فتنۂ تاتار کا وجود" ان دونوں توجیہات کو حاوی ہوسکے تو ایسا تسلیم کرلینے میں نہ شرعی قباحت لازم آتی ہے اور نہ تاریخی، اور زیرِ بحث حدیث کا مصداق بہت زیادہ فہم کے قریب آجاتا ہے۔

رہا شیخ بدرالدین نوراللہ مرقدہ کا یہ ارشاد کہ چنگیز خانی تاتاری" یاجوج وماجوج نہیں کہلائے جاسکتے تو یہ شیخ کا تسامح ہے، اس لئے کہ یاجوج وماجوج کے تعین کی بحث میں محققین محدثین اور مورخین نے جن قبائل اور ان کے مواطن کو محقق قرار دیا ہے اور خود شیخ موصوف نے بھی جن کو بڑی حد تک تسلیم فرمایا ہے۔ ان ہی قبائل میں سے ایک شاخ ان تاتاریوں کی بھی ہے جو چنگیز خانی کہلائے اور یہ اپنے دورِ بربریت ووحشت میں ان ہی جگہوں میں آباد رہے ہیں اور وہیں سے ان کا خروج ہوا ہے جن پر سدِ ذوالقرنین قائم کی گئی تھی۔

بہرحال سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیرِ بحث آیات کی اس تفسیر کے درمیان جو ہم نے حضرت علامہ انورشاہ نوراللہ مرقدہ اور حافظِ حدیث عمادالدین بن کثیرؒ کے حوالجات سے بیان کی ہے اور اس حدیث کی پیشینگوئی کے مصداق متعین کرنے والی مسطورہ بالا توجیہات کے درمیان کسی قسم کا بھی تعارض پیدا نہیں ہوتا اور زیرِ بحث آیات وروایات کے مصداق اپنی اپنی جگہ صاف اور واضح ہوجاتے ہیں اور ایسا کرنے میں نہ رکیک تاویلات کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو تفسیر بالرائے یا قابلِ اعتراض جدت کہا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہ جو کچھ بھی ہے سلفِ صالحین اور محدثین وارباب سیر کے مختلف اقوال میں ترجیح راجح کے اصول کو کارفرما بنا کر ایک ایسی معتدل

راہ ہے جو نصوصِ قرآنی اور صحیح روایاتِ حدیثی کے درمیان تطبیق کی راہ کہلائی جاتی اور سلفاعن خلف مقبول و محمود رہی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ حدیث مسطورہ بالا میں حلقہ کی مقدار رخنہ پڑ جانے کا جو تذکرہ ہے اس کے متعلق محدثین کی یہ رائے ہے . . . .
کہ استعارہ و تشبیہ مراد ہو یا حسی رخنہ، بہر دو صورت حلقہ کی مقدار رخنہ کا ذکر تقریبی ہے نہ کہ تحدیدی یعنی یہ مطلب ہے کہ سد میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی ایک حلقہ کی مقدار ہی رخنہ پڑا ہے۔ چنانچہ گذشتہ صفحات میں ہم ابنِ کثیرؒ سے اس سلسلہ میں نقول پیش کر چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اور بعض دوسرے علماء نے کتبِ سیرت میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ سورۂ انبیا کی ان آیات کا مصداق" جن میں یاجوج و ماجوج کے موعود خروج کا ذکر کیا گیا ہے یعنی "حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون" فتنۂ تاتار کو بنا کر یہیں قصہ کو ختم کر دیں اور اس کا امارتِ ساعت و علامتِ قیامت سے کوئی تعلق باقی نہ رہنے دیں۔

مگر ہمارے نزدیک قرآنِ عزیز کا سیاق و سباق ان کی اس تفسیر یا توجیہ کا قطعاً ابا اور انکار کرتا ہے اور یہ اس لئے کہ سورۂ انبیا میں اس واقعہ کو جس ترتیب سے بیان کیا ہے وہ یہ ہے۔

وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ. حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ. وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۔ (الانبیاء)	اور مقرر ہو چکا ہے ہر ایک ایسی بستی پر کہ جس کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے کہ (اس کے بسنے والے) واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ کھول دیئے جائیں یاجوج و ماجوج اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے امنڈ پڑیں اور قریب آجائے سچا وعدہ پھر اس وقت حیرانی سے کھلی کی کھلی رہ جائیں آنکھیں منکروں کی (اور کہیں) ہائے ہماری بدبختی کہ ہم بے خبر رہے اس (قیامت) سے۔ بلکہ ہم ظلم و شرارت میں سرشار رہے۔

ان آیات میں آیت زیرِ بحث "حتی اذا فتحت الآیۃ" سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ مرنے والوں کی موت کے بعد اب ان کے لئے اس دنیا میں دوبارہ زندگی نہیں ہے اور آیت زیرِ بحث میں یہ کہا گیا ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا وقت جن علامات و آیات کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے یا جن پر معلق کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیک وقت اپنے مراکز سے نکل کر تیزی سے تمام دنیا پر چھا جائیں اور اس سے متصل آیت میں مزید یہ کہا گیا کہ پھر اس کے بعد قیامت بپا ہو جائیگی اور ہر شخص اپنی زندگی کے نیک و بد انجام دیکھنے کے لئے میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے اور ناکام اپنی ناکامی پر حسرت و یاس کرتے رہ جائیں گے۔

پس آیت زیرِ بحث کے سیاق و سباق نے یہ بات بخوبی واضح کر دی کہ اس مقام پر یاجوج و ماجوج کے ایک ایسے خروج کی اطلاع دی گئی ہے جس کے بعد شرور و فتن کا کوئی سلسلہ بلکہ دنیا کی ہستی کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہ جائیگا اور صرف قیامت بپا ہو جانے یعنی نفخ صور کی دیر باقی رہ جائیگی جو اس واقعہ کی تکمیل کے بعد عمل میں آجائے گا۔

لہٰذا آیت کے سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے اور حدیث "ویل للعرب من شر قد اقترب" کا مصداق "فتنۂ تاتار" کو متعین کرتے ہوئے سورۂ انبیاء کی اس آیت کو آخری علامتِ ساعت سے نکال کر فتنۂ تاتار پر محمول کر لینا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ نیز جمہور سلفِ صالحین کی مسلمہ توجیہ کے قطعاً خلاف ہے۔

ممکن ہے کہ اس توجیہ کے ناقلین و قائلین ہمارے اس اعتراض کو ہم پر ہی پلٹ دیں اور یہ فرمائیں کہ اسی طرح سورہ کہف میں بھی آیت "فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء" میں وعدے کیوں قیامت مراد نہ لی جائے جبکہ اس کے بعد ہی آیت "ونفخ فی الصور" موجود ہے جو بلاشبہ قیامت کی آخری علامت ہے اور کیوں نہ کہا جائے کہ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ یاجوج و ماجوج نفخِ صور تک سد کے اندر محصور اور بند رہیں گے اور نفخِ صور کے قریب یک بیک سد گر جائے گی اور وہ نکل پڑیں گے۔

تو اس کے متعلق ہماری یہ گذارش ہے کہ یہ اعتراض اپنی اس تقریر کے ساتھ ہرگز ہم پر وارد

نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ سورۂ کہف کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ہم پہلے ہی یہ واضح کر چکے ہیں کہ ان آیات میں سب سے پہلے "یسئلونک عن ذی القرنین" سے شروع کرکے "وکان وعد ربی حقا" تک ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یعنی آیت "فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء" میں ذوالقرنین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد نہیں ہے۔ اس لئے یہاں "وعد" سے وعدۂ قیامت مراد نہیں ہے بلکہ کسی تعمیر کی تخریب کا مقدر و معین وقت مراد ہے جس کی تعیین کو ذوالقرنین نے اپنی جانب سے تخمینی طور پر متعین کرنے کی بجائے مردِ مومن اور مردِ صالح کی طرح خدا کی مرضی کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور چونکہ ذوالقرنین کے واقعہ میں ضمنی طور سے یاجوج وماجوج کا بھی ذکر آ گیا تھا اس لئے اس کے خاتمہ پر اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بھی یاجوج وماجوج کا مختصر ذکر فرما دیا اور آیت "وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض ونفخ فی الصور" میں یہ بیان کیا کہ جن یاجوج وماجوج کا ذکر تم نے ابھی ذوالقرنین کے واقعہ میں سُنا ان کو ہم نے شر اور فتنہ کی اس زندگی میں اس طرح کر چھوڑا ہے کہ وہ برابر فساد اور چپقلشِ باہمی میں مصروف رہیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہیگا کہ صور پھونکدیا جائے اس دن وہ سب جمع کئے جائیں گے اور اس دن جہنم کافروں پر پیش کی جائے گی۔

گویا سورۂ انبیا میں تو یاجوج وماجوج کا ذکر مستقل حیثیت رکھتا ہے اور وہاں بتانا ہی یہ منظور ہے کہ ان کا اجتماعی خروج قیامت کی آخری علامات میں سے ایک نمایاں علامت ہے اور سورۂ کہف میں ان کا تذکرہ صرف ضمنی ہے اور ان کے فساد اور شر انگیزی کے خصوصی واقعہ کی مناسبت سے ان کی باہمی فساد انگیزیوں اور مختلف اوقات میں موج در موج چپقلشوں کی وارداتوں کا ذکر اس انداز میں کر دیا گیا کہ ان کے موعود خروج کی جانب بھی اشارہ ہو جائے۔

غرض سورۂ کہف کی زیرِ بحث آیات کا سیاق وسباق یعنی ان سے پہلی اور بعد کی آیات کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے مقولہ "اذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء" میں "وعد" سے مراد وعدۂ قیامت لیا جائے اور وہ معنی بیان کئے جائیں جو معترض نے ہماری بیان کردہ سورۂ انبیاء کی تفسیر کے مقابلہ میں پیش کئے ہیں۔

الحاصل جن معاصر مفسرین نے سورۂ انبیار کی زیر بحث آیات کا مصداق "فتنۂ تاتار" کو بتایا ہے اوراس کی تائید میں بخاری کی مشہور حدیث "ویل للعرب من شر قد اقترب" کو پیش کیا ہے ان کی یہ تفسیر غلط ہے اور حدیث سے اس کی تائید قطعًا بے محل ہے بلکہ بخاری و مسلم کی دوسری صحیح احادیث جو کتاب الفتن میں مذکور ہیں اس تفسیر کے خلاف صاف صاف یہ بیان کرتی ہیں کہ علامات قیامت میں جب آخری علامات رونما ہوں گی تو پہلے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا آسمان سے نزول ہو گا اور دجال کا سخت فتنہ برپا ہو گا اور آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں وہ مارا جائے گا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد یاجوج و ماجوج کا موعود خروج ہو گا جو تمام دنیا پر شر و فساد کی صورت میں چھا جائیگا اور پھر کچھ وقفہ کے بعد نفخ صور ہو گا اور یہ کارخانۂ دنیا درہم و برہم ہو جائے گا۔ [۱]

یہ بھی واضح رہے کہ یہ اور اسی قسم کی دوسری صحیح و اصح روایات سے ان متنبیوں (جھوٹے مدعیانِ نبوت) کے دعووں کا بھی ابطال ہو جاتا ہے اور ان کے کذبِ صریح کی رسوائی آشکارا ہو جاتی ہے جو اپنی نبوت کی صداقت کی تعمیر یہ کہکر تیار کرتے ہیں کہ انگریز اور روس' یاجوج و ماجوج ہیں اور جبکہ ان کا خروج ہو چکا اور وہ عالم کے اکثر حصوں پر قابض ہو چکے تو اب "یسوع مسیح" کی آمد ضروری ہو گئی، لہٰذا وہ موعود مسیح (عیسیٰ) ہم ہیں کیونکہ جب شرط موجود ہے تو مشروط کیوں موجود نہ ہو۔

کسی جھوٹے مدعیِ نبوت کی یہ دلیل اگرچہ خود تارِ عنکبوت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لئے درخورِ اعتنار بھی نہیں ہے تاہم عوام کو غلط فہمی سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس مدعی کے بیان کردہ یہ دونوں دعوے جو دلیل کے دو مقدموں کے طور پر بیان کئے گئے ہیں غلط اور ناقابلِ قبول ہیں اور اس لئے ان سے پیدا شدہ نتیجہ بھی بلاشبہ باطل اور مردود ہے۔

پہلا دعویٰ یا مقدمہ تو اس لئے غلط ہے کہ ہم نے یاجوج و ماجوج کی بحث میں تفصیل کے ساتھ حدیث و تاریخ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یاجوج و ماجوج کا اطلاق صرف ان ہی قبائل پر ہوتا رہا ہے جو اپنے اصل مرکز میں بطریق وحشت و بربریت مقیم ہیں اور ان میں سے جو افراد یا قبائل مرکز چھوڑ کر دنیا کے

[۱] بخاری کتاب الفتن ج ۲

مختلف حصوں میں بس گئے اور آہستہ آہستہ متمدن بن گئے ہیں وہ تاریخ کی نظر میں یاجوج وماجوج نہیں کہلاتے بلکہ اپنے بعض امتیازاتِ خصوصی کے پیشِ نظر نئے نئے ناموں سے موسوم ہوگئے اور اپنے اصلی اور نسلی مرکز سے اس قدر اجنبی ہوگئے ہیں کہ وہ اور یہ دو مستقل جدا جدا قومیں بن گئیں اور ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے۔ اسی طرح قرآن اور حدیث کے مطالعہ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ان ہی قبائل کو یاجوج وماجوج کہتا ہے جو اپنی بربریت اور وحشت کے ساتھ عام دنیا سے الگ اپنے مرکز میں گوشہ گیر ہیں۔

اور اسی اصول پر دوسرا دعویٰ یا مقدمہ بھی باطل ہے کہ انگریز اور روس بلکہ یورپین حکومتوں کا تسلط اور قبضہ یاجوج وماجوج کا خروج ہے اور یہ اس لئے کہ ایک تو ابھی ذکر ہو چکا کہ متمدن اقوام کو یاجوج وماجوج کہنا ہی غلط ہے دوسرے اس لئے کہ یاجوج وماجوج کے اس فتنہ و فساد کے پیشِ نظر جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ میں سورۂ کہف میں مذکور ہے اور صحیح احادیث کی تصریحات کے مطابق ان کا وہ خروج بھی "جس کا ذکر سورۂ انبیاء میں کیا گیا ہے اور جس کو علاماتِ قیامت میں سے ٹھیرایا ہے" ایسے ہی فساد وشر کے ساتھ ہوگا جس کا تعلق تمدن وحضارت سے دور کا بھی نہ ہو اور جو خالص وحشیانہ طرز وطریق پر برپا کیا جائے۔ کہاں سائنس کے ایجادات وآلات کا طریقۂ جنگ اور کہاں غیر متمدن وحشیانہ جنگ وپیکار؟ ششتان بینہما۔

اور یہ بات اس لئے بھی واضح ہے کہ متمدن اقوام کی جنگ وپیکار کتنی ہی وحشیانہ طرز وطریق اختیار کئے ہوئے کیوں نہ ہوں۔ بہرحال سائنس اور حرب وضرب کے اصول کے مطابق ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ اقوام وامم میں ہمیشہ سے جاری ہے اس لئے اگر اس قسم کے جابرانہ وقاہرانہ تسلط اور قبضہ کے متعلق قرآن کو پیشین گوئی کرنی تھی تو اس کی تعبیر کے لئے ہرگز یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا جو یاجوج وماجوج کی خروجِ موعود کے سلسلہ میں سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں اختیار کیا گیا ہے بلکہ ان کی ترقی تمام بربریت کی جانب ضروری اشارات یا تصریحات کا ہونا لازم تھا۔[1]

---

[1] رہا یہ امر کہ آج جبکہ کاکیشیا کا تمام علاقہ متمدن ہو چکا اور یہاں کی بیشتر آبادی مسلمان ہو (باقی حاشیہ ص ۲۲۵ پر)

الحاصل۔ احادیث صحیح اور آیاتِ قرآنی کی مطابقت کے ساتھ ساتھ جب مسئلہ زیر بحث پر غور و فکر کیا جاتا ہے تو بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول از آسمان ضروری ہے نہ یہ کہ پہلے یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور پھر مسیح علیہ السلام کی آمد کا انتظار کیا جائے گا۔ چنانچہ صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں مذکور ہے۔

فبینما هو کذلک اذ بعث الله	واقعات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم
المسیح بن مریم فینزل عند المنارة	(علیہ السلام) کو بھیجیگا اور وہ (جامع) دمشق کے سپید شرقی
البیضاء شرقی دمشق بین	منارہ کے نزدیک اس طرح اتریں گے کہ زعفرانی رنگ کی دو
مهرودتین واضعاً کفیه علی	چادروں میں ملبوس اور فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھوں کا سہارا
اجنحة ملکین اذا طأطأ	دیئے ہوئے ہوں گے۔ جب سر کو جھکائیں گے تو پانی ٹپکنے
رأسه قطر واذا رفعه تحدر	لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو اس سے پانی کے قطرات
منه جمان کاللؤلؤ فلا	اس طرح گرنے لگیں گے گویا ہار سے موتی ٹوٹ کر گر رہے ہیں
یحل لکافر یجد ریح	یعنی آسمان پر غسل کرکے فوراً ہی نزول ہوگا جہاں تک ان کا
نفسه الا مات ونفسه ینتهی	سانس جائیگا کافر کی موت کا باعث ہوگا اور ان کا سانس ان
حیث ینتهی طرفه فیطلبه	کی حدِ نظر تک پہنچیگا۔ پھر اتر کر وہ دجال کا پیچھا کریں گے
حتی یدرکه بباب لدّ فیقتله ثم یأتی	اور وہ اس کو بیت المقدس کے قریب بستی لُدّ کے دروازہ پر
عیسی بن مریم قوم قد عصمهم	پائیں گے اور قتل کردیں گے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان
الله منه فیمسح عن وجوههم	لوگوں کے پاس تشریف لائیں گے جن کو اللہ تعالیٰ دجال کے
ویحدثهم بدرجاتهم فی	فتنہ سے محفوظ رکھیگا اور ان کے غبار آلودہ چہروں کو مس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٢٢٤) تو قریب بہ قیامت یاجوج وماجوج کا خروج اس علاقہ سے کس طرح ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ صفحات میں یہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ ایشیا کے اس حصہ سے چین و تبت تک کے تمام ساحلی اور پہاڑی علاقوں کا سلسلہ ان ہی وحشی قبائل کا مسکن رہا ہے اور آج بھی ہے پس ان ہی علاقوں کے مختلف حصوں سے بتعداد وحشی انسان وقتِ موعود پر نکل کر دنیائے انسانی کو تاراج کرنے کے لئے پھیل جائیں گے۔

الجنۃ فبینما ھو کذلک اذ	کرتے ہوئے ان کو جنت میں جو درجات ملیں گے اس کے متعلق
اوحی اللہ الی عیسٰی انی قد	باتیں کریں گے۔ حالات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت
اخرجت عبادًا لی لا ید ان	عیسٰی (علیہ السلام) پر وحی کریگا کہ اب میں اپنے بندوں میں سے
لاحد بقتالھم فحرز عبادی	ایک ایسی قوم کو نکالتا ہوں جن سے جنگ کرنے کی دنیا میں کسی کے
الی الطور و یبعث اللہ	اندر طاقت نہیں ہے لہذا تم میرے تمام بندوں کو طور پر لیجاؤ
یاجوج و ماجوج وھم من کل	اس کے بعد اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو نکالیگا جو تیزی کے
حدب ینسلون الخ ۵۱	ساتھ دوڑتے ہوئے آئیں گے اور ہر بلند جگہ سے نکل پڑیں گے۔

پس یاجوج و ماجوج کا خروج کسی حال میں بھی ان اقوام پر صادق نہیں آسکتا جو تمدن اور حضارت کی راہوں سے قاہرانہ اور جابرانہ جنگ و پیکار کے ذریعہ سے دنیا پر غالب و قابض ہوتی رہی ہیں اور کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یاجوج و ماجوج قبائل کی تاریخی بحث سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور "جدید نبی" بن کر اسلام کے اساسی اور بنیادی مسئلہ "ختم نبوت" کے خلاف تشکیلِ نبوت کی جدید طرح ڈالے اور اس طرح اسلام میں رخنہ انداز ہو کر دوست نما دشمن بنے۔

کیا ذوالقرنین نبی تھے؟

ذوالقرنین کی تعیین کے بعد یہ مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا ایک نیک نہاد بادشاہ؟ سلف صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی جانب ہے کہ ذوالقرنین صالحین میں سے ہیں اور نیک نفس بادشاہ اور وہ نبی یا رسول نہیں ہیں۔

چنانچہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی اس روایت میں "کہ جس میں ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے" ان کا یہ قول مصرح موجود ہے۔

لم یکن نبیًا ولا ملکًا (الحدیث) ۵۲	ذوالقرنین نہ نبی تھے اور نہ فرشتہ۔
کان رجلًا احب اللہ فاحبہ الخ	وہ ایک انسان تھے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو محبوب رکھا
۵۳	پس اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو محبوب رکھا۔

---

۵۱ مسلم کتاب الفتن۔ ۵۲ و ۵۳ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے اس روایت کو نقل کرکے اس کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس روایت کو حافظ حدیث ضیار الدین مقدسی کی کتاب مختارہ کی احادیث سے بسندِ صحیح سنا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ذوالقرنین کے متعلق یہ الفاظ بھی مذکور ہیں

بعثہ اللہ الی قومہ [۱]	اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی طرف بھیجا

اس سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ لفظ "بعث" تو نبوت و رسالت کے ملئے بولا جاتا ہے پھر نبوت کے انکار کے کیا معنیٰ؟ اس کے بعد خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ "بعث" یہاں اپنے عام معنیٰ میں ہے جو نبی اور غیر نبی دونوں کے لئے بولا جاسکتا ہے اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

وقیل کان من الملوک وعلیہ الاکثر۔ (فتح)	اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اور اکثر کی رائے یہی ہے۔

حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی یہی مسلک ہے کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے بلکہ ایک نیک اور صالح بادشاہ تھے۔

عن ابن عباسؓ قال کان ذوالقرنین ملکاً صالحاً رضی اللہ عملہ واثنیٰ علیہ فی کتابہ وکان منصوراً [۲]	حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نیک و صالح بادشاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اعمال کو پسند فرمایا اور اپنی کتاب (قرآن) میں اس کی تعریف فرمائی اور وہ فاتح و کامیاب بادشاہ تھا

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ بھی ذوالقرنین کو صالحین میں سے مانتے تھے۔[۳]

البتہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی جانب یہ نسبت کی جاتی ہے کہ وہ ذوالقرنین کو نبی مانتے تھے۔

عن مجاھد عن عبداللہ بن عمرو قال کان ذوالقرنین نبیاً [۴]	عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نبی تھے۔

اور حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قرآن کا ظاہر یہی بتاتا ہے۔[۵]

مگر ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد فیصلہ کچھ نہیں دیتے۔ لیکن حافظ عمادالدین ابن کثیرؒ ان اقوال کو

---

[۱] فتح ج ۶ ص ۲۹۸۔ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۳۔ [۳] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳۔ [۴] فتح ج ۶ ص ۲۹۵ [۵] ایضاً ص ۱۹۷

نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا فیصلہ یہ دیتے ہیں۔

والصحیح انہ کان ملکا من ملوک العادلین[۵۱] اور صحیح یہ ہے کہ ذوالقرنین عادل بادشاہوں میں سے تھا۔

اور حضرت استاذ علامہ محمد انور شاہ نوراللہ مرقدہ کی تحقیق بھی یہی ہے چنانچہ عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں۔

بل ملک اٰخر من الصالحین ینتمی نسبہ الی العرب السامیین الاولین۔ کہ وہ ایک اور نیک بادشاہوں میں سے تھا اور اس کا نسب قدیم سامیوں پر پہنچتا ہے۔

پس ان نقول کے پیش نظر مولانا آزاد کا یہ فرمانا

"تو صحابہ و سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا الخ"[۵۲]

اپنے عموم کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ بیشتر سلف صالحین ذوالقرنین کی نبوت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کو ایک بادشاہ کی حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں البتہ بعض سلف کی رائے میں وہ نبی تھے۔

اسی طرح متاخرین میں سے ابن کثیر کے متعلق یہ کہنا بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ ذوالقرنین کے نبی ہونے کی تائید میں ہیں اس لئے کہ سطور بالا میں ابن کثیر سے جو کچھ منقول ہے وہ قطعاً اس کے خلاف ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ذوالقرنین اور خضر کا جو ایک جگہ ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے اور اس میں خضرؑ کی نبوت کی توثیق فرمائی ہے تو اس جگہ شائد ضمائر کے مرجع میں مولانائے موصوف کو مغالطہ ہو گیا ہے چنانچہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں۔

فان الاول کان عبدا مؤمنا صالحا و ملکا عادلا و کان وزیرہ الخضر وقد کان نبیا علی ما قررناہ قبل ھذا۔[۵۳] اس لئے کہ اول (یعنی ذوالقرنین) ایک عبد مومن اور صالح تھا اور عادل بادشاہ اور اس کے وزیر خضر (علیہ السلام) تھے اور وہ (خضرؑ) اس تحقیق کے مطابق جو ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں بیشک نبی تھے۔

---

[۵۱] فتح ج ۶ ص ۲۹۵۔ [۵۲] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۲۰۔ [۵۳] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۲۔

بہرحال حضرت علیؓ، ابنِ عباسؓ، ابوہریرہؓ، امام رازیؒ، ابنِ کثیرؒ اوران کے علاوہ سلفِ صالحین اورمتاخرین کی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل وصالح بادشاہ تھے۔ پس جبکہ صحابہ اور سلفِ صالحین بلکہ متاخرین میں سے بھی اکثراسی جانب ہیں کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے توجمہور کا یہ رجحان بلاشبہ اس امر کی دلیل ہے کہ آیت "قلنا یا ذاالقرنین" میں خدائے تعالیٰ کی مخاطبت ذوالقرنین کے ساتھ اسی قسم کی ہے جیساکہ حضرت موسیٰ کی والدہ کے قصہ میں "اوحینا" کے اندر ہے۔

واوحینا الی ام موسی ان ارضعیہ اورہم نے موسیٰ کی والدہ پر وحی کی کہ تواس (موسیٰ) کو دودھ پلانا منظور کرلے

اوریقیناً ان حضرات کا منطوق پر مفہوم کو ترجیح دینا بے وجہ نہیں ہے خصوصاً جبکہ اس مخاطبت کو نہ "اوحینا" سے تعبیر کیا گیا اور نہ "انزلنا" سے اور نہ "قلنا" کے علاوہ ذوالقرنین سے متعلق آیات میں کوئی ایسا مؤید موجود ہے جو "قلنا" کی خطابت کو خطابتِ وحی قرار دیتا ہو۔

لہذا راجح مذہب یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل اور صالح بادشاہ تھے۔

بصائر | (۱) مطالب قرآن کی بصیرت کے لئے جس طرح لغتِ عرب معانی، بلاغت وبیان، صرف و نحو، احادیث اور آثارِ صحابہ جیسے علوم کی معرفت ضروری ہے۔ اسی طرح صحیح علم تاریخ کی معرفت بھی ضروری ہے چنانچہ گذشتہ اقوام وامم کے حالات وواقعات کا علم حاصل کرکے ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی ترغیب خود قرآنِ عزیز نے پرزور اسلوب بیان کے ساتھ دی ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (انعام)
(کہدیجئے) زمین کی سیاحت کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (آل عمران)
بے شبہ تم سے پہلے (خدا کی مقرر کردہ) راہیں گذر چکی ہیں پس زمین کی سیر کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

(۲) جہانتک اسلام کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے اس میں "سلف صالحین" کا مسلک ہی

بغیر چون وچرا دلیل ہے اور اس سے تجاوز برائی اور گمرہی ہے لیکن جہاں تک قرآن کے لطائف ونکات، معارف وعلوم، اسرار وغوامض اور علمی وتاریخی مطالب کا تعلق ہے اس کے لئے کسی زمانہ میں بھی درِ تحقیق بند نہیں ہے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔

فلا تنقضی عجائبہ قرآن کے لطائف وحِکَم کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

خصوصًا جبکہ تاریخی مطالب کے حصول کے لئے آج کے ذرائع معلومات قدیم علوم تاریخ کے ذرائع سے زیادہ وسیع ہو چکے ہیں تو سلف صالحین کے مسلکِ قدیم پر قائم رہتے ہوئے قرآنی حقائق اور اس کے تاریخی مباحث کی تفصیلات وجزئیات میں اقوالِ سلف کا پابند نہ رہتے ہوئے قرآن کی تائید کے لئے قدمِ تحقیق اٹھانا سلفِ صالحین کا اقتدار ہے نہ کہ ان کے مسلک سے انحراف۔ کیا کوئی اہلِ علم اور صاحبِ نظر اس حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ ان مطالبِ تفسیری کے علاوہ جن کے متعلق دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ارشاداتِ نبوی ہیں صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے ذاتی اقوال کے خلاف یا ان سے جدا۔ تابعین اور تبع تابعین کے اقوال بہ کثرت کتبِ تفسیر میں مذکور ہیں اور متاخرین علمائِ تفسیر، متقدمین کے اقوال پر نقد وجرح کرنے اور اختلاف رائے رکھتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کی تحقیق، قرآنِ عزیز کے مطالب کی خدمت ہی سمجھی جاتی ہے۔ البتہ اہلیت شرط ہے اور جو شخص بھی اس خدمت کے لئے اقدام کرے اس کا فرض ہے کہ فیما بینی وبین اللہ یہ غور وفکر کرے کہ وہ جس مسئلہ میں کوئی راہ اختیار کرتا ہے حقیقت میں اسکے تمام مالہٗ اور ما علیہ سے واقف ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کی اس تحقیق سے قرآن کی مزید تائید ہی ہوتی ہے اور سلف صالحین کے بنیادی مسلکِ قویم سے قطعًا تجاوز لازم نہیں آتا۔

(۳) عدل وظلم کی حکومت کے درمیان ہمیشہ سے یہ امتیازی فرق چلا آتا ہے کہ عادل حکومت کا نصب العین رعایا اور عوام (پبلک) کی خدمت ہوتا ہے اور اس لئے عادل پادشاہ کا شاہی خزانہ رفاہِ عام اور پبلک خدمات اور ان کی خوشحالی کے لئے ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات پر ضروری حاجات سے زیادہ اس میں سے صرف نہیں کرتا اور نہ عوام کو ٹیکسوں کی کثرت سے پریشان حال بناتا ہے اس کے برعکس جبر وظلم کی حکومت کا منشار بادشاہ اور حکومت کا اقتدار، ذاتی تعیش اور اس کا

استحکام ہوتا ہے اس لئے وہ نہ رعایا کے دکھ درد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ان کی راحت و آرام کا خیال رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں اگر کچھ ہو بھی جاتا ہے تو وہ حکومت کے مفاد و مصالح کے پیش نظر ضمنی ہوتا ہے نیز اس حکومت میں رعایا ہمیشہ ٹیکسوں کے بوجھ سے دبی رہتی اور اس ملک کی اکثریت افلاس و غربت ہی کا شکار رہتی ہے۔

ذوالقرنین چونکہ ایک صالح اور عادل بادشاہ تھا اس لئے اس نے شمالی سیاحت میں اس قوم سے ٹیکس لینے سے انکار کردیا جو یاجوج و ماجوج پر سد بنانے کے سلسلہ میں دینا چاہتے تھے اور اس نے صاف کہا کہ خدا نے مجھکو حکومت و ثروت اس لئے نہیں دی کہ میں اس کو ذاتی تعیش پر صرف کروں بلکہ صرف اس لئے عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مخلوق خدا کی خدمت انجام دوں۔ نیز اس نے جو ملک بھی فتح کیا اس کی رعایا پر عفو و کرم ہی کی بارش کی اور کبھی ان کو نہیں ستایا۔

اصحاب الکہف والرقیم

سنہ (تخمیناً)

قرآنِ عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم - کہف ورقیم؟ - واقعہ کی تاریخی حیثیت - تفسیری حقائق - نتائج وعبر

قرآنِ عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم

ابن اسحٰق بروایت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریشِ مکہ میں یہ مشورہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے اس لئے ایسا کوئی یقینی فیصلہ ہونا چاہئے کہ یہ صادق ہیں یا کاذب تاکہ ہم ان کے متعلق اپنی آخری رائے پر عمل کر سکیں بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ کو یہودِ مدینہ سے حل کیا جائے کیونکہ وہ خود کو اہلِ کتاب کہتے اور اس قسم کے معاملات میں صاحبِ بصیرت ہیں۔ قریش نے اس غرض سے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط پر مشتمل ایک وفد علماءِ یہود کے پاس بھیجا۔ علماءِ یہود نے ان سے کہا کہ تم ان سے تین باتیں دریافت کرو اگر وہ صحیح صحیح جواب دیں تو بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، تم کو ہرگز ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے اور اگر وہ صحیح جواب نہ بتا سکیں تو تم کو اختیار ہے جو چاہو ان کے ساتھ کرو۔ وہ تین سوال یہ ہیں ذوالقرنین کا واقعہ کیا ہے؟ اصحابِ کہف کون تھے اور ان پر کیا گذرا؟ روح کی حقیقت بیان کیجئے؟ وفد نے مکہ جا کر صنادیدِ قریش سے صورتِ حال کہہ سنائی اور قریش نے اس بات کو بہت پسند کیا اور خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر آپ سے یہ تینوں سوالات کئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا جواب وحی آنے پر دوں گا۔ چنانچہ جب وحی کے ذریعہ آپ کو ان واقعات کی حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا تب آپ نے ان کے سامنے سورۂ کہف تلاوت کر کے واقعات کی حقیقت ان پر واضح کر دی۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اصحاب کہف ورقیم (کا معاملہ ہماری

كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ	نشانیوں میں سے کوئی عجیب (معاملہ) ہے جبکہ چند نوجوان پہاڑ
اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا	کے غار میں پناہ گیر ہوگئے تھے اور یہ دعا مانگ رہے تھے اے
مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا	ہمارے پروردگار تو اپنے پاس سے ہم کو رحمت عطا کر اور
مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ	ہمارے لئے رشد و ہدایت مہیا کر پھر ہم نے غار میں چند سال
فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ	تک کے لئے ان کو تھپک کر سلا دیا پھر ان کو اٹھایا (بیدار کیا)
لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا	تاکہ ہم جان لیں کہ دونوں (بستی والوں اور غار والوں) میں سے
لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ	کس نے ان کی مدت کا صحیح اندازہ لگایا۔ ہم تجھ کو ان کا
نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۝ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا	صحیح اور سچا واقعہ بتا دیتے ہیں، بیشک وہ چند نوجوان
بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّ	تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو
رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا	ہدایت کی روشنی اور زیادہ عطا کر دی تھی اور جب وہ (حاکم
فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ	وقت کے سامنے) یہ اعلان کرنے کے لئے کمربستہ ہوگئے کہ
وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ	ہمارا پروردگار وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے
اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝	اور ہم ہرگز اس کے علاوہ کسی کو خدا نہیں پکار سکتے اور اگر
هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ	ایسا کریں تو خدا پر بہتان باندھیں گے۔ اس وقت ہم نے
دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ	ان کے دل خوب مضبوط کر دیئے تھے وہ کہتے تھے کہ یہ ہماری
بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ	قوم ہے جنہوں نے اللہ کے ماسوا بہت سے معبود بنا لئے ہیں
اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى	یہ کیوں کھلی دلیل اپنے معبودانِ باطل (کی صداقت) کے لئے
اللّٰهِ كَذِبًا ۝ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ	نہیں لاتے پس اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی
وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا	تہمت لگائے۔ اور (اے رفیقو!) جب تم ان سے اور ان
اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ	کی عبادت سے جو اللہ کے سوا وہ باطل معبودوں کی کرتے
رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ	ہیں علیحدگی اختیار کرتے ہو تو پہاڑ کی غار میں چلے چلو۔ تمہارا

لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝	پروردگار اپنی رحمت نچھاور کریگا اور تمہارے معاملہ میں سہولت کا
وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ	پیدا کرے گا۔ (اور اے پیغمبر!) تم سورج کو دیکھوگے کہ وہ نکلتے
تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ	وقت ان کے غار سے داہنی جانب بچ کر نکل جائے گا اور ڈوبتے
وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ	وقت غار سے کترا کر بائیں جانب کو ہو جاتا ہے اور وہ کشادہ غار
الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ	میں ہیں یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جس شخص کو وہ ہدایت دے
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ	وہی راہ یاب ہے اور جس شخص کو (اس کی مسلسل سرکشی کی بنا پر)
فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ	گمراہ کرے تو اس کے لئے کسی راہ دکھلانے والے مددگار کو نہ پائیگا
تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝ وَتَحْسَبُهُمْ	اور تو ان کو بیدار گمان کریگا حالانکہ وہ سو رہے ہوں گے اور ہم
اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ	ان کی کروٹیں بدلتے رہتے ہیں داہنے بھی اور بائیں بھی۔ اور ان
ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ	کا کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اگر تو
بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ	ان کو جھانک کر دیکھے تو ان کی اس شان اور حالت کو دیکھکر مرعوب
عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ	ہو جائے اور بھاگ پڑے اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھا دیا
مِنْهُمْ رُعْبًا ۝ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ	(جگا دیا) تاکہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ایک نے ان میں سے کہا:
لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ	تم غار میں کب سے ہو؟ دوسروں نے جواب دیا ایک دن یا دن کے
كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ	کچھ حصہ سے پھر انھوں نے کہا تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ
يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا	تم یہاں کتنی مدت سے ہو تو (اب یہ کرو کہ) اپنے میں سے کسی ایک کو
اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ	شہر میں یہ سکہ دے کر بھیجو کہ وہ تمہارے لئے دیکھ بھال کر عمدہ قسم
فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ	کا کھانا لائے اور اس کو چاہئے کہ بہت ہی رازدارانہ طریقہ پر
بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ	جائے اور ہرگز کسی کو اطلاع نہ ہونے دے کہ (ہم یہاں مقیم ہیں)
بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ	اس لئے کہ اگر ان پر تمہارا معاملہ منکشف ہو گیا تو وہ تم کو سنگسار
يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ	کر دیں گے یا تم کو زبردستی اپنے دین کی جانب لوٹانے پر مجبور کرینگے

وَلَن تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ۝ وَكَذَٰلِكَ	اور اس وقت تم ہرگز کامیاب نہ ہوگے (نہ دنیا میں اور نہ آخرت
أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ	میں) اور اسی طرح ہم نے شہر والوں پر ان کا معاملہ ظاہر کر دیا تاکہ
حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا	وہ یہ یقین کرلیں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی
إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ	ضرور آنیوالی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے ہم نے ان کو
فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا ۝	اس وقت اس معاملہ کی اطلاع دی جبکہ وہ قیامت کے وجود
رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِينَ	وعدم پر آپس میں اختلاف کر رہے تھے پھر وہ کہنے لگے کہ ان
غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ	اصحاب کہف پر قبہ تعمیر کردو ان کا پروردگار ان کے حال کا
عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ۝ سَيَقُولُونَ	خوب واقفکار ہے (یعنی ان سے کوئی تعرض نہ کرو) ان لوگوں نے
ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ	جو بر سر حکومت تھے کہا ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد (ہیکل) تعمیر
وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ	کریں گے۔ (اے پیغمبر) کچھ لوگ کہیں گے وہ تین آدمی ہیں،
كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ	چوتھا ان کا کتا ہے، کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں نہیں پانچ ہیں
سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ	چھٹا ان کا کتا ہے۔ یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں بعض
قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم	کہتے ہیں سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے (اے پیغمبر!) کہدے
مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ	"ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ ان کا
فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا	حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے" اور تو لوگوں سے اس
وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ	بارہ میں نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات
أَحَدًا ۝ وَلَا تَقُولَنَّ	میں ہو (یعنی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کتنے آدمی تھے،
لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ	کتنے دنوں تک رہے تھے) اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس
غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ	بارے میں کچھ دریافت کر۔
وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ	اور ہرگز کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہنا کہ میں کل کو یہ ضرور کرنے والا
وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ	ہوں مگر (یہ کہہ کر) کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب کبھی

رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ۝	بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کرلو، تم کہدو امید ہے
وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ	میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول
مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝	دیگا" اور کہتے ہیں) وہ غار میں تین سو برس تک رہے اور
قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ	لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیئے ہیں. (اے پیغمبر!) تو کہدے
لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ	اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ کتنی مدت تک رہے. وہ آسمان و زمین
اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ	کی ساری پوشیدہ باتیں جاننے والا ہے، بڑا ہی دیکھنے والا، بڑا
مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ؗ وَّلَا یُشْرِكُ	ہی سننے والا ہے! اس کے سوا لوگوں کا کوئی کارساز نہیں،
فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝	اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے"۔

کہف و رقیم لغت میں کہف پہاڑ کے اندر وسیع غار کو کہتے ہیں مگر رقیم کے معنی میں مفسرین کو سخت تردد ہے اور ضحاک اور سدی جو ہر ایک تفسیری روایت کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب ضرور منسوب کر دیا کرتے ہیں اس مقام پر بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد اقوال نقل کرتے ہیں (۱) یہ رقم سے مشتق ہے اور رقیم بمعنی مرقوم (مکتوب) ہے. چونکہ بادشاہِ وقت نے ان کی تلاش کے بعد ان کے نام پتھر کی ایک تختی پر کندہ کر دیئے تھے اس لئے ان کو اصحابِ رقیم بھی کہا جاتا ہے سعید بن جبیرؒ اسی کی تائید میں ہیں اور مفسرین کے یہاں یہی قول مشہور ہے۔ (۲) یہ وادی کا نام ہے جہاں پہاڑ میں وہ غار تھا جس میں اصحاب کہف روپوش ہوئے تھے. قتادہؒ، عطیہ عوفیؒ اور مجاہدؒ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ (۳) یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھا. (۴) عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو یہ کہتے سنا "ما ادری ما الرقیم کتاب ام بنیان؟ (میں نہیں کہہ سکتا کہ رقیم سے کندہ تختی مراد ہے یا شہر مراد ہے۔ (۵) بروایت کعب احبارؒ، وہب بن منبہؒ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ ایلہ (عقبہ) کے قریب ایک شہر کا نام ہے، یہ بلادِ روم میں واقع ہے

تاریخی اور اثری تحقیقات کے پیش نظر یہ آخری قول ہی صحیح اور قرآن عزیز کے بیان کے مطابق ہے اور باقی اقوال محض قیاس و تخمین پر مبنی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل کے لئے تاریخ اور علم الآثار کے چند اوراق کا مطالعہ ضروری ہے، اصل یہ ہے کہ یہ واقعہ بعثت مسیح (علیہ السلام) سے کچھ زمانہ بعد کا ہے اور انباط کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے یہ انباط کون ہیں؟ اور ان کا مسکن و موطن کہاں ہے؟ یہی وہ گتھی ہے جس کے سلجھ جانے پر حقیقت روشن ہو سکتی ہے۔

مورخین عرب انباط کے متعلق عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عجمی النسل ہیں اور اسی لئے وہ نبطی کو عربی کا مقابل قرار دیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اور عرب مورخین کے مختلف تاریخی مقولے اور توراۃ اور رومی و یونانی تاریخیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ نبطی خالص عربی اور اسمٰعیلی النسل ہیں مگر بدویانہ زندگی ترک کر دینے اور حجاز سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بس جانے کی وجہ سے یہ عربوں کے لئے اجنبی ہو گئے حتیٰ کہ خود بھی یہ بھول گئے کہ عرب سے ان کو کیا نسبت ہے؟ اسی بناء پر حضرت فاروق اعظم کا مشہور مقولہ ہے۔

تعلموا النسب ولا تکونوا کنبط	اپنے نسب کو سیکھو عراق کے نبط کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب
السواد اذا سئل احدھم عن اصلہ	ان میں سے کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم کس خاندان سے ہو تو
قال من قریۃ کذا۔	جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں۔

لیکن "انباط" کی بحث کو چھوڑ کر جب مورخین عرب سے یہ دریافت کیا جائے کہ نبط یا نابت کون ہے تو وہ بغیر کسی اختلاف کے فوراً یہ جواب دیں گے "ابن اسمٰعیل علیہ السلام" کیونکہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے بارہ لڑکوں میں سے بڑے کا نام نابت یا نبط ہے۔ چنانچہ ابن کثیرؒ اپنی تاریخ میں نابت کے متعلق تحریر کرتے ہیں

ثم جمیع عرب الحجاز علی اختلاف قبائلھم	تمام حجازی عرب مکہ مختلف قبائل کا نسب حضرت اسمٰعیلؑ
یرجعون فی انسابھم الی ولدیہ نابت و	کے دو صاحبزادے نابت اور قیدار پر ختم ہوتا ہے اور
قیدار و کان الرئیس بعدہ والقائم	اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد ان کا جانشین نابت ہوا،
بالامور الحاکم فی مکۃ والناظر فی امر البیت	وہی تمام امور کا والی، مکہ کا حاکم، زمزم اور کعبہ کا متولی
و زمزم نابت بن اسمعیل وھو ابن اخت	قرار پایا اور یہ بنی جرہم کا بھانجا تھا پس بنی جرہم اس تعلق

الجرھميين ثم تغلبت جرھم علی البیت طمعا فی بنی اختھم فحکموا بمکة وما والاھا عوضا عن بنی اسمعیل مدة طویلة فکان اول من صار الیہ امر البیت بعد نابت مضاض بن عمرو بن سعد بن الرقیب بن عبیر بن نابت الخ۔ [51]

کی وجہ سے اس کے بعد عرصہ تک مکہ پر حاکم و قابض رہے اور اطرافِ مکہ پر بھی ان ہی کی حکومت رہی مدت دراز کے بعد نابت کی پانچویں پشت میں سے ایک شخص مضاض نے دوبارہ مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت کو بنی جرہم کے قبضہ سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لی۔

مگر اس کے آگے عرب مورخین عام طور پر اس بارے میں خاموش ہیں کہ جب نابت بن اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل کثرت سے بڑھی تو کیا وہ صرف حجاز ہی کے اندر محدود رہی یا اطراف و جوانب میں پھیلی اور اگر ادھر اُدھر گئی تو اس کا سلسلہ کہاں تک پھیلا۔ البتہ ابن خلدون نے اس سے متعلق معلومات میں کچھ اضافہ کیا ہے وہ کہتا ہے۔

"نابت بن اسمٰعیل بیت اللہ کا متولی ہوا اور مکہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مقیم رہا تا آنکہ اس کی نسل نے اس درجہ ترقی کی کہ وہ مکہ میں نہ سما سکے اور حجاز کے اطراف و جوانب تک میں پھیل گئے۔" [52]

لیکن توراۃ نے اس مسئلہ میں مختلف مقامات پر جو کچھ کہا ہے وہ اصل گتھی کو سلجھانے میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوتا ہے، اس نے شروع میں تو حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے بارہ بیٹوں کی فہرست دی ہے اور اس کے بعد اس نے یہ بتایا ہے کہ خاندانِ نابت ساعیر (کوہِ سراط) یعنی حجاز سے شام کے علاقوں تک پھیلا ہوا ہے اور ایلہ (عقبہ) تک ان کا قبضہ ہے۔ توراۃ میں نابت کا تلفظ بھی مختلف طریقوں سے مذکور ہے کہیں نبیت ہے تو کہیں نبیط اور کہیں نبایوط۔

توراۃ کے حوالجات یہ ہیں۔

"یہ اسمٰعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبتوں کی فہرست کے اسمٰعیل کا پہلوٹھا نبیت اور قیدار اور ادبئیل اور مبسام اور مسماع اور دومہ اور مسّا اور حدر اور تیمہ اور یطور اور نفیس اور قدماہ" [53]

---

[51] البدایہ والنہایہ جلد ۲۔ [52] جلد ثانی۔ [53] تکوین باب ۲۵ آیات ۱۴-۱۳۔

یسعیاہ نبی کی پیشینگوئی میں یروشلم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

"اور قوموں کی دولت تیرے (یروشلم) کے پاس فراہم ہوگی اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عنیفہ کی سانڈنیاں تیرے گرد آ کے جمع ہوں گی وہ سب جو سبا کے ہیں آئیں گے۔ ۔ ۔ ۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔" ۵۱

اور حزقیل نبی کے صحیفہ میں ہے۔

"نبایوط (نابت) کی بھیڑیں نذر لی جائیں گی۔" ۵۲

اور سفرِ تکوین میں خاندانِ نابت کا علاقۂ سکونت یہ بتاتے ہیں۔

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے آشور کو جاتے ہیں بستے تھے ان کا قطعۂ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا۔" ۵۳

ان حوالجات کی تفصیل و تشریح کے لئے اب اگر ان رومی مورخین کی شہادات بھی شامل کر لی جائیں جو نبطیوں (انباط) کے معاصر ہیں تو یہ بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے کہ انباط اور بنو نابت بن اسمٰعیلؑ ایک ہی ہیں اور یہ کہ انھوں نے غیر متمدن زندگی کو چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کر لی تھی

یوسیفوس جو پہلی صدی عیسوی میں ہو گذرا ہے اور انباط کا معاصر بھی ہے لکھتا ہے۔

"ملک، بحرِ احمر سے نہرِ فرات تک اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں ہے جن کے سبب سے ان کا نام نباطینہ (Nabatena.) پڑ گیا ہے اس کی سرحد (مغرب میں) مصر اور عرب سنگستان (Petasia.) سے مل گئی ہے اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو شامل ہے جو مشرق کی طرف خلیج فارس تک منتہی ہوتی ہے عموماً اس ملک کے باشندوں کا نام نبایوط عرب (Nebayotn.) ہے۔ ۵۴

اور ڈائڈروس ۵۰ ق م بیان کرتا ہے۔

انباط خلیج ایلہ (عقبہ) پر رہتے ہیں۔ ۵۵

---

۵۱ باب ۶۰ آیات ۶-۷۔ ۵۲ باب ۲۵-آیات ۸۔ ۵۳ باب ۲۵ آیات ۱۸۔

۵۴ و ۵۵ ماخوذ از گولڈ کائنس آف مدین ص ۲۲۵۔ اینٹی ۱۲ (ارض القرآن جلد ۲)

اور دوسری جگہ لکھتا ہے۔

اوپر گذرتے ہوئے تم خلیج عقبہ (ایلہ) میں داخل ہو گے جس کے حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں جن کو لوگ نبط کہتے ہیں [۱]

اور آثار اور کتبات میں نبط کا نام سب سے پہلے ۷۰۰ ق م میں نظر آتا ہے جبکہ آشور بنی پال شاہِ اسیریا کے کتبہ میں وہ اپنے مفتوحین کی فہرست میں ناتان شاہِ نبط کا تذکرہ کرتا ہے [۲]

ان تمام تفاصیل کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ ایلہ (عقبہ) کی خلیج سے شام تک اور سواحلِ مصر سے خلیج فارس تک جو قوم مسطورہ بالا احوال جات میں برسر اقتدار نظر آتی ہے وہ نابت بن اسمٰعیل ہی کی نسل ہے جو نبط انباط نبایوط اور نبیت کے ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے

البتہ ایک بات طبیعت میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ نابت بن اسمٰعیل (علیہ السلام) کی جس نسل سے توراۃ اور رومی مورخین اس تفصیل کے ساتھ واقف ہوں وہ عرصہ دراز کے بعد اپنے بھائیوں (اہلِ عرب) کی نگاہ میں کیوں اجنبی ہو گئی بلکہ خود نبطی یہ کیوں بھول گئے کہ وہ خالص عربی النسل اور اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد ہیں۔ سو اس کے متعلق یاقوت حموی کے ایک جملہ سے بآسانی جواب دیا جا سکتا ہے۔ یاقوت (عربہ) کے عنوان میں بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے۔

اما النبط فکل من لم یکن راعیاً او	اہلِ عرب دنیا کے ہر اس انسان کو نبطی کہدیتے
جنداً عند العرب من ساکن الارضین	ہیں جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاز سے نکل کر مدت مدید کے بعد چونکہ نبطیوں نے بدویانہ سپاہیانہ زندگی کو چھوڑ کر متمدن شہریوں کی زندگی اختیار کر لی تھی اس لئے آہستہ آہستہ اہلِ عرب کی نگاہ میں بنی نابت اجنبی ہو گئے اور وہ ان کو بھی عجمی حکمرانوں کی طرح سمجھنے لگے لہذا ان کے طریق بود و ماند، معاشرتی تمدن اور اختلاف احوال نے ان کو حجازیوں سے الگ کر کے ان ہی کے بھائیوں کی نگاہ پر ان کے متعلق حجابی پردے ڈالدیئے۔

---

[۱] ارض القرآن ج ۲ ص ۶۱ ماخوذ از گولڈ کائنس آف مدین ص ۲۲۵ - اینٹی ۱۲ - [۲] ایضاً ج ۲ ص ۶۰۔

مورخین کے نزدیک انباط کا رقبۂ حکومت تین مختلف العہد قوموں کے دائرہ حکومت پر حاوی تھا یعنی (۱) ثمود کا ملک "وادی قریٰ" اس کا دار الحکومت مشہور شہر حِجر تھا۔ (۲) ملکِ مدین اس کا دار الحکومت خود شہر مدین ہی تھا۔ (۳) ملکِ ادوم، اس کا دار الحکومت رقیم تھا۔

انباط کا زمانۂ حکومت ۳۵۰ق م سے شروع ہو کر ۱۰۶ء تک ختم ہو جاتا ہے۔ اوائل صدی عیسوی میں رومیوں نے ان پر لشکر کشی کر کے اور شکست دے کر رقیم اور اس کے پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اور انباط کے پاس صرف حِجر کا علاقہ باقی رہ گیا تھا جو ۱۰۶ء میں جب ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو انباط کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا، رومیوں نے رقیم پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس کو اپنی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقیوں کا مرکز بنایا تو اس کا پرانا نام بدل کر "پیٹرا" نام رکھا۔

یہی وہ رقیم ہے جس کا ذکر اصحابِ کہف کے واقعہ میں قرآن عزیز نے کیا ہے "ام حسبت ان اصحٰب الکھف والرّقیم کانوا من اٰیٰتنا عجبا" اور یہی وہ شہر ہے جس کے کچھ سعادتمند انسان بت پرستی سے نفور ہو کر اور بت پرست حکمرانوں کے ظلم و جور سے محفوظ رہنے کی خاطر اس شہر کے پہاڑوں کے ایک غار میں چھپ رہے تھے۔ پس حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کا یہ ارشاد کہ رقیم "ایلہ" کے قریب ایک شہر تھا اور یہ کہ وہ روم کے علاقہ میں تھا بالکل صحیح اور قرآن اور تاریخ دونوں کے عین مطابق ہے بلاشبہ وہ ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب واقع تھا اور چونکہ رومیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا اس لئے اس کو روم کے علاقہ میں شمار کرنا قطعاً درست ہے۔

مگر حیرت ہے اس تاریخی انقلاب پر کہ جب رومیوں نے انباط کے اس مرکزی شہر کا نام پیٹرا رکھدیا تو اس نام نے تھوڑے ہی دنوں میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی کہ عرب اور عجم نے اس کی سینکڑوں اور فنونِ لطیفہ کی نیرنگیوں سے متاثر ہو کر اس کا اصل نام بالکل فراموش کر دیا اور ان کے لئے چند صدیوں ہی میں رقیم ایک اجنبی اور غیر معلوم نام ہو گیا حتیٰ کہ اہلِ عرب نے بھی اس کو بطراہی کے نام سے یاد رکھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب قرآن نے اس کا اصل نام بیان کیا تو دوسروں کی طرح اہلِ عرب بھی

ؔ ادوم کا علاقہ اول عیسو بن اسحاق (علیہ السلام) کے قبضہ میں تھا جیسا کہ ادوم کے ذکر میں قصص القرآن ج ۲ میں ذکر ہو چکا ہے

حیران تھے کہ رقیم غار کا نام ہے یا لوہے کی تختی کا یا پہاڑ کا یا شہر کا لیکن جس نام کو انباط کے بھائیوں (حجازیوں) نے بھلا دیا تھا۔ اس کو توراۃ نے اپنی سند میں محفوظ رکھا تاکہ جب نبی امی وحی کے ذریعہ اصل حقیقت کا اعلان کرے تو وہ اس کی تائید کے لئے خود کو پیش کر سکے۔ [1]

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے جہاں اور بعض جدید انکشافات کئے ہیں ان میں سب سے نمایاں اسی شہر رقیم (پیٹرا یا بطرا) کی دریافت ہے اور اس کے متعلق جس قدر اثری تحقیق کی جا رہی ہے اس سے قرآنِ عزیز کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی جاتی ہے۔

خلیج عقبہ (ایلہ) سے شمال کی جانب بڑھتے ہوئے پہاڑوں کے دو متوازی سلسلے ملتے ہیں ان ہی میں سے ایک پہاڑ کی بلندی پر انباط کا دار الحکومت رقیم آباد تھا۔

اس شہر کی موجودہ زمانے میں جو اثری پیمائش کی جا رہی ہے اس میں نئے نئے انکشافات کے سلسلہ اس کے پہاڑوں کے عجیب و غریب غار بھی قابلِ ذکر ہیں یہ غار بہت وسیع اور دور دور تک چلے گئے ہیں۔ اور اس طرح واقعہ ہیں کہ دن کی دھوپ اور تپش ان تک نہیں پہنچتی ایک غار ایسا بھی دریافت ہوا ہے کہ جس کے دہانہ پر قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بہت سے ستونوں کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی ہیکل کی عمارت ہے۔

اس صاف اور بے لاگ اثری اور تاریخی شہادتوں کے بعد یہ کہنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ قرآنِ عزیز نے جن اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کیا ہے وہ اسی شہر رقیم سے تعلق رکھتا ہے۔

واقعہ | اسمٰعیلی عربوں کے مذہب سے متعلق تاریخ کے صفحات یہ شہادت دیتے ہیں کہ ان میں گو کچھ عرصہ تک باپ دادا کا دینِ حق "ملتِ ابراہیم" باقی رہا مگر آہستہ آہستہ مصر، شام اور عراق کے صنم پرستوں کے تعلقات نے عمرو بن لحی کے ذریعہ ان میں بت پرستی اور ستارہ پرستی کی داغ بیل ڈال دی اور کچھ عرصہ بعد ان عربوں کو شرک پرستی میں ایسا ید طولیٰ حاصل ہو گیا کہ وہ دوسروں کے لئے پیشرو بن گئے چنانچہ نابت کی اولاد بھی شرک کی گمراہی میں مبتلا تھی اور ان کے مشہور بت ذوالشریٰ، لات، منات، ہبل، کسعہ

---

[1] توراۃ سفر عدد اور صحیفہ یسعیاہ میں اس شہر کا نام "راقیم" بیان کیا گیا ہے۔ (دائرۃ المعارف عرب)

غیاثین اور خوریش تھے ؎ صدیوں تک نبطی بت پرستی کی اسی گمراہی میں مبتلا رہے کہ مسیحی دور کے اوائل میں دارالحکومت رقیم کے اندر ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مسیحی مذہب کا ابتدائی دور ہے نبطی حکومت کے اطراف یعنی شام وغیرہ میں عیسائیت کا زور ہے کہ رقیم کی چند نوجوان سیدروحیں شرک سے بیزار اور نفور ہو کر توحید کی جانب مائل ہو جاتی اور دین عیسوی کو قبول کر لیتی ہیں۔ شدہ شدہ یہ بات بادشاہِ وقت تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ نوجوانوں کو دربار میں بلاتا اور انکشافِ حال چاہتا ہے۔ نوجوان کلمۂ حق بلند کرنے میں بے باک اور جری ثابت ہوتے ہیں یہ بات بادشاہ کو ناگوار گذرتی ہے مگر وہ دوبارہ معاملہ پر غور کرنے کے لئے ان کو چند روز کی مہلت دیتا ہے۔ یہ دربار سے واپس آکر آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور طے پاتا ہے کہ خاموشی کے ساتھ کسی پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہو جانا چاہئے تاکہ مشرکوں کے شر سے محفوظ رہ کر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہ سکیں۔ یہ سوچ کر وہ ایک غار میں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ غار میں داخل ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر نیند طاری کر دیتا ہے اور وہ خواب ہی کی حالت میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ غار کی عجیب کیفیت ہے اندر سے بہت وسیع ہے مگر قدرت نے اس کو ایسا موقع نصیب کیا ہے کہ زندگی کے بقا کے قدرتی سامان وہاں سب موجود ہیں ایک طرف دہانہ ہے تو دوسری جانب ہوا گذرنے کے منفذ اور سوراخ ہیں جن کی وجہ سے ہر وقت تازہ ہوا اندر آتی جاتی رہتی ہے۔ غار شمال جنوب رویہ ہے اس لئے طلوع و غروب کے وقت آفتاب کی تپش اندر نہیں پہنچ پاتی مگر ہلکی ہلکی روشنی برابر پہنچی رہتی ہے اور ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ نہ تاریکی ہی ہے کہ کچھ نظر نہ آئے اور نہ اتنی روشنی ہے کہ کھلے میدان کی طرح جگہ روشن ہو جائے۔ اس حالت میں چند انسان اس غار میں خواب آلودہ ہیں اور ان کا رفیق کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے دہانہ پر باہر کی جانب منہ کئے بیٹھا ہے۔

اس مجموعی صورتِ حال نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ پہاڑوں کے درمیان غار کے اندر جھانکنے والے انسان پر خوف و ہراس کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

؎ کتاب الاصنام لدین الکلبی

برسوں تک یہ نوجوان اسی حالت میں آرام کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں کہ شہر میں انقلاب ہو جاتا ہے۔ رومی عیسائی، نبطی حکومت پر حملہ آور ہوتے اور دشمن کو شکست دے کر اس پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس طرح رقیم (پیٹرا) عیسائیت کی آغوش میں آجاتا ہے۔ اب خدا کی مشیت ارادہ کرتی ہے کہ یہ نوجوان بیدار ہوں، وہ بیدار ہو جاتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کتنی مدت سوتے رہے ایک نے جواب دیا کہ ایک دن، اور دوسرے نے کہا یا دن کا بھی کچھ حصہ، پھر کہنے لگے کہ ہم میں سے کوئی شہر جا کر کھانا لے آئے اور یہ سکہ لیجائے مگر جو بھی جائے اس طرح لین دین کرے کہ شہر والوں کو پتہ نہ لگ سکے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں؟ ورنہ مصیبت آجائے گی، بادشاہ ظالم بھی ہے اور مشرک بھی، وہ یا تو شرک پر آمادہ اور بے دینی پر مجبور کرے گا اور یا ہم سب کو قتل کر ڈالے گا اور یہ باتیں ہماری دین و دنیا کو برباد کر دینے والی ثابت ہوں گی۔

اب نوجوانوں میں سے ایک شخص سکہ لے کر شہر کو گیا وہاں دیکھا تو حالات بالکل بدل چکے ہیں اور نئے آدمی اور نیا طور و طریقہ نظر آرہا ہے مگر پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے ایک باورچی کی دکان پر پہنچا اور کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، جب قیمت ادا کرنے لگا تو باورچی نے دیکھا کہ سکہ قدیم ہے۔ اس طرح آخر بات کھل گئی۔ لوگوں کو جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو انھوں نے اس شخص کا خیر مقدم کیا اور اس عجیب و غریب معاملہ سے بہت زیادہ دلچسپی لی۔ کیونکہ عرصہ ہوا کہ یہاں مشرک بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔

اس شخص نے جب یہ حال دیکھا تو اگرچہ عیسائیت پھیل جانے سے اس کو بیحد خوشی ہوئی مگر اپنے اور اپنے رفیقوں کے لئے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے علیحدہ رہ کر یادِ خدا میں گذار دیں اس لئے کسی طرح مجمع سے جان بچا کر پہاڑ کی راہ لی اور اپنے رفقاء میں پہنچکر سب حال کہہ سنایا۔ ادھر شہریوں میں ان کی جستجو کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے آخر ان کو ایک غار میں پالیا، لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ شہر چلیں اور اپنی پاک زندگی سے اہلِ شہر کو فائدہ پہنچائیں مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنی عمر کا باقی حصہ راہبانہ زندگی کے ساتھ اسی غار میں گذار دیا۔

جب ان مردانِ خدا راہبوں کا انتقال ہوگیا تو اب لوگوں میں چرچا ہوا کہ ان کی یادگار قائم ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ان میں جو حضرات ذی اثر اور با اقتدار تھے انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کے غار پر ہیکل (مسجد) تعمیر کریں گے اور غار کے دہانہ پر ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کرا دیا۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت میں ہے کہ جب اس جوان کے پیچھے بادشاہِ وقت اور پبلک دونوں آئے تو غار کے قریب پہنچ کر وہ یہ نہ معلوم کر سکے کہ جوان کس جانب چلا گیا اور جب بہت جستجو کے بعد بھی اصحابِ کہف کا پتہ نہ پا سکے تب مجبور ہو کر واپس ہو گئے اور ان کی یادگار میں پہاڑ پر ایک ہیکل (مسجد) تعمیر کرا دیا۔ [1]

واقعہ کی تاریخی حیثیت

ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور دیگر بزرگوں کی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت سے کچھ زمانہ بعد کا ہے یعنی ابتدائی دورِ مسیحی کا واقعہ ہے مگر مجھ کو اس قول میں یہ تردد ہے کہ محمد بن اسحٰق کی اس روایت سے جو اس واقعہ کے شانِ نزول سے متعلق ہے" یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف کے بارے میں قریشِ مکہ کو یہود نے تعلیم کیا تھا کہ وہ دوسرے سوالوں کے ساتھ ایک سوال یہ بھی کریں۔ اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اس واقعہ کے ساتھ یہود کو خاص دلچسپی تھی پس اگر یہ واقعہ عیسائیت کی ترقی سے متعلق تھا تو یہود کو اس کے ساتھ دلچسپی کے کیا معنی ہیں کیونکہ یہودیت اور عیسائیت تو نبرد آزما اور حریف جماعتیں ہیں اس لئے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح (علیہ السلام) سے بہت پہلے یہودی دور سے متعلق ہے [2]

ابن کثیر (رحمہ اللہ) کا یہ سوال اگرچہ اہمیت رکھتا ہے لیکن تاریخی سندات اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ خلاف فیصلہ کرتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ مسلم ہے کہ واقعہ زیرِ بحث شہر رقیم میں پیش آیا ہے اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ "رقیم" اپنی آبادی کے وقت سے کبھی یہودیت سے متاثر نہیں ہوا بلکہ نبطی دور میں بت پرستی کا گہوارہ رہا اور اس کے بعد رومیوں نے جب اس پر قبضہ کر لیا تو وہ عیسائیت کی آغوش میں آگیا۔ چنانچہ رقیم کی تاریخ ان ہی دو عہدوں سے بنتی ہے تو پھر ایک خاص نکتہ کے پیشِ نظر

---

[1] فتح الباری ج ۲ حدیث غار و تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ کہف البدایہ والنہایہ ج ۲۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ کہف البدایہ والنہایہ ج ۲

محض ظن و تخمین سے کس طرح اس واقعہ کو یہودیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے اس بات کی تائید اس سے
بھی ہوتی ہے کہ مسیحی مذہب کے ابتدائی دور میں اس قسم کے چند واقعات اور بھی پیش آئے ہیں جن میں مشرک
اور بت پرست بادشاہوں کے خوف سے عیسائیوں نے غاروں اور پہاڑوں میں جا کر راہبانہ زندگی اختیار
کی ہے چنانچہ ایک واقعہ شہر افسس میں پیش آیا، ایک انطاکیہ میں اور ایک خود روم میں پیش آ چکا ہے لہٰذا
قرآنِ عزیز نے ایک ایسے ہی واقعہ کی خبر دی ہے جو شہر رقیم یا راقیم میں پیش آیا تھا۔

لہٰذا ابنِ اسحٰق کی روایت کے متعلق دو باتوں میں سے ایک بات تسلیم کرنی چاہیے اول یہ
کہ حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے اس روایت میں تین سوالات کا جو ذکر کیا ہے بظاہر یہ
معلوم ہوتا ہے کہ دو سوالات تو صرف یہودی علماء کے بتائے ہوئے تھے اور ان سے مشرکینِ مکہ قطعاً
ناآشنا تھے مگر تیسرے سوال (اصحابِ کہف کا سوال) سے متعلق خود قریشِ مکہ کو بھی ایک حد تک علم تھا اس لیے
کہ یہ واقعہ ان کے بہت قریب ہی پیش آیا تھا اور اگرچہ وہ رقیم کو بھول گئے تھے لیکن پیٹرا (بطرا) سے وہ
بخوبی واقف تھے اور شام کی تجارت کی وجہ سے نبطیوں کے ساتھ ان کا ہر وقت کا واسطہ تھا اور
واقعہ بھی کچھ زیادہ طویل عرصہ کا نہ تھا۔ پس ہو سکتا ہے کہ وہ اس واقعہ کی کچھ معمولی باتیں جانتے ہوں
اور چونکہ اس کا تعلق اہلِ کتاب سے تھا اس لئے قریشیوں نے آپ کی صداقت کے امتحان کے لئے
بشورۂ یہود اس کو بھی شامل کر لیا ہو اور چونکہ سوالات بہر حال مشرکین ہی کی جانب سے کئے گئے اس لیے
حضرت ابنِ عباسؓ نے اختصار کے طور پر ان تینوں کو ایک ہی اسلوب سے نقل فرما دیا۔

یہ احتمال محض اندھیرے کا تیر نہیں ہے بلکہ قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان سے بھی اس کی تصدیق
ہوتی ہے۔ کیونکہ زیرِ بحث تینوں سوالات میں سے پہلے اور دوسرے سوالوں کے متعلق قرآن کا اسلوبِ
بیان یہ ہے "یسئلونک عن ذی القرنین" "یسئلونک عن الروح" یعنی ان دونوں جگہ سوال کی حیثیت
کو نمایاں کیا ہے مگر تیسرے مسئلہ میں پیرایۂ بیان اس سے جدا یہ اختیار کیا گیا ہے "ام حسبت ان
اصحٰب الکھف والرقیم کانوا من اٰیٰتنا عجبا" اس جگہ اگرچہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
جانب ہے لیکن مقصود وہی لوگ ہیں جو سوال کر رہے ہیں اور اس واقعہ کی کچھ حقیقت جاننے کی

وجہ سے اُسے ایک عجیب و غریب واقعہ سمجھتے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید تفصیلات کے طالب ہیں نیز اسی واقعہ میں قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جب آپ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ ان کو بتائیں گے تو آپ ان کی تعداد کے بارے میں مختلف چرچے سنیں گے " سیقولون ثلثۃ" "یقولون خمسۃ" یہ بھی ثبوت ہے اس امر کا کہ قریشِ مکہ ضرور اس واقعہ سے قدرے آگاہ تھے اور اسی لئے "الرقیم" کہکر قرآن نے اس جانب ان کو توجہ دلائی کہ تم آج جس کا بطرا کہکر ذکر کرتے ہو وہ دراصل تمہارے ہی بھائیوں کی حکومت کا مرکزی شہر "رقیم" ہے جو تم سے فراموش ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ سے رومیوں کی فتوحاتِ رقیم و حجر تک نبطیوں کے ہاتھوں یہودیوں کو ہر قسم کی تکالیف پیش آچکی اور ان کے ساتھ سیاسی و مذہبی حریفانہ نبرد آزمائیاں بھی ہو چکی تھیں[1] اس لئے اگرچہ اس واقعہ میں عیسائیت کی صداقت کا ایک پہلو ضرور نکلتا تھا تاہم نبطیوں کی مشرکانہ زندگی اور رومیوں کے ہاتھوں ان کی تذلیل و تحقیر کا پہلو بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہوتا تھا جو بہر حال ان کی مسرت کا باعث تھا اور اسی لئے غالباً یہود نے اس حیثیت کو نظر انداز کر دیا اور دو سوالوں کے ساتھ اس تیسرے سوال کو بھی خصوصیت کے ساتھ منتخب کیا

تفسیری حقائق (۱) "ام حسبت ان اصحٰب الکھف والرقیم کانوا من اٰیٰتنا عجبا" اے پیغمبر! کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم ہماری نشانیوں میں سے عجیب نشانی تھے؟ یعنی جو لوگ اس واقعہ کو خدا کی نشانیوں میں سے بہت زیادہ عجیب نشانی سمجھ رہے ہیں تو ان پر یہ ظاہر کر دو کہ میرے خدا کے نشان یوں تو کائناتِ انسانی کے لئے بلاشبہ عجیب ہیں لیکن اس کی قدرتِ کاملہ کے پیشِ نظر اس کے دوسرے نشانات کے مقابلہ میں کوئی عجیب و غریب نشان نہیں ہے اس لئے کہ زمین و آسمان کی صناعی، سورج چاند اور ستاروں کی تخلیق اور ان کا حیرت زا نظامِ کشش، نظامِ فلکی کی یہ بے نظیر ترتیب، انسان پر وحی الٰہی کا نزول اور بظاہر اسباب حق کی کمزوری اور باطل کی قوت کے باوجود حق کی فتح اور باطل کی شکست، ایسے امور ہیں جو اس واقعہ سے کہیں زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں پس جن لوگوں کو یہ واقعہ

---

[1] سفر عدد باب ۲۰- آیات ۲۱-۱۴- و سیعیاہ -

بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتا ہے وہ اگر قدرتِ حق کی مسطورہ بالا کارفرمائیوں پر نگاہِ حقیقت آگاہ سے غور کریں تو پھر ان کو بھی اقرار کرنا پڑے کہ بلا شبہ قدرتِ حق کے سامنے یہ واقعہ نہ عجیب ہے اور نہ حیرت انگیز البتہ عبرت زا اور بصیرت افزا ضرور ہے۔ "لو کانوا یفقھون"۔

(۲) امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اصحابِ کہف پر بھی ایک باب معنون کیا ہے مگر مسطورہ بالا واقعہ سے متعلق مشہور حدیث ان کی شرائط کے مطابق ثابت نہیں ہوئی اس لئے انھوں نے سورۂ کہف کی آیات زیرِ بحث کی تفسیر اس روایت کے ذریعہ نہیں کی۔ البتہ انھوں نے بنی اسرائیل کے ایک دوسرے واقعہ کے پیشِ نظر جو کہ "حدیث الغار" کے عنوان سے معنون ہے یہ سمجھا ہے کہ "اصحابِ کہف" اور "اصحاب رقیم" دو الگ الگ شخصیتیں ہیں اور اصحاب رقیم وہ حضرات ہیں جن کا ذکر "حدیث الغار" میں کیا گیا ہے اسی بنا پر انھوں نے حدیثِ غار کو "اصحاب الرقیم" کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ حدیثِ غار کا واقعہ یہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں سے پہلے بنی اسرائیل میں سے تین شخص سفر کر رہے تھے اثنائے راہ میں بارش آگئی، وہ تینوں ایک پہاڑ کی کھوہ (غار) میں پناہ لینے کے لئے داخل ہو گئے۔ اتفاقاً پہاڑ کی اونچائی سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر غار کے منہ پر آگرا اور اس کو ڈھانپ لیا۔ یہ دیکھ کر تینوں نے ایک دوسرے سے کہا: بھائی! اب اس ویرانہ میں اس حادثہ سے نجات کی بظاہرِ اسباب تو کوئی صورت نظر نہیں آتی البتہ اگر ہم میں سے ہر ایک شخص اپنی زندگی کے کسی ایسے کام کا ذکر کرکے "جو اس نے ریا و نمود سے خالی صرف رضاءِ الٰہی کی خاطر کیا ہو" ربّ العٰلمین کی درگاہ میں دعا مانگے تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے نجات دیدے، تب ان میں سے ایک نے کہا، خدایا! تجھ کو خوب معلوم ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک مزدور سے چند سیر چاولوں پر مزدوری کرائی تھی مگر کام کے بعد مزدور چلا گیا اور اس کی اجرت میرے ذمہ باقی رہ گئی۔ فصل پر جب میں نے چاول کی کاشت کی تو اس کا حصہ بھی شامل کر لیا اور پیداوار پر اس کے حصہ کے چاولوں سے ایک عمدہ بیل خرید لیا اس عرصہ میں مزدور آیا اور اس نے اپنی مزدوری کا مطالبہ کیا میں نے بیل کی رسّی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا: کہ یہ بیل تیری مزدوری کا حاصل ہے اور اس کو واقعہ سنایا وہ بہت خوش ہوا اور

بیل کو لے گیا۔ پس اے خدا! اگر تیرے نزدیک میرا یہ عمل صرف تیری خوشنودی اور حقوق العباد کی حفاظت پر مبنی تھا تو اس کی برکت سے ہماری اس مصیبت کو دور کر دے چنانچہ اس کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ بھاری چٹان نے حرکت کی اور غار کے منہ سے کچھ ہٹ گئی اور کشادگی پیدا ہوگئی۔ اب دوسرے نے کہا: "خدایا! تو دانا و بینا ہے کہ میرے والدین بہت ضعیف اور ناتواں تھے اس لئے میرا یہ دستور تھا کہ اپنی بکریوں کا دودھ دوہ کر شام کو سب سے پہلے ان کو پلاتا اور بعد میں اپنے اہل و عیال کو شکم سیر کرتا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھ کو جنگل میں دیر ہوگئی۔ دودھ لے کر گھر آیا تو والدین انتظار کر کے سو چکے تھے۔ اہل و عیال بھوک سے مضطرب اور بے تاب تھے اور دودھ کے خواہشمند، مگر میں نے کہا جب تک والدین اٹھ کر نہ پی لیں گے کسی کو دودھ نہیں ملے گا اور والدین کی نیند خراب نہ ہو اس لئے بیدار کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور تمام شب اسی طرح ان کے سرہانے دودھ لئے بیٹھا رہا کہ شاید درمیان میں بیدار ہوں اور بھوک ستائے مگر وہ صبح کو ہی بیدار ہوئے تب میں نے پہلے ان کو دودھ پلایا اور جب وہ سیراب ہو گئے تو بعد میں اہل و عیال کو دیا" پس اے خدا! اگر میرا یہ عمل صرف تیری رضا اور اطاعتِ والدین کے ادائے حق کے لئے تھا تو ہماری اس مصیبت کو ٹال دے! پتھر میں دوبارہ جنبش ہوئی اور چٹان اس درجہ ہٹ گئی کہ سامنے آسمان نظر آنے لگا۔ اب تیسرے شخص کی نوبت تھی، اس نے کہا: "الٰہی! تو علیم و خبیر ہے کہ میں اپنی چچا زاد بہن پر عاشق تھا اور اس کے وصل کے لئے بیتاب مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی تھی بمشکل تمام میں نے اس کو سو درہم دے کر ورغلایا اور عملِ بد پر آمادہ کر لیا، جب میں اس کے قریب ہوا اور ہم دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ رہا تو اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "بندۂ خدا! خدا کے خوف سے ڈر اور ناحق عصمت ریزی پر بے باک نہ بن" یہ سنتا تھا کہ مجھ پر تیرا خوف غالب آیا اور میں اس سے الگ ہو گیا اور سو درہم بھی اسی کو بخش دیئے' الہ العٰلمین! اگر میرا یہ عمل خالص تیری رضا اور تیرے خوف کے پیشِ نظر تھا تو ہماری اس آفت کو دور کر اور ہم کو اس سے نجات دے۔ اس کے بعد فوراً چٹان حرکت میں آئی اور غار کے دہانہ پر سے لڑھک کر نیچے جا رہی اور وہ تینوں اسرائیلی اس مصیبت سے نجات پا کر مسرت و شادمانی کے ساتھ اپنی منزل پر روانہ ہوگئے۔

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بزار اور طبرانی نے سند حسن کے ساتھ نعمان بن بشیرؓ سے بھی روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ نعمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا آپ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سنا رہے تھے غالباً اسی بنا پر امام بخاریؒ نے رقیم کی تفسیر میں یہ "حدیث غار" روایت کی ہے۔ۖ

لیکن اس تحقیق کے بعد جو گذشتہ سطور میں زیرِ بحث آچکی جبکہ قرآن، بعض آثار صحابہؓ اور تاریخ سے یہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ رقیم اس شہر کا نام ہے جس کے کسی پہاڑ کے غار میں اصحابِ کہف جا چھپے تھے تو اب مسند بزار اور معجم طبرانی کی روایت کے مبہم الفاظ سے اصحابِ رقیم کو اصحابِ کہف سے جدا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ روایتِ نعمانؓ میں یہ احتمال موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اصحابِ رقیم کا ذکر فرما رہے ہوں اور اس کے ساتھ اس واقعہ کا بھی ذکر فرمایا ہو اور بعد کو راوی نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثِ غار کا واقعہ دراصل اصحابِ رقیم کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے۔ نیز جبکہ عربی زبان میں "رقیم" کے معنی "غار" کے کبھی نہیں آتے نہ حقیقتہً نہ مجازاً تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "رقیم" بمعنی غار کہکر حدیثِ غار کو اس کی تفسیر بتایا ہو، یہ راوی کا وہم ہے اور غالباً اسی لئے بزار اور طبرانی کے علاوہ کسی نے بھی اس اضافہ کو بیان نہیں کیا حالانکہ کتبِ حدیث میں یہ واقعہ بہ کثرت منقول ہے اور خود صحیح بخاری بھی اس اضافہ سے خالی ہے۔ نیز اگر صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الرقیم" کی تفسیر صاف اور واضح الفاظ میں خود ارشاد فرما دی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ جلیل القدر مفسرین اپنی اپنی تحقیق کے مطابق الرقیم کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل فرماتے اور خود حافظ ابن حجر عسقلانیؒ بھی یہ جرأت نہ کرتے کہ اس روایت کے خلاف یہ فرمائیں کہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ اصحابِ کہف اور اصحابِ رقیم دونوں ایک ہی ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں۔

ۖ فتح الباری ج ۶ حدیث الغار۔

وقال قوم اخبر الله عن قصة اصحاب	اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ
الکهف ولم یخبر عن قصة اصحاب	کہف کا واقعہ تو ہم کو بتایا ہے مگر اصحابِ رقیم کا واقعہ
الرقیم (قلت) ولیس کذلك بل	نہیں بیان کیا (میں کہتا ہوں) یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن
السیاق یقتضی ان اصحاب	کا سیاق یہ چاہتا ہے کہ اصحاب کہف اور اصحاب رقیم
الکهف هم اصحاب الرقیم نخ ۵۱	ایک ہی ہیں۔

(۳) "فضربنا علی اذانهم فی الکهف سنین عددا" مولانا آزاد نے "ضرب علی الاذان" کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں "صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے یعنی دنیا کی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی"[۵۲] آیت کی تفسیر میں یہ قول ضعیف اور شاذ ہے[۵۳]۔ اس کے برعکس مفسرین کے نزدیک مشہور تفسیر یہ ہے کہ ان پر نیند طاری ہو گئی تھی چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا اس لئے اس حالت کو "ضرب علی الاذان" سے تعبیر کیا گیا مگر اس تفسیر کے متعلق مولانا آزاد یہ فرماتے ہیں "اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لئے "ضرب علی الاذان" کی تعبیر نہیں ملتی لیکن وہ (مفسرین) کہتے ہیں یہ ایک طرح کا استعارہ ہے گہری نیند کی حالت کو "ضرب علی الاذان" کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔"[۵۴]

ہمارے نزدیک مفسرین کی تفسیر ہی راجح ہے اور یہ استعارہ ہر زبان کے محاورات میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب ماں گود کے بچے کو لوریاں دے کر سلاتی ہے تو اس کے کان اور بازو پر ہاتھ رکھ کر تھپکتی جاتی ہے اسلئے اردو زبان میں بھی "کانوں کو تھپک دینا" نیند طاری کر دینے کے لئے بولا جاتا ہے چنانچہ شیخ الہند (نور اللہ مرقدہ) نے اس جملہ کا ترجمہ اسی طرح کیا ہے[۵۵]

"پھر تھپک دیئے ہم نے ان کے کان اس کھوہ (غار) میں چند برس گنتی کے۔" (کہف)

علاوہ ازیں عربی زبان میں "ضرب علی اذنه" کے معنی "منعه ان یسمع" کے آتے ہیں یعنی

---

[۵۱] فتح الباری ج ۶ ص ۳۹۳۔ [۵۲] ترجمان القرآن ج ۲۔ [۵۳] فتح الباری ج ۶ [۵۴] ترجمان القرآن ج ۲

[۵۵] ترجمہ حضرت مولانا محمود الحسن نور اللہ مرقدہ۔

اس کو سننے سے روک دیا" اب سننے سے روک دینے کی متعدد صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص بستی سے دور جنگل میں غار کی کھوہ میں جا بیٹھا اور اس لئے دنیا کی باتوں سے اس کے کان نا آشنا ہو گئے دوسری یہ کہ وہ بہرا ہو گیا اور سننے سے معذور کر دیا گیا۔ تیسری یہ کہ وہ سو گیا اور اس کے دیگر حواسِ ظاہرہ کی طرح کان بھی سننے سے معطل ہو گئے۔ لہذا "ضرب علی الآذان" کی تعبیر ان سب صورتوں کے لئے یکساں قابلِ استعمال ہے اور استعارہ و تشبیہ ہے تو تینوں معنیٰ کے لئے ہے۔ البتہ مولانا آزاد کی تفسیر میں یہ اشکال ضرور لازم آتا ہے کہ اگر "ضرب علی الآذان" کے معنی یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے" یعنی وہ بحالتِ بیداری عام زندگی کے مطابق بستی سے دور پہاڑ کے غار میں راہبانہ زندگی بسر کر رہے تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے؟ وکذلک بعثناهم لیتساءلوا بینهم قال قائل منهم کم لبثتم قالوا لبثنا یوماً او بعض یوم" اور ہم نے ان کو اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال کریں، ایک نے ان میں سے کہا تم یہاں کتنی مدت ٹھیرے رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ"۔

کیا یہ آیت اپنے صاف معنی میں یہ ظاہر نہیں کرتی کہ "ضرب علی الاذان" کی صاف تعبیر یہاں وہی ہے جو جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح اور راجح ہے بلکہ ایسے موقع پر "بعثناهم" کی تعبیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ مفسرین کی تفسیر کے علاوہ دوسرے معنی لینا قطعاً بے محل ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن نے اصحاب کہف کی اس گفتگو کے بعد جو وہاں سوئے رہنے کی مدت سے متعلق ہے ان کی یہ گفتگو بھی نقل کی ہے کہ ان میں سے کوئی شہر جائے اور پوشیدہ طور پر جائے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے یہ بھی جمہور کی تفسیر کو قوت پہنچاتی ہے اس لئے کہ غار میں مدتِ قیام پر بات چیت اور پھر فوراً کھانے کی خواہش کا اظہار دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑیئے تو صاف معنی وہی بنتے ہیں جو مفسرین نے بیان کئے ہیں اور مولانا آزاد کی یہ تفسیر کہ "عرصۂ دراز کے بعد ان کو شہر کی حالت معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی" تکلفِ بارد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کو شروع سے آخر تک . . . . اس واقعہ کی تمام آیات میں تکلف بارد اختیار کرنا پڑا ہے مثلاً جب قرآن نے ان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ کہا "وتحسبھم ایقاظاً وھم رقود" تو ان کو گمان کرے گا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ خواب میں ہیں" تو مولانا موصوف کو اپنی تفسیر کو صحیح بنانے کے لئے "یقظ" کے معنی "زندہ" اور "رقد" کے معنی "مردہ" کے اختیار کرنے پڑے ہیں حالانکہ ان کے حقیقی معنی "بیداری" اور "نیند" کے ہیں اور یہ معنی بلا تکلف یہاں صادق آتے ہیں۔ پس مولانا پر بھی وہی بات صادق آتی ہے جو انھوں نے مفسرین کی مسلمہ تفسیر پر لازم کی ہے یعنی ففی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ (کلام میں استعارہ کی راہ سے مجاز اختیار کیا گیا ہے)

بلکہ اگر غائر نظر سے دیکھیے تو "حقیقت کے صادق ہوتے ہوئے مجاز اختیار کرنا" مولانا آزاد کی تفسیر پر تو صادق آتا ہے لیکن جمہور مفسرین کی تفسیر پر صادق نہیں آتا۔

مولانا آزاد نے آیات زیرِ بحث کی تفسیر میں اگرچہ مفسرین کے مختار قول کے خلاف ضعیف قول کو اپنا مختار بنایا ہے تاہم مفسرین کے قول کو احتمال کے درجہ میں تسلیم کرتے ہوئے ان کی تائید میں جو جملے ارشاد فرمائے ہیں وہ بلا شبہ ایسے حضرات کے لئے خصوصاً قابلِ مطالعہ ہیں جو اس قسم کے واقعات کو محض تعجب خیز سمجھ کر خلافِ عقل کہہ دینے کے عادی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"بہر حال اگر یہاں "ضرب علی الاذان" سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ثم بعثناھم کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہوگئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربہ میں آتی رہتی ہیں۔ پس اگر اصحابِ کہف پر قدرتِ الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہوگئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انھیں سلائے رکھا، تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔"[1]

(۴) ثم بعثناھم لنعلم ای الحزبین احصیٰ لما لبثوا امدا "پھر ہم نے ان کو (خواب سے) اٹھایا

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲۔

تاکہ معلوم کریں کہ دو جماعتوں میں سے کس نے اس مدت کو محفوظ رکھا جس میں وہ (غار کے اندر) رہے۔

یہاں دو جماعتوں میں سے ایک اصحابِ کہف کی اور دوسری اہلِ شہر کی جماعت مراد ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اس لئے کیا کہ صحیح مدت ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ خدائے تعالیٰ نے ان کو برسوں تک بحالتِ خواب زندہ رکھا، جبکہ وہ زندگی کی بقا کے وسائل سے یکسر محروم تھے" لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ بلاشبہ اسی طرح وہ مخلوق کو مرنے کے بعد بھی زندہ کرے گا اور بیشک قیامت اور بعث بعد الموت کا مسئلہ حق ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو بیدار کر دیا اور ان میں سے ایک نوجوان شہر میں کھانا خرید کرنے گیا تو اس زمانہ میں بستی والوں کے درمیان "بعث بعد الموت" پر جھگڑا اور مناقشہ جاری تھا ایک جماعت کہتی تھی کہ فقط روح کا بعث ہوگا اور دوسری جماعت قائل تھی کہ روح اور جسم دونوں کو زندہ ہونا ہے یہ تو نصاریٰ کی جماعتیں تھیں اور جو بت پرست مشرک آباد تھے وہ سرے سے بعث بعد الموت ہی کے منکر تھے ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو غار سے بیدار کر کے بھیجا اور اس طرح جب اصحابِ کہف کا واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا تو اس نے علیٰ رؤس الاشہاد یہ نظیر قائم کر دی کہ جس طرح برسوں تک اسباب حیات سے محروم رہنے کے باوجود روح کے ساتھ جسم بھی صحیح و سالم باقی رہا۔ اسی طرح "بعث بعد الموت" روح اور جسم دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح سوتے رہنے کے بعد اصحابِ کہف بیدار کر دیئے گئے اسی طرح قبر (عالمِ برزخ) میں سینکڑوں اور ہزاروں برس مردہ رہنے کے بعد قیامت میں زندہ کر دیئے جائیں گے۔" وکذلک اعثرنا علیھم لیعلموا ان وعد اللہ حق وان الساعۃ لا ریب فیھا اذ یتنازعون بینھم امرھم۔" اور پھر (دیکھو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے واقف کر دیا (ان کی بات پوشیدہ نہ رہ سکی) اور اس لئے واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ [1]

آیت کی یہ تفسیر عکرمہؒ کی روایت سے ماخوذ ہے اور اسی کو عام طور پر اختیار کیا گیا ہے لیکن مولانا آزاد نے "لا ریب فیھا" کو "اذ یتنازعون بینھم امرھم" سے جدا کرتے ہوئے آیت کے معنی یہ کئے ہیں" اسی وقت کی

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ عن عکرمہ۔

بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے لگے ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے۔ لوگوں نے کہا اس غار پر ایک عمارت بنادو۔" حضرت شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہ) نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔

"در آں وقتیکہ نزاع میکردند مرداں درمیان خود در مقدمہ ایشاں پس گفتند عمارت کنید بر غار ایشاں"

یعنی یہ حضرات "یتنازعون" میں قیامت کے متعلق شہریوں کے باہم اختلاف کو مراد نہیں لیتے بلکہ اس گفتگو کو مراد لیتے ہیں جو اصحاب کہف کے مقدر پر ہیکل تعمیر کرنے کے بارے میں ہوئی۔

(۵) "فأووا الی الکھف" ہم نے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اور قرآن کی اندرونی اور تاریخ و روایات کی بیرونی شہادتوں سے جن امور کو ثابت کیا ہے ان سے جدا عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ یہود بنی اسرائیل کے قدیم زمانہ کا ہے جو شہر افسس میں ایک مشرک بادشاہ دقیانوس کے زمانۂ حکومت میں پیش آیا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انھوں نے عیسائیت نہیں بلکہ یہودیت کو قبول کر لیا تھا اور بادشاہِ وقت کے ظلم و جور سے بچ کر غار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ لیکن ہم اس پر گذشتہ سطور میں سیر حاصل بحث کر چکے اور ثابت کر چکے ہیں کہ اس واقعہ کا تعلق عیسائی دور سے ہے۔

(۶) "سیقولون ثلثۃ رابعھم کلبھم ویقولون خمسۃ سادسھم کلبھم رجما بالغیب" اللہ تعالیٰ نے واقعہ سے متعلق اُن حقائق کے اظہار کے بعد جو اس کے مقصدِ "تذکیر" کے لئے مفید تھے واقعہ کی اُن جزئیات کے متعلق جو محض تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے جان لینے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ان لاحاصل بحثوں سے پرہیز کریں، اور ان پر سرسری طور سے گذر جائیں اور بیکار باتوں کے کھوج لگانے کی فکر نہ کریں۔ مثلاً یہ کہ ان نوجوانوں کی تعداد کیا تھی؟ ان کی عمروں کا تناسب کیا تھا؟ وہ غار میں کتنی مدت مقیم رہے؟ مدت کی صحیح مقدار کیا ہے؟ وغیرہ۔ "قل ربی اعلم بعدتھم ما یعلمھم الا قلیل فلا تمار فیھم الا مراءً ظاھرًا ولا تستفت فیھم منھم احدا۔" (اے پیغمبر) کہدے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے۔" (اور جب صورتِ حال یہ ہے) تو لوگوں سے اس بارہ میں بحث و نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو اور نہ ان لوگوں میں سے

کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کرو (اسلئے کہ ان کی جوبات بھی ہوگی اٹکل سے ہوگی)

تاہم حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) نے یہ فرماتے ہوئے "کہ ان قلیل میں سے جن کو ان کی تعداد کا علم ہے ایک میں بھی ہوں" ارشاد فرمایا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تعداد کے متعلق پہلے دو مقولوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا "کہ یہ باتیں اٹکل کے تیر ہیں" مگر تیسرا قول ذکر کرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہیں کہی اس لئے یہی صحیح تعداد ہے۔ [1]

(۷) "ولبثوا فی کھفھم ثلثمائۃ سنین وازدادوا تسعا" اس آیت کا ترجمہ عام طور پر مفسرین نے اس طرح کیا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے یہ اطلاع دے رہا ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہم) سے بعض روایات میں جو معنی مذکور ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں ہے یعنی وہ آیت "ولبثوا الخ" کو اس سے قبل کے جملہ "یقولون" کے تحت میں داخل سمجھتے اور یہ معنی کرتے ہیں "کہ جس طرح لوگ (عیسائی) اصحابِ کہف کی تعداد کے متعلق مختلف باتیں کہتے ہیں اور کہیں گے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اصحابِ کہف تین سو نو سال تک غار میں رہے" چنانچہ قاضی شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر میں نقل فرماتے ہیں۔

اخرج ابن ابی حاتم وابن مردویہ	ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ۔۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے
عن ابن عباس. قال: ان الرجل	نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: آدمی آیت کی تفسیر کرتا ہے اور
لیفسر الایۃ ویری انھا کذلک فیھوی	یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے بالکل صحیح تفسیر کی ہے حالانکہ وہ اس
ابعد ما بین السماء والارض	میں فاش غلطی کرتا ہے گویا وہ اس آسمان وزمین سے بھی دور
ثم تلا "ولبثوا فی کھفھم" ثم قال	جا گرا۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ فرما کر بعد میں اس آیت کو تلاوت
کم لبث القوم؟ قالوا ثلث مائۃ و	کیا "ولبثوا فی کھفھم" اور فرمانے لگے لوگوں نے یہ سوال پیدا
تسع سنین. قال لوکانوا لبثوا	کیا کہ اصحابِ کہف کتنے عرصہ غار میں رہے اور خود ہی یہ کہنے لگے

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳۔

كذالك لم يقل الله	کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ
"قل الله اعلم بما لبثوا"	نے ارشاد فرمایا کہ اگر اصحابِ کہف واقعی اتنے عرصہ ہی
ولكنه حكى مقالة القوم	غار میں رہے ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا "قل الله اعلم
فقال "سيقولون ثلثة الى	بما لبثوا" آپ کہدیجئے اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنے عرصہ
قوله رجما بالغيب" فاخبر	مقیم رہے" دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ
انهم لا يعلمون ثم قال	نے لوگوں کے قول کو حکایت کیا ہے اور ان کی گفتگو کو یہاں
سيقولون" ولبثوا في	سے شروع کیا ہے "سیقولون ثلثۃ الیٰ قولہ رجما بالغیب"
كهفهم ثلاث مائة سنين	پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ وہ صحیح تعداد سے واقف نہیں
وازدادوا تسعا"	ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا دوسرا مقولہ یہ بیان
	کیا کہ وہ یہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے "ولبثوا فی کھفھم
؎۱	ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا"

اور ابن کثیرؒ نے تفسیر میں بروایت قتادہ عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ نقل کیا ہے۔

قال قتادة وفي قراءة عبد الله	قتادہ کہتے ہیں اور عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت[۳] میں یہ ہے
"وقالوا ولبثوا" يعني انه قال الناس	"وقالوا ولبثوا" یعنی یہ مقولہ لوگوں کا ہے، قتادہ اور
وهكذا قال قتادة ومطرف ؎۲	اور مطرف کی رائے بھی یہی ہے۔

ہمارے نزدیک بھی یہی معنی راجح ہیں کیونکہ قرآن کا سیاق اسی کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ ان ہی آیات میں قرآن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اس قسم کی غیر مفید اور اٹکل کی باتوں کے پیچھے نہ پڑیں پس جبکہ "ولبثوا فی کھفھم" (الایہ) کے بعد یہ کہا گیا کہ "اللہ اعلم بما لبثوا لہ غیب السموات والارض" تو اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ غار میں قیام کی مدت کا مسئلہ بھی اندھیرے کا

؎۱ فتح القدیر، سورۂ کہف۔ ؎۲ جلد ۳۔ ؎۳ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت سے یہ مراد ہے کہ وہ اس مقام پر بطور تفسیر کے یہ پڑھ دیا کرتے تھے۔ (مولف)

تیر ہے اور اس لئے صحیح طریق کار اس بارے میں بھی یہی ہے کہ اس کو علمِ الٰہی کے سپرد کر دیا جائے لہٰذا اس صورت میں یہ مقولہ اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جو زمانۂ نبوت میں اس واقعہ کی تفصیلات کے سلسلہ میں بے فائدہ انکل کے تیر چلاتے رہتے تھے۔

باایں ہمہ ابن کثیرؒ عام مفسرین کے معنی کو ہی راجح کہتے ہیں اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت کو منقطع اور ان کی قراءۃ کو شاذ ثابت کر کے اس کو ناقابلِ حجت قرار دیتے ہیں مگر حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی صحیح روایت کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ ابن کثیرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اول تین سو سال فرمایا اور یہ شمسی حساب کے مطابق ہے اور پھر "وازدادوا تسعاً" کہکر نو سال کا اور اضافہ اس لئے کیا تاکہ شمسی حساب، قمری حساب کے ساتھ مطابق ہو جائے مگر اول نظر میں با آسانی کہا جا سکتا ہے کہ آیت کی یہ تفسیر نہیں بلکہ تاویل ہے اس لئے کہ ایک طرف تو قرآن تذکیر و موعظت کے مقصد سے زائد تفصیلات کو دور از کار کہتا ہے اور دوسری جانب خود ہی ایسی باتوں کے درپے ہوتا ہے جس کا موعظت و بصیرت سے کوئی خاص تعلق نہیں بلکہ خالص علم ہیئت کا مسئلہ ہے[1]۔ ابنِ کثیرؒ کے نزدیک یہ مقولہ اس لئے بھی لوگوں کا نہیں ہو سکتا کہ نصاریٰ کے یہاں قیامِ کہف کی مدت تین سو سال مشہور ہے اور نو کا اُن کے یہاں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا مگر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ دوسرے مفسرین نے اُن کے دونوں قول نقل کئے ہیں۔ شاید ابنِ کثیر کی نظر سے دوسرا مقولہ نہیں گذرا۔

(۸) "وتری الشمس اذا طلعت تزاور عن کھفھم ذات الیمین (الی) ولملئت منھم رعبا" ان آیات میں قرآنِ عزیز نے اصحابِ کہف کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جبکہ وہ شروع میں غار کے اندر جا کر پوشیدہ ہوئے تھے اور یہ اس لئے کہ ان آیات کے متصل ہی جو آیات اس واقعہ پر روشنی ڈال رہی ہیں، اُن میں یہ باتیں مذکور ہیں، وہ نیند سے بیدار ہوئے اور انھوں نے ایک رفیق کو کھانا لانے کے لئے شہر بھیجا اس کی وجہ سے شہر والوں پر حقیقت حال ظاہر ہو گئی" جملہ معترضہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اس حقیقتِ حال کے منکشف کر دینے کی مصلحت بیان کی، وہ دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہو گئے اور اہلِ شہر نے اس غار کے دہانہ پر ہیکل تعمیر کر دیا، ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد ان آیات میں

[1] نیز لغۃً دونوں حساب بھی نو کا اضافہ تطابقِ حساب کیلئے کافی نہیں ہے۔

اس کیفیت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اصحابِ کہف پر نیند طاری ہونے کی حالت میں گذری یعنی اس غار کی اندر سے کیا حالت تھی، دھوپ اور تازہ ہوا پہنچنے نہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی ایک طویل مدت تک خواب کی حالت میں رہنے کی کیا شکل تھی۔ کیا ایک ہی کروٹ پر سویا کئے یا زندہ انسانوں کی طرح کروٹیں بدلتے رہتے تھے، ان کا کتا کس طرح وفاداری کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس مجموعی کیفیت کا اثر باہر سے جھانک کر دیکھنے والے انسان پر کیا پڑتا تھا؟

جمہور مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے اور آیات کے باہم نظم و ترتیب کے لحاظ سے یہ بہت صاف اور واضح تفسیر ہے مگر مولانا آزاد ان تمام آیات کو اصحابِ کہف کے دوبارہ غار میں عزلت گزین ہو جانے سے متعلق سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن یہ تفصیلات اس حالت کی بیان کر رہا ہے جب ان پر موت طاری ہو چکی تھی اور پھر انھوں نے "ایقاظ" میں یقظہ کے معنی زندگی اور "رقود" میں رقد کے معنی موت کے اختیار کر کے کافی تکلف کیا ہے اور بعض مقدمات کے اضافہ کے ساتھ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ چونکہ مفسرین نے ان آیات کو اصحابِ کہف کے پہلی مرتبہ غار میں پوشیدہ ہو جانے سے متعلق کہا ہے اس لئے ان کو آیات کی تفسیر میں حیرانی پیش آئی ہے مگر اس پوری تفصیل کے مطالعہ سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیات زیر بحث کی تفسیر میں مفسرین قدیم کو تو کوئی حیرانی پیش نہیں آئی البتہ خود مولانائے موصوف کو اپنی اختیار کردہ تفسیر کی وضاحت میں ضرور تکلفاتِ بارِدہ اختیار کرنے پڑے ہیں اور سچ پوچھئے تو اس مقام پر انکی تفسیر تاویل ہو کر رہ گئی ہے۔

(۹) "ذلك من اٰيات الله" یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

یعنی پہاڑ کے اندر غار کی یہ مجموعی کیفیت کہ غار کا دہانہ اگرچہ تنگ ہے مگر اس کے اندر بہت کافی وسعت ہے۔ اس کا جائے وقوع شمالاً و جنوباً ہے کہ جس کی وجہ سے طلوع و غروب دونوں حالتوں میں آفتاب غار کے سامنے سے داہنے اور بائیں کترا کر نکل جاتا ہے اور غار اس کی تپش سے محفوظ رہتا ہے اور دوسری جانب منفذ ہونے کی وجہ سے ہوا اور روشنی بقدرِ ضرورت پہنچتی رہتی ہے۔ گویا

جسمانی بقار کے لئے جو چیز مضر ہے یعنی تپش اس سے حفاظت اور جو بقارِ حیات کے لئے ضروری شے ہے یعنی روشنی اور ہوا اس کی موجودگی یہ ایسے امور ہیں جو خدائے تعالیٰ کی کھلی نشانیاں کہی جا سکتی ہیں کہ ان کی بدولت برسوں تک خدا کے نیک بندے دنیا کے علائق سے جدا ہو کر غار میں بحالتِ خواب بسر کر سکے اور ایسی حالت میں بسر کر سکے جبکہ سامانِ خورد و نوش اور بقارِ حیات کے دیگر وسائلِ دنیوی سے قطعاً محروم تھے۔

(۱۰) عام طور پر مشہور ہے کہ اصحابِ کہف ابھی تک غار میں سو رہے ہیں اور زندہ ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے بصراحت یہ فرمایا ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا۔

قال قتادة، غزا ابن عباسؓ مع حبیب بن مسلمة فمروا بالکھف فی بلاد الروم فرأوا فیہ عظاما فقال قائل ھذہ عظام اھل الکھف فقال ابن عباس لقد بلیت عظامھم من اکثر من ثلثمائة سنة (رواہ ابن جریر) [۱]	"قتادہ کہتے ہیں، ابنِ عباسؓ ایک مرتبہ حبیب بن مسلمہ کے ساتھ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے راہ میں بلادِ روم میں اس مقام پر گذر ہوا جہاں پہاڑی غاروں کا سلسلہ ہے وہاں انھوں نے کسی غار کے اندر انسانوں کی ہڈیاں یا ڈھانچے دیکھے تو کسی کہنے والے نے کہا، یہ اہلِ کہف کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں اس پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو تین سو سال سے بھی زیادہ ہوا کہ بوسیدہ ہو چکیں۔

(۱۱) قرآنِ عزیز اور صحیح روایات سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ اصحابِ کہف کے نام کیا تھے بلکہ قرآنِ عزیز نے تو مشرکینِ مکہ یا نبطی اور رومی عیسائیوں کے یہاں اس سلسلہ میں جو اٹکل کی باتیں مشہور تھیں ان پر اعتماد رکھنے اور ان کی تحقیقات میں پڑنے سے روکا ہے البتہ اسرائیلی روایات میں ان کے نام یہ بتائے گئے ہیں۔ مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، کسطونس، بیرونس، دنیموس، نطونس، اور ان کے کتے کا نام قطمیر یا حمران ہے۔ [۲]

(۱۲) "وکلبھم باسط ذراعیہ بالوصید" کتے نے وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا اور

[۱] یہ روایت بھی اس کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے [۲] تاریخ ابنِ کثیر ج ۲

صلحاء کی صحبت پائی تو قرآن نے بھی اس کا ذکر خیر کرکے اس کو وہ عزت بخشی کہ انسانوں کیلئے قابلِ رشک بنا دیا شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے کیا خوب کہا ہے۔

سگِ اصحابِ کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد
پسرِ نوح با بداں بہ نشست خاندانِ نبوتش گم شد

(۱۳) "ولا تقولن لشائی انی فاعل ذلك غدا الا ان یشاء اللہ" اور کسی چیز کے لئے تم یہ نہ کہو کہ کل میں اس کو ضرور کروں گا مگر (یہ کہہ لیا کرو) یہ کہ خدا چاہے تو"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب مستقبل میں کسی کام کا ارادہ ہو تو دعویٰ کے ساتھ یہ نہیں کہنا چاہئے کہ میں اس کو ضرور کروں گا اس لئے کہ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا اور کہنے والا اس کائنات میں موجود بھی ہوگا یا نہیں لہذا اس معاملہ کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے "انشاء اللہ" ضرور کہنا چاہئے۔

(۱۴) "وقل عسیٰ ان یھدین ربی لاقرب من ھذا رشدا" تم کہو امید ہے، میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دیگا"

اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ عنقریب ایسا ہی معاملہ تم کو بھی پیش آنے والا ہے بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب ہوگا یعنی اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑے گا۔ راہ میں غارِ ثور کے اندر کئی دن تک پوشیدہ رہوگے۔ دشمن غارِ ثور کے منہ پر پہنچ جانے کے باوجود تم کو نہ پا سکیں گے، تم بخیر وخوبی مدینہ پہنچ جاؤگے اور وہاں تم پر فتح وکامرانی کی ایسی راہیں کھول دی جائیں گی جو اس معاملہ سے کہیں زیادہ عظیم وجلیل ہوں گی۔ یہ سورت مکی عہد کی آخری سورتوں میں سے ہے اس لئے اس کے نزول کے بہت تھوڑے زمانہ بعد ہجرت کا وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کے دورِ حیات میں حیرت زا انقلاب پیدا کر دیا اور باطل نے حق کے سامنے سپر ڈال دی۔

(۱۵) "لنتخذن علیھم مسجدا" ہم ضرور ان کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے"

معلوم نہیں کہ اس کہنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ واقعی ان کے مرقد پر ہیکل بنا کر

اس کو سجدہ گاہِ عام وخاص بنائیں گے کیونکہ یہ خدا کے مقبول بندے تھے تو ان عیسائیوں کا یہ عمل اسلام کی نگاہ میں قابلِ مذمت ونفرت ہے اس لئے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے "لعن اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد" اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت بھیجے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد (سجدہ گاہ) بنا لیا تھا یعنی قبروں کو سجدہ کرتے تھے اور پھر ارشاد فرمایا "لا تتخذوا قبری عیدا" لوگو تم میری قبر کو عید کی طرح تہوار نہ بنا لینا"[1]

اور اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کی یادگار میں غار کے منہ پر ایک عبادتگاہ بنائیں گے کہ جس میں صرف خدائے عزوجل ہی کی عبادت ہوا کرے گی تو ان کا یہ فیصلہ بے شبہ محمود اور قابلِ ستائش تھا۔

نتائج وعبر (۱) اگر کوئی بات ہم کو اپنی عقل کے مطابق عجیب وغریب معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی واقعی کوئی عجیب بات ہے اور اگر وہ عجیب ہے بھی تو ہمارے لئے ہے نہ کہ خالقِ کائنات کے لئے جس نے کہ کائناتِ ہست وبود کو پیدا کیا اور پھر ایسے محکم نظام پر اس کو قائم کیا کہ عقل حیران ہے مگر آنکھ روزانہ اس کا مشاہدہ کرتی اور قلب ہر لمحہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ "وما ذلک علی اللہ بعزیز" خدائے تعالیٰ پر یہ بات کچھ بھاری نہیں ہے۔

(۲) جب شر وفساد اور ظلم وسرکشی اس درجہ بڑھ جائے کہ خدا کے نیک بندوں کے لئے کہیں پناہ نہ رہے تو اگرچہ عزیمت کا مرتبہ یہی ہے کہ کائنات کی رشد وہدایت کی خاطر ہمہ قسم کی تکالیف برداشت کرے اور کلمۂ حق پر کوہِ استقامت بنا رہے اور مخلوقِ خدا سے منقطع ہو کر عزلت وکنج نشینی اختیار نہ کرے لیکن اگر حالات اس درجہ نزاکت اختیار کر لیں کہ مخلوق کے ساتھ تعلق رکھنے کی شکل میں یا جان دینی پڑے اور یا دینِ باطل قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑے اور حالت یہ ہو جائے "انھم ان یظہروا علیکم یرجموکم او یعیدوکم فی ملتھم ولن تفلحوا اذا ابدا" تو اس وقت رخصت ہے کہ جان کی حفاظت اور دین کی صیانت کے لئے دنیا کے علائق سے کٹ کر عزلت نشینی اختیار کر لے۔

گویا یہ اضطراری حالت کا ایک ہنگامی اور وقتی علاج ہے جو صرف تحفظِ دین وایمان کے لئے

---

[1] رواہ الصحیحین

کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کی نگاہ میں یہ بذاتہ کوئی محبوب عمل نہیں ہے اور اختیاری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کرنا رہبانیت ہے "ولا رھبانیۃ فی الاسلام" اور اسلام رہبانیت کو ناپسند کرتا ہے۔

عیسائیوں کی مذہبی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی عہد میں بعض سچے عیسائیوں کو اصحاب کہف کی طرح کے چند واقعات پیش آئے جن میں سے ایک روم میں ایک فلسطین میں اور ایک شہر افسس میں پیش آنا بتایا جاتا ہے چنانچہ انھوں نے حالات سے مجبور ہو کر اضطراری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کیا تھا مگر بعد میں دوسری بدعات کی طرح یہ عمل بھی عیسائیت کا اہم جزء اور محبوب عمل شمار ہونے لگا اور جس طرح ہندوستان کے قدیم دھرم کے مطابق علائق دنیا سے کٹ کر ہندو جوگی پہاڑوں کی کھوہ اور ویرانوں میں یوگ کرنا مقدس عمل سمجھتے ہیں اسی طرح عیسائیوں نے بھی اختیاری رہبانیت کو مذہب کے مقدس اعمال میں شامل کر لیا۔

لیکن قرآنِ حکیم نے ان کے اس عمل کے متعلق صفائی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بذاتہ یہ عمل کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ اہلِ کتاب کی مذہبی بدعات میں سے ایک بدعت ہے "ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبنٰھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا" اور راہبانہ زندگی کو کہ جس کو ان (عیسائیوں) نے دین میں ایجاد کر لیا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر انھوں نے اختیار کیا تھا اللہ کی رضا جوئی کے لئے پر اس کے حق کی رعایت نہ رکھ سکے۔" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے یہ طریقہ دین کے طریقوں میں سے نہیں مقرر کیا تھا بلکہ انھوں نے خود ہی اختیار کر لیا تھا اور اگرچہ ابتداء میں انھوں نے یہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اختیار کیا تھا مگر بعد میں اس کو نباہ نہ سکے اور رہبانیت کے پردہ میں دنیا داروں سے زیادہ دنیا طلبی اور ہوسناکیوں میں مبتلا ہو گئے۔

حق یہ ہے کہ صاف اور سیدھی راہ اعتدال کی راہ ہے اس میں نہ پیچ و خم ہے اور نہ نشیب و فراز یہ راہ افراط اور تفریط دونوں سے جدا کر کے منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور چونکہ اسلام دینِ فطرۃ ہے اس لئے اس نے ہر معاملہ میں اعتدال ہی کو پسندیدہ عمل قرار دیا ہے اس کی نگاہ میں جس قدر دنیا میں انہماک بُرا ہے اسی قدر مخلوقِ خدا سے کٹ کر جوگیانہ رہبانیت بھی مذموم ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ارشاد فرمایا ہے کہ اس امت کے لئے رہبانیت "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔ کیونکہ میدانِ جہاد کے لئے انسان جب ہی قدم اٹھاتا ہے کہ وہ اپنے نفس، اپنے اہل و عیال، اور ہر قسم کے دنیوی علائق سے بے نیاز ہو کر صرف خدائے تعالیٰ کی مرضی کو پورا کرنا اپنا مقصد اور نصب العین بنالے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آیۃ "ولا تقولن لشایٔ انی فاعل ذلک غدا الا ان یشاء اللہ" کے شانِ نزول کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحابِ کہف کے بارہ میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں کل وحی سے معلوم کر کے اس کا جواب دوں گا مگر آپ کو "ان شاء اللہ" کہنا یاد نہ رہا اس وجہ سے تقریباً پندرہ روز وحی کا نزول نہیں ہوا تب مشرکین نے چہ میگوئیاں شروع کردیں اور آپ اس وجہ سے دلفگار ہونے لگے، پندرہ روز کے بعد وحی کا نزول ہوا اور اس نے واقعہ کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ انسان جبکہ فردا سے نا واقف ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جب کل کے لئے کسی بات کا وعدہ کرے تو خدا کی مشیت کا حوالہ ضرور دیدیا کرے تاکہ یہ بات کبھی فراموش نہ ہونے پائے کہ بندہ نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا، میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں اور اگر زندہ بھی رہا تو وعدہ کے ایفاء پر قادر ہو سکوں گا یا نہیں۔

(۴) دین اور ملت، خدائے تعالیٰ کی صاف اور سیدھی راہ کا نام ہے اس لئے وہ جبر و اکراہ سے قلب میں نہیں اترتی بلکہ اپنی صادق روشنی سے اندھے دلوں کو روشن اور منور کرتی ہے "لا اکراہ فی الدین دین کے بارہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔" مگر اس کے برعکس باطل کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ خدا کی مخلوق پر زبردستی، ظلم اور جبر سے اپنا اثر جمائے اور دلیل کی جگہ جبر سے کام لے لیکن خدا کی مشیت انجامِ کار صداقت (دینِ حق) کو غالب اور باطل کو مغلوب کر دیتی ہے اور انجام و نتیجہ حق ہی کے ہاتھ رہتا ہے مگر چونکہ خدا کی گرفت کا قانون اول کافی مہلت دیتا ہے اس لئے ظالم اقوام جہالت سے اس کو اپنی کامیابی سمجھ کر خدا کی بطشِ شدید سے غافل ہو جاتی ہیں اور اس لئے تاریخ بار بار اپنے سبق کو دہراتی رہتی ہے۔

(۵) تجربہ اس کا شاہد ہے کہ حق و صداقت کی تحریک اور نہ صرف یہ بلکہ ہر انقلابی تحریک جس درجہ

قوم کے نوجوانوں پر اثر انداز ہوتی ہے، عمر رسیدہ افرادِ قوم پر اس سرعت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتی۔ علم النفس (Psychology) کے ماہرین اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ معمر افراد کا دل و دماغ چونکہ عمر کے بڑے حصہ میں پرانی ریت و رسم کا عادی ہو جاتا اور گذشتہ نظامِ سوسائٹی سے عرصہ تک مانوس رہ چکا ہوتا ہے اور اس کے رگ و ریشہ میں قدیم اثرات راسخ ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے ہر وہ تحریک جو قدیم نظام یا فرسودہ رسوم کے خلاف ظاہر ہوتی ہے ان کا دل و دماغ اس کے جدید اثرات سے اذیت و تکلیف محسوس کرتا ہے اور جدید و قدیم محرکات کا تصادم ان کے لئے بارِ جان بن جاتا ہے اس لئے وہ جدید انقلاب سے مانوس ہونے کی بجائے اور زیادہ متوحش ہو جاتے ہیں البتہ ان میں سے جو دل و دماغ، جذبات کے مقابلہ میں عقل کو اور تاثرات کے مقابلہ میں دلائل کو راہ نما بنا لیتے اور ہر معاملہ میں جدت و قدامت سے قطع نظر متانت و سنجیدگی کے ساتھ اس کی افادیت و مضرت پر غور کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اس عام اصول سے مستثنیٰ ہیں اور جب وہ انقلابی تحریک کے فوائد کو دلائل کی قوت سے محسوس کر لیتے ہیں تو اس تحریک کے لئے زبردست پشت پناہ ثابت ہوتے ہیں مگر جماعتوں اور قوموں میں عموماً ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔

لیکن عمر رسیدہ افراد کے برعکس چونکہ نوجوانوں کے دل و دماغ بڑی حد تک غیر جانبدار ہوتے اور پرانے رسم و رواج کے لئے ابھی تک راسخ نہیں ہوتے اس لئے ان پر جدید نقوش بہت جلد منتقش ہو جاتے ہیں اور وہ کسی تبدیلی اور کسی انقلاب کو محض اس لئے کہ وہ جدید محرکات کے داعی ہیں توحش کی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے اور صاف دل و دماغ سے اس پر غور کرتے ہیں۔

اب یہ انقلابی تحریک کی ذمہ داری ہے کہ اگر اس میں صداقت اور حقانیت کارفرما ہے اور جماعتوں اور قوموں کو غلط روی سے نکال کر صراطِ مستقیم کی جانب داعی ہے تو اس کی جانب سرعت کے ساتھ جوق جوق بڑھنے والوں اور پیروی کرنے والوں کی زندگی میں چار چاند لگ جاتے اور ان کا وجود کائناتِ ہست و بود کے لئے رحمت ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو وہ ان

تروتازہ اور صاف دل ودماغ رکھنے والے نوجوانوں کو تباہی اور بربادی کی راہ پر لگا دیتی ہے اور ان کا وجود دنیائے انسانی کے لئے مصیبت اور عذاب بن جاتا ہے۔

پس قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کے اظہار میں عبرت وموعظت کے جو پہلو نمایاں کئے ہیں ان میں سے ایک اہم پہلو اسی نفسیاتی مسئلہ کی جانب توجہ دلانا ہے۔

وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ قریش مکہ میں سے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کی اکثریت کا اسلام کی مقدس تعلیم سے گریز اور انفرادی واجتماعی حیات انسانی کے اس جدید انقلاب (اسلام) سے توحش اور ان کے نوجوانوں کی اکثریت کا اس کی جانب تیزی کے ساتھ متوجہ ہونا اور اس کی دعوتِ انقلاب کی کشش سے فوج در فوج اس کے لئے حلقہ بگوش ہوجانا دنیا کا انوکھا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ جب کبھی بھی فرسودہ نظام اور باطل رسم ورواج کے خلاف خدا کے پیغمبروں نے حق وصداقت کا انقلاب برپا کیا ہے تو قبولِ حق کے لئے عمر رسیدہ انسانوں سے زیادہ نوجوانوں کے دل ودماغ پر ہی اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔

سبا اور سیلِ عرم

سنہ ۲۰۰ء (تخمیناً)

تمہید۔ سبا۔ نام یا لقب۔ زمانۂ حکومت۔ سبا اور طبقاتِ حکومت۔ مکاربِ سبا اور ملوکِ سبا۔ وسعتِ حکومت۔ طرزِ حکومت۔ سبا کی عمارات۔ سبا کا تمدن۔ سدِ مارب جنتانِ عن یمین وشمال۔ سیلِ عرم۔ چند تاریخی مباحث۔ تفسیری مطالب۔ نتائج وبصائر۔

تمہید سبا اور سیلِ عرم کا واقعہ بھی تاریخی واقعات میں بہت اہمیت رکھتا اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں صد ہزار سامانِ عبرت وموعظت مہیا کرتا ہے۔

قوموں کے عروج وزوال کا پس منظر بخت واتفاق کا رہینِ منت نہیں ہوتا بلکہ قانونِ قدرت کے مقررہ اصول کے مطابق پیش آتا ہے۔ البتہ کبھی اسبابِ عروج وزوال ایسے واضح اور صاف ہوتے ہیں کہ عام طریقہ سے یا مشاہدہ میں آجاتے ہیں اور یا عقل کے سرسری توجہ سے پہچان لئے جاتے ہیں اور کبھی ان کا وجود ایسے اسباب پر مبنی ہوتا ہے جن کا تعلق عام اسباب ووسائل سے جدا خدائے تعالیٰ کی فرمانبرداری اور نافرمانی سے وابستہ ہوتا ہے یعنی باسبابِ ظاہر اگرچہ ایک قوم میں مثلاً وہ تمام حالات واسباب پائے جاتے ہوں جن سے کسی قوم کو عروج حاصل ہوتا ہے تاہم وہ قوم اچانک ہلاکت وبربادی کی نذر ہوجاتی اور عالم انسانی کے لئے اس کی ہلاکت حیرت زا واقعہ بنجاتی ہے لیکن جب خدا کی جانب سے ان کی سرکشی، بغاوت اور احکامِ الٰہی کی پیہم خلاف ورزی کا پردہ چاک ہوجاتا ہے اور وحی الٰہی ان کے عمل اور پاداشِ عمل کی تفصیلات کو برسرِ عام لے آتی ہے تب اہلِ دانش یہ یقین کرلیتے ہیں کہ جس قوم کی اجتماعی زندگی کے خوبصورت خول میں ایسی مکروہ اور گھناؤنی شکل موجود تھی تو بلاشبہ اس کی ہلاکت وتباہی بخت واتفاق کی وجہ سے نہیں بلکہ نوامیسِ الٰہی کے "قانون پاداشِ عمل" کے عین مطابق ہوئی ہے۔

سبا اور قومِ سبا کا وہ عبرتناک سانحہ اور ان کے عروج و زوال کا وہ بصیرت افروز واقعہ جو سطورِ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے قوموں کے عروج و زوال کے اس دوسرے قانون کے ہی زیرِ اثر عالمِ وجود میں آیا تھا اور تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جو قوم خوش عیشی اور رفاہیت کے اونچے درجہ پر بے خوف و خطر زندگی بسر کر رہی تھی وہ یکلخت ہلاکت و بربادی کے قعرِ مذلت میں محض اتفاقِ وقت سے نہیں گر گئی تھی بلکہ اپنے دوررس اعمالِ بد کی پاداش میں اس کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا تھا۔

پس مناسب یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے ان حقائق کو جس انداز میں بیان کر کے سامانِ موعظت و بصیرت عطا کیا ہے تاریخ کی بے لوث شہادت سے ان کی تفاصیل کو نقل کر دیا جائے تاکہ صداقتِ قرآن کا یہ پہلو بھی منکرینِ قرآن کے حق میں حجتِ کاملہ بن سکے۔

سبا؟ سبا، قحطانی قبائل کی مشہور شاخ ہے، مورخینِ عرب اس کا نسب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔

مگر توراۃ میں یہ کہا گیا ہے کہ سبا، قحطان کا بیٹا ہے۔

اور یقطان (قحطان) سے الموداد، سلف، حصار، مادت، ارخ، ہدورام، اوزال، دقلاہ، عوبل، ابی مائل، سباہ، حضارموت، اوفیر، حویلہ، یارح (یعرب)، اور یوباب پیدا ہوئے۔ یہ سب بنی یقطان تھے اور ان کے مکان میسا سے سفار کی راہ میں اور پورب کے پہاڑ تک تھے [۱]

قحطان کو یقطان، یقطون، یقطین، اور یقطن بھی کہا جاتا ہے۔ [۲]

زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ عربی میں قحطان اور عبرانی و سریانی میں یقطان اور یقطن کہتے ہیں [۳]

مورخینِ جدید توراۃ کے بیان کو صحیح سمجھتے ہیں اس لئے کہ قحطان کی اولاد سے متعلق جو تفصیلات اس نے دی ہیں وہ تاریخی اقوال اور اثری و حجری کتبات سے مطابقت رکھتی ہیں، جدید مورخین کی اس تحقیق کے علاوہ یوں بھی ایسے معاملات میں توراۃ کا بیان دوسری روایاتِ تاریخی کے مقابلہ میں زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

---

[۱] پیدائش باب ۱۰ آیات ۳۰-۲۶۔ [۲] و [۳] الانباہ فی قبائل الرواہ لابن عبد البر

غرض سبا بروایتِ توراۃ، قحطان کا بیٹا تھا اور بروایتِ عرب قحطان کا پوتا اور یعرب بروایتِ توراۃ، سبا کا بھائی تھا اور بروایتِ عرب قحطان کا بیٹا۔

اہل نسب و تاریخ کا اس پر تو اتفاق ہے کہ قحطان، امم سامیہ کی شاخ ہے لیکن اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ عرب عاربہ میں سے ہے یا عربِ مستعربہ میں سے یعنی وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہی اور عدنانی و قحطانی ایک ہی سلسلہ ہے یا عدنانی تو بنی اسمٰعیل ہیں اور قحطانی اس سلسلہ سے الگ قدیم سلسلہ

بعض مورخینِ عرب کا رجحان یہ ہے کہ قحطانی بھی بنو اسمٰعیل ہی ہیں اور تمام اقطاعِ عرب بنی اسمٰعیل کے علاوہ اور کسی نسل سے نہیں ہیں چنانچہ علماءِ انساب میں سے زبیر بن بکار اور محمد بن اسحٰق کی یہی رائے ہے[۵۱]۔ اور امام بخاری بھی اسی جانب مائل ہیں اسی لئے کہ انھوں نے بخاری میں ایک باب تحریر کیا ہے "باب نسبۃ الیمن الیٰ اسمٰعیل علیہ السلام"

اور اس باب کے تحت ایک حدیث نقل کی ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنی اسلم جو خزاعہ کی شاخ ہیں ان کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنی اسمٰعیل فرمایا ہے اور خزاعہ بنی ازد کی شاخ ہیں اور بنی اُزد باتفاق قحطانی ہیں لہٰذا قحطانی بھی بنی اسمٰعیل ہی میں سے ہوئے وہ حدیث یہ ہے

خرج رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم علی قوم من اسلم یتناضلون بالسوق فقال ارموا بنی اسمٰعیل فان اباکم کان رامیاً[۵۲]	ایک مرتبہ بنی اسلم کی ایک جماعت پر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا گذر ہوا دیکھا تو وہ بازار میں تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا ہاں۔ اے اولادِ اسمٰعیل اخوب تیر اندازی کرو اس لئے کہ تمہارے باپ اسمٰعیل بھی تیر انداز تھے۔"

اور کتاب احادیث الانبیاء میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قصہ میں حضرت ہاجرہؑ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔

تلک امکم یا بنی ماء السماء	اے عرب! یہ (ہاجرہ) تمہاری ماں ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس جملہ کی شرح میں یہ کہا ہے

---

[۵۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۶۔ [۵۲] باب المناقب "اسلم" سے وہ قبیلہ مراد ہے جو انصار کی شاخ ہے۔

کہ حضرت ابوہریرہؓ نے "بنی ماء السماء" کہکر اہلِ عرب کو اس لئے خطاب فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے مویشیوں کی خاطر ایسے مقامات پر خیمے لگاتے پھرتے تھے جہاں بارش کا پانی جمع ہو گیا ہو یا مارِ سماء سے زمزم مراد ہے اور ان ہر دو معنی کے لحاظ سے یہ جملہ ان لوگوں کے لئے دلیل بن سکتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تمام عرب بنی اسمٰعیل ہیں۔

اور بعض اس جملہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اہلِ عرب کی شرافتِ نسب اور نجابتِ حسب کے لئے بطور تشبیہ کے بولا گیا ہے کہ جس طرح آسمان سے نازل پانی صاف اور بے عیب ہوتا ہے اسی طرح اہلِ عرب بھی حسب و نسب میں بے عیب ہیں۔ پس اگر یہ معنی مراد ہیں تو اس صورت میں یہ جملہ ان حضرات کے لئے دلیل نہیں بن سکتا۔

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

اور عنقریب اس مسئلہ کی مزید تفاصیل انشاء اللہ تعالیٰ اوائل مناقب میں آئیں گی [1]

اور اس مقام پر پہنچ کر پہلے قول کو تسلیم نہیں کرتے اور آخر قول ہی کو صحیح مانتے ہیں جیسا کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

اور محققین کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام عرب کے انساب کا منبع دو ہیں۔ عدنان اور قحطان، عدنان بنی اسمٰعیل اور عرب مستعربہ ہیں اور قحطان عرب عاربہ، گویا ان کے نزدیک قحطانی، بنی اسمٰعیل نہیں ہیں چنانچہ ہمدانیؒ، ابن عبد البرؒ، ابنِ کثیرؒ، ابنِ حجر عسقلانی، ابن کلبی اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اسی کے قائل ہیں

قال هشام ومن زعم ان قحطان ليس من ولد اسمعيل فانه يقول قحطان هو يقطون بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح۔ قال ابو عمر هكذا قال ابن الكلبي في العرب العاربة و	ہشام کہتے ہیں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قحطان بنی اسمٰعیل میں سے نہیں ہیں تو وہ اس کا نسب نامہ یہ بیان کرتے ہیں قحطان (یقطون) بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح۔ ابو عمر (ابن عبد البر) کہتے ہیں کہ ابن کلبی نے بھی عرب عاربہ کی تفصیل کرتے ہوئے اسی طرح بیان کیا ہے

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۳۰۴ باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا۔

رأیت بخط ابی جعفر العقیلی قال نا محمد بن اسمٰعیل قال نا سلام بن مسکین قال نا عون بن ربیعہ عن یزید الفارسی عن ابن عباسؓ قال العرب العاربۃ قحطان بن الہمیسع والامداد السالفات وحضرموت وھذا حدیث حسن الاسناد وھو اعلیٰ ما رویٰ فی ھذا الباب واولیٰ بالصواب[51]

اور میں نے ابوجعفر عقیلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ روایت دیکھی ہے کہ انہوں نے محمد بن اسمٰعیل سے بسلسلۂ سند یہ سنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے تھے کہ قحطان بن الہمیسع اور امداد اور سالفات اور حضرموت یہ سب عرب عاربہ ہیں۔ اور اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس مسئلہ میں یہ قول بلحاظ روایت بھی اعلیٰ درجہ کا ہے اور قرینِ صواب بھی ہے۔

بلکہ ابن کثیرؒ تو یہ کہتے ہیں کہ جمہور کی یہی رائے ہے۔

لکن الجمھور علی ان العرب القحطانیۃ من عرب الیمن وغیرھم لیسوا من سلالۃ اسمٰعیل وعندھم ان جمیع العرب ینقسمون الی قسمین قحطانیۃ وعدنانیۃ الخ[52]

لیکن جمہور کی تحقیق یہ ہے کہ قحطانی عرب خواہ وہ یمنی ہوں یا غیر یمنی حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے نہیں ہیں اور ان کے نزدیک تمام عرب دو اصل پر تقسیم ہیں، قحطانی اور عدنانی۔

اور جمہور کی جانب سے "بنی اسلم" سے متعلق حدیث کا حافظ ابن حجرؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ جو قبائل بھی قحطان کی جانب منسوب ہیں وہ سب بنی اسمٰعیل ہیں اس لئے کہ بعض قحطانی قبائل وہ ہیں جن کے متعلق علماء انساب میں سخت اختلاف ہے کہ وہ قحطانی ہیں یا عدنانی مثلاً بنی خزاعہ کے بارہ میں یہی بحث ہے تو یہ ممکن ہے کہ بنی اسلم کے متعلق بھی اسی قسم کا اختلاف موجود ہو (چنانچہ موجود ہے) اور ابن عبدالبرؒ نے اسی حدیث کو بروایتِ صحیح نقل کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ بنو خزاعہ اور بنو اسلم دونوں تیراندازی کر رہے تھے تو یہ ہو سکتا ہے کہ خزاعہ کی اکثریت کی وجہ سے آپ نے تغلیباً ایسا فرما دیا ہو۔[53]

لیکن ان جوابات کے علاوہ حافظ ابنِ حجرؒ نے انسابِ عرب کے مشہور عالم ہمدانی سے یہ نقل کیا ہے

---

[51] الانباہ علی قبائل الرواۃ ص ۵۸ - ۵۷۔ [52] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۶۔ [53] فتح الباری ج ۶ ص ۴۲۰۔

کہ یمن کی حکومت کے زوال کے بعد جو قحطانی قبائل حجاز میں آکر بس گئے تھے ان کے اور عدنانی قبائل کے درمیان ازدواجی رشتے بکثرت ہونے لگے تھے۔ اس لئے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بہ سبیلِ توسع ایسا ارشاد فرمادیا یعنی پدری سلسلہ کی بجائے مادری سلسلہ سے ان کو بنی اسمٰعیل فرمایا ہے

ہمدانی کا یہ جواب تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یمن سے نکلنے کے بعد قحطانی اور عدنانی قبائل کے مابین ازدواجی رشتے نے ہی یہ صورت پیدا کردی ہے کہ بعض اہلِ نسب مشہور قحطانی قبائل کو عدنانی اور عدنانی کو قحطانی کہتے نظر آتے ہیں مثلاً انصار (اوس و خزرج) کے متعلق تمام محققین علم الانساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں مگر اسی ازدواجی رشتہ سے کبھی بہ سبیل توسع ان کو عدنانی بھی کہدیا جاتا ہے اور اس سے بعض مورخین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ عدنانی ہیں چنانچہ ابنِ عبدالبر کہتے ہیں۔

فاول ذلک الازد وھی جرثومۃ من جراثیم قحطان۔ ۔ ۔ وافترقت الازد وفیما ذکر ابن عبدہ وغیرہ من علماء الانساب علی نحو سبع وعشرین قبیلۃ فمنھم الانصار۔	قبائل یمن میں سے پہلا قبیلہ اَزْد ہے اور قحطانی سلسلہ کی شاخ ہے اور ابن عبدہ وغیرہ علماء انساب کے اقوال کے مطابق ازد کی تقریباً ستائیس شاخیں ہیں پس ان ہی میں سے انصار (اوس وخزرج) بھی ہیں۔"
قال ابن اسحاق امھما قیلۃ ا نبتہ کاھل بن عذرۃ من قضاعۃ کانت تحت حارثۃ بن ثعلبہ۔ ؎۵۲	"ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ اوس وخزرج کی والدہ قیلہ بنت کاہل بن عذرہ، بنی قضاعہ میں سے تھی جو حارثہ بن ثعلبہ (قحطانی) کے نکاح میں آئی۔
وروی عن عمر بن الخطاب وعبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) ان قضاعۃ بن معد (بن عدنان) ؎۵۳	حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے کہ قضاعہ بن معد (بن عدنان) کی نسل سے ہیں۔

اسی طرح مصنف ارض القرآن کا وہ قول بھی درست ہے جو انھوں نے اس سلسلہ میں بیان

؎۵۱ الانباہ ص ۱۰۶ ؎۵۲ ایضاً ص ۱۰۹ - ؎۵۳ ایضاً ص ۶۳۔

گیا ہے کہ بعض علماء انساب و حدیث خود قحطان کو اسمٰعیلی کیوں کہتے ہیں" وہ فرماتے ہیں۔

اس مبالغہ میں اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض قحطانی شاخیں سمٰعیلی ہیں اور یمن میں سکونت کے باعث یا کسی اور سبب سے ان کو قحطانی فرض کر لیا گیا ہے۔[1]

ایک جانب بعض عدنانی قبائل کا یمن میں مقیم ہو جانا اور دوسری جانب سبا کے انتشار سے بعض قحطانی قبائل کا حجاز، شام، عراق، نجد، بحرین میں جا کر وطن بنا لینا اور عدنانی قبائل کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کر لینا یہ وہ امور ہیں جن کی وجہ سے بعض قبائل کے متعلق قحطانی اور عدنانی ہونے میں اختلاف پیدا ہو گیا البتہ اہل عرب کو خود قحطان کے متعلق اسمٰعیلی ہونے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس کے جواب میں ہم مصنف ارض القرآن سے متفق نہیں ہیں کیونکہ جو اہلِ نسب اور علماء حدیث قحطان کو بنی اسمٰعیل میں سے سمجھتے ہیں وہ یہ بات اس الجھاؤ کی وجہ سے ہرگز نہیں کہتے کہ بعض عدنانی قبائل یمن میں بس جانے کی وجہ سے قحطانی کہلانے لگے جیسا کہ سید صاحب کا خیال ہے بلکہ یہ تو ایک مستقل نظریہ ہے جو بعض علماء نسب و حدیث کے درمیان اس لئے مقبول ہے کہ ان کے نزدیک تمام عرب صرف حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں اور ان کے نزدیک عرب مستعربہ کے علاوہ عربِ بائدہ اور عرب عاربہ کی کوئی شاخ عرب میں باقی ہی نہیں رہی۔

حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کا حجاز، کعبۃ اللہ اور حرم کے ساتھ جو تعلق ہے اس کی عظمت اور اکثر قبائلِ عرب کے ابو القبائل ہونے کا جو علاقہ ہے اس کی اہمیت یہ دو اہم باتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے غالباً بعض قحطانی قبائل نے بھی خود کو عدنانی کہنا شروع کر دیا خصوصاً مقیم حجاز قبائل نے اس کو زیادہ نمایاں کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ جو قبائل خود کو اس پردہ میں نہیں چھپا سکتے تھے انھوں نے اس سے بڑھ کر ایک اور قدم اٹھایا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ خود قحطان بھی اسمٰعیلی ہے تاکہ عدنانی اور قحطانی کا یہ فرق باقی ہی نہ رہے جو ایک کے اسمٰعیلی اور دوسرے کے غیر اسمٰعیلی ہونے سے باہمی امتیاز و شرف کا سبب بنتا تھا۔ اور اسی بناء پر علماءِ انساب کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی بن گیا اور علماءِ حدیث میں سے بعض محدثین نے غالباً اس لئے اس نظریہ کی تائید کی کہ ان کے سامنے چند ایسی صحیح روایات تھیں

[1] ج ا ص ۲۷۷

جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید کل عرب بنی اسمٰعیل ہی ہیں مثلاً حدیث کا یہ جملہ "تلك امكم یا بنی ماء السماء" میں ایک قسم کا عموم پایا جاتا ہے یا مثلاً بعض ایسے قبائل کے متعلق کہ جن کو قحطانی سمجھا جاتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے لیے "بنی اسمٰعیل" فرمانا۔ مگر ان محدثین کا یہ خیال صحیح نہیں ہے جیسا کہ ہم حافظ ابن حجرؒ ابن عبد البرؒ ابن کثیرؒ بلکہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے مقالات سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ روایات کے ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھتے ہیں بلکہ ابن عبد البرؒ نے اس مسئلہ کو صاف کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس دعویٰ کے ثبوت میں بعض مرفوع احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں جرہم، سلف اور ثقیف کو مستثنیٰ کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "العرب کلها من ولد اسمٰعیل"[1] تو معلوم رہے کہ یہ اور اس قسم کی تمام روایات ناقابلِ اعتماد و ناقابلِ حجت ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ان کی نسبت غلط ہے اور ابن عبد البرؒ کے اس قول سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

قال ابو عمر اکثر الاختلاف المذکور فی	ابو عمر (ابن عبد البر) کہتا ہے کہ ہماری اس کتاب میں
کتابنا هذا او فی غیره من اهل النسب	اور اس کے علاوہ نسب کی دوسری کتابوں میں
تولد من اختلافهم فی نسبة جمیع العرب	قبائل کے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس نظریہ
الی اسمعیل بن ابراهیم (علیهما السلام)	کی بدولت پیدا ہوا ہے کہ تمام عرب اسمٰعیل بن ابراہیم
علی ما قدمنا ذکره فی کتابنا فی هذا باب	(علیہما السلام) کی اولاد ہیں جیسا کہ ہم اسی کتاب میں
قحطان وغیره[2]	قحطان اور بعض دوسرے ناموں کے تحت ذکر کر آئے ہیں

اور ابنِ کثیرؒ کے اس قول سے بھی۔

قیل ان جمیع العرب ینتسبون الی اسمعیل	کہا جاتا ہے کہ تمام عرب حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم
بن ابراهیم علیهما السلام والتحیة والاکرام	علیہما الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے ہیں اور صحیح اور
والصحیح المشهور ان العرب العاربة قبل	مشہور قول یہ ہے کہ عرب عاربہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

[1] الانباہ ص ۹۲ "وہی آثار کلہا ضعیفۃ الاسناد" [2] الانباہ ص ۱۰۶۔

اسماعیل وقد قدمنا ان العرب العاربۃ منھم عاد و ثمود وطسم وجدیس وامیم وجرھم والعمالیق وامم اخرون لا یعلمھم الا اللہ کانوا قبل الخلیل علیہ الصلوۃ والسلام وفی زمانہ ایضاً [۱]

سے پہلے سے عرب کے ساکن ہیں اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ عاد، ثمود، طسم، جدیس، امیم، جرہم اور عمالیق اور ان کے علاوہ اور قبائل جن کا حال صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے سے تھے اور ان کے زمانہ میں عرب میں ان کی نسلیں پائی گئی ہیں۔

پس حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کے اس ارشاد کے متعلق جو انھوں نے اہلِ عرب کو مخاطب کرتے ہوئے حضرتِ ہاجرہ (رضی اللہ عنہا) کے سلسلہ میں فرمایا یعنی "تلک امکم یا بنی ماء السماء" بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یا تو انھوں نے عدنانی قبائل کی اکثریت کے پیشِ نظر جو حجاز میں آباد تھی تغلیباً یہ فرمایا اور یا اس لئے فرمایا کہ عرب کے قحطانی قبائل ہوں یا عدنانی پدری یا مادری کسی نہ کسی سلسلہ سے بنی ہاجرہ ضرور ہیں۔

اس کے برعکس اگر حضرت ابوہریرہؓ کے اس مقولہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ تمام عرب پدری سلسلہ سے حقیقۃً بنی ہاجرہ (بنی آسمٰعیل) ہیں تو یہ واقعہ کے بھی خلاف ہوگا اور ان صحیح روایات کے بھی مخالف رہے گا جن سے یہ ثابت ہے کہ عرب کے قبائل کا سلسلۂ نسب قحطانی اور عدنانی قبائل کے علاوہ بنی جرہم اور بعض دوسرے ان قبائل سے بھی تعلق رکھتا ہے جو عرب عاربہ کہلاتے تھے اور توراۃ اور مورخین تو اس کے متعدد سلسلے بیان کرتے ہیں۔

نام یا لقب سبا نام ہے یا لقب؟ یہ بھی ایک سوال ہے جو اس جگہ زیرِ بحث آتا ہے، توراۃ کہتی ہے کہ یہ نام ہے اور مورخینِ عرب کہتے ہیں کہ سبا لقب ہے اور نام عمرو یا عبد شمس ہے [۲]۔ عصرِ حاضر کے اہلِ تاریخ اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ پھر عرب کے اہلِ تاریخ سبا کا وجہ لقب یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لفظ "سبار" بمعنی قید" سے ماخوذ ہے چونکہ اس نے عرب میں سب سے پہلے جنگی قیدیوں کا طریقہ رائج کیا اور ان کو غلام بنایا اس لئے سبا لقب پایا۔ اور جدید مورخین کہتے ہیں کہ یہ "س، ب، الف مع ہمزہ کا

[۱] ابن اثیر ج ۲ ص ۱۵۶۔ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸ و تفسیر ابن کثیر ج ۳

مرکب" ایسے لفظ سے ماخوذ ہے جس کے مفہوم میں تجارت کے معنی داخل ہیں اور سبا اور قومِ سبا چونکہ تاجر پیشہ قوم تھی اس لئے سبا کے نام سے مشہور ہوئی چنانچہ آج بھی لغت عرب میں یہ لفظ شراب کی تجارت کے لئے بولا جاتا ہے" سبا الخمر۔ شراھا لیشربھا وسبیٰ سباءً الخمر۔ حملھا من بلدٍ الی بلدٍ[1] ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کا لقب" الرائش" بھی تھا۔ لغت میں ریش یا ریاش کے معنی مال کے آتے ہیں، یہ چونکہ بہت بڑا فاتح اور سخی تھا اور لوگوں کو کثرت سے مال ومتاع دیتا رہتا تھا اس لئے اس لقب سے بھی مشہور ہوا۔

زمانۂ حکومت | عام مورخین یہ کہتے ہیں کہ سبا نے چار سو چوبیس برس حکومت کی۔[2] مگر جدید فلسفۂ تاریخ کے لحاظ سے اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ یہ خاندانِ سبا کی مدتِ حکومت بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ اس جگہ صحیح نظر نہیں آتا اس لئے کہ اگر قحطان کی تیسری پشت سے اس مدت کو شروع کیا جائے تو یہ تقریباً ۲۵۰۰ ق م ہو سکتی ہے۔ اس حساب سے سبا کی حکومت کو ۲۰۰۰ ق م ختم ہو جانا چاہیے حالانکہ ہم حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں توراۃ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ۹۵۰ ق م میں ملکۂ سبا" بلقیس" نے حاضرِ خدمت ہو کر سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے اور بہت سے تحفے پیش کئے ہیں اور جیسا کہ سورۂ نمل میں ملکۂ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ زمانہ سبا کی حکومت کا زمانۂ عروج ہے چنانچہ زبور میں حضرت داؤد (علیہ السلام) کی یہ دعا، مذکور ہے۔

> اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا۔ . . . . ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں گذرانیں گے اور . . . وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اسے دیا جائے گا اس کے حق میں سدا دعا ہوگی"[3]

حضرت داؤدؑ کی یہ دعا مقبول ہوئی اور ۹۵۰ ق م میں ان کے صاحبزادہ حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں ملکۂ سبا نے حاضر ہو کر بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہرات پیش کئے۔

---

[1] اقرب الموارد۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲۔ [3] زبور ۷۲۔

لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو سبا کی عمر کے متعلق مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور یا اس سے سبا کے پورے دورِ حکومت کی مدت نہیں بیان کی گئی بلکہ ان کی حکومت کے دوسرے دور یعنی ملوکِ سبا کی مدتِ حکومت مراد ہے جو کم و بیش چار سو چھتیس سال ہے[1]۔

سبا اور طبقاتِ حکومت

مورخین کہتے ہیں کہ سبا کے دو بیٹے تھے ایک حمیر اور دوسرا کہلان اور تمام قحطانی قبائل ان ہی دو سلسلوں سے وابستہ ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عدنانی (اسمٰعیلی) قبائل جو نابت اور قیدار کی اولاد ہیں ان کا اصلی وطن شمالی عرب ہے اور قحطانی قبائل کا مسکن جنوبی عرب (یمن) ہے۔

اور عام اہلِ نسب جب حکومتِ سبا کا ذکر کرتے ہیں تو وہ حمیر کو براہِ راست سبا کا جانشین کہدیتے ہیں اور تمام سلسلۂ حکومت کو حمیری حکومت ہی سے یاد کرتے ہیں اور سبا کی حکومت کو مستقل حیثیت نہیں دیتے حالانکہ تاریخی حیثیت سے یہ نظریہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ سبا و یمن کے دورِ حکومت سے متعلق جو کتبات اثری اور حفری ذرائع سے برآمد ہو رہے ہیں نیز یونانی اور رومی معاصرِ سبا مورخین کی جو تاریخی شہادتیں ہیں ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سبا کی حکومت دو طبقات میں منقسم رہی ہے اور پھر ہر دو طبقات کا زمانۂ حکومت جدا جدا دو دوروں میں تقسیم ہے۔

طبقۂ اولیٰ کا پہلا دور تقریباً سنہ ۱۱۰۰ ق م سے شروع ہو کر سنہ ۵۵۰ ق م پر ختم ہوتا ہے کیونکہ بلحاظ کتبات سب سے پہلے حکومتِ سبا کا ذکر زبور سنہ ۹۵۰ ق م میں ہوا ہے اور یہ ان کے عروج کا زمانہ قیاس کیا گیا ہے اس دور میں شاہانِ سبا کا لقب "مکارب سبا" نظر آتا ہے اور سلیمان (علیہ السلام) کے زمانہ کی ملکۂ سبا (بلقیس) اسی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اور طبقۂ اولیٰ کا دوسرا دور سنہ ۶۵۰ ق م سے شروع ہو کر سنہ ۱۱۵ ق م پر ختم ہوتا ہے جیسا کہ علم الآثار سے ثابت ہو چکا ہے۔ اور "سیلِ عَرِم" اور "سبا کا انتشار" اسی دور سے متعلق ہے اس دور کے بادشاہ "ملوکِ سبا" کہلاتے ہیں۔

اور طبقۂ ثانیہ کا پہلا دور سنہ ۱۱۵ ق م سے شروع ہو کر اواخر سنہ ۳ء پر ختم ہو جاتا ہے یہ بادشاہ "ملکِ سبا و ریدان" اور "ملوکِ حمیر" کہے جاتے ہیں ریدان اُن کے مشہور قلعہ کا نام ہے اور سبا اور حمیر قومیت

[1] ارض القرآن۔

کو ظاہر کرتا ہے۔ حمیری سنہ اگرچہ غیر معروف رہا ہے لیکن ان کے ایک کتبہ میں حبشہ کے حملۂ یمن اور ذونواس کی موت کا تذکرہ ہے، چونکہ یہ واقعہ عرب اور رومی تاریخی روایات کے مطابق ۵۲۵ء میں پیش آیا ہے اور کتبہ میں ۶۴۰ حمیری درج ہے۔ لہٰذا اس کو پیشِ نظر رکھکر سنہ حمیری کی ابتدا ۱۱۵ ق م سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس دور میں سبا کا یہ خاندان صرف یمن اور اطرافِ یمن کا حکمراں رہا ہے۔

اور طبقۂ ثانیہ کا دوسرا دور ۳۰۰ء کے اواخر سے شروع ہوکر ۵۲۵ء پر ختم ہوتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب آخری مرتبہ اہلِ حبش یمن پر قابض ہوجاتے ہیں۔ حتیٰ کہ آفتابِ اسلام کی ضیا یمن تک پہنچتی ہے اور سارا یمن ایک ہی روز مشرف باسلام ہوجاتا ہے۔ اس دور میں حکومت کا تسلسل باقی نہیں رہا بلکہ ۳۴۰ء کے وسط میں پہلی مرتبہ اکسومی حبشی خاندان نے کچھ عرصہ کے لئے یمن پر فاتحانہ قبضہ کرلیا تھا مگر چند سال کے بعد حمیر پھر اس کو واپس لے لیتے ہیں، اس دور میں شاہانِ سبا کا لقب مورخینِ عرب کے نزدیک "تُبّع" ہوجاتا ہے اور یہ "تبابعۂ یمن" کہلاتے ہیں۔ سامی زبان میں "تبع" کے معنی "سلطان اور قاہر بادشاہ" کے ہیں۔ چونکہ اس دور میں شاہانِ حمیر نے یمن کے علاوہ حضرموت حبشہ نجد اور تہامہ تک اپنی حدودِ مملکت کو وسیع کرلیا تھا اس لئے وہ اس لقب سے مشہور ہوئے چنانچہ ان کے دور کے کتبات میں "ملکِ سبا و ریدان و حضرموت" "ملکِ سبا و ریدان و حضرموت و نجد" وغیرہ ملکوں کے نام اضافہ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی وہ تُبّع ہیں جن کا ذکر قرآن کی سورۂ دخان اور سورۂ ق میں کیا گیا ہے۔ ریدان کا قلعہ ان کا ابتدائی دار الحکومت رہا ہے اور یہ شہر ظفار کے قریب آباد تھا جو صنعاء (موجودہ دار الحکومت یمن) کے متصل ہے اور جب سبا کے طبقۂ اولیٰ کے انتشار سے اس کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو حمیر نے مارب تک اپنی حکومت کو وسیع کرلیا۔

سبا کے طبقات کی یہ تقسیم مشہور مورخ حمزہ اصفہانی کے بیان سے ہوتی ہے۔

واول من ملک اولاد قحطان حمیر	قحطان کی اولاد میں جو پہلا بادشاہ ہوا وہ حمیر بن سبا ہے
بن سبا فبقی ملیکاً حتی مات ھرماً	یہ آخری وقت تک بادشاہ رہا یہاں تک کہ بوڑھا
وتوارث ولدہ الملک بعدہ فلم یعدھم	ہوکر مرگیا پھر حکومت اس کی اولاد میں وراثۃً جاری

الملك حتى مضت قرون وصار
الملك الى الحارث وهو تبع الاول
فمن ملك اليمن قبل الرائش ملكان
ملك بسبا وملك بحضرموت فكان لا
يجتمع اليمانيون كلهم عليهم الى ان
ملك الرائش فاجتمعوا عليه وتبعوه
فسمّي تبعاً ۔ ؎۵۱

رہی اور چند صدیوں تک ان کے ہاتھ سے نہیں نکلی پھر
حارث الرائش بادشاہ ہوا جو پہلا تبع ہے اس سے پہلے
دو بادشاہ ہوتے تھے ایک سبا میں اور ایک حضرموت
میں۔ تمام یمنی ایک پر متفق نہیں ہوتے تھے لیکن جب
الرائش بادشاہ ہوا تو اس کی بادشاہی پر سب مجتمع ہو گئے
اور ان کی اطاعت قبول کر لی۔ اس لئے اس کا لقب
تبع ہوا۔

اور مورخ و محدث ابنِ کثیرؒ نے بھی اپنی تاریخ میں یہی بیان کیا ہے۔

وكانت العرب تسمّي كل من ملك
اليمن مع الشحر وحضرموت تُبّعاً
كما يسمون من ملك الشام مع الجزيرة
قيصر ومن ملك الفرس كسرى ومن
ملك مصر فرعون ومن ملك الحبشة
النجاشي ومن ملك الهند بطليموس ؎۵۲

اور عرب اس بادشاہ کو جو یمن کے ساتھ شحر اور حضرموت
کا بھی بادشاہ ہو تُبّع کہتے ہیں جیسا کہ اس بادشاہ کو جو شام
اور جزیرہ دونوں کا حکمراں ہو قیصر کہتے ہیں اور جو فارس
کا بادشاہ ہو اس کو کسریٰ اور ملکِ مصر کے بادشاہ کو فرعون
اور حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی اور ہندوستان کے بادشاہ
کو بطلیموس کہتے ہیں۔

غرض یہ خیال کہ سبا کی حکومت اور حمیری حکومت ایک ہی بات ہے نہ صرف تاریخ ہی کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن عزیز کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اس لئے کہ قرآنِ عزیز نے حکومتِ سبا سے متعلق سورۂ نمل اور سورۂ سبا میں جو دو واقعے بیان کئے ہیں ان کا تعلق سبا کے اس طبقہ سے ہی جو ملوکِ حمیر اور تبابعہ سے قبل گذرا ہے اور اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حمیر، ہرگز سبا کا بلا واسطہ جانشین نہیں ہے بلکہ اس کے اور حمیر کے درمیان بہت زیادہ واسطے ہیں اور حمیر اگرچہ سبا کا بیٹا ہی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا اپنا زمانہ اور اس کی نسل میں قیامِ حکومت کا زمانہ ایک ہے۔ بلکہ قیاس یہ

؎۵۱ ص ۱۰۸ مطبوعہ کلکتہ۔ ؎۵۲ البدایۃ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۹۔

چاہتا ہے کہ سبا کے بعد اس کی اولاد میں حکومت کا وہ سلسلہ جو طبقۂ اولیٰ سے تعلق رکھتا ہے بجائے حمیر کی نسل کے کہلان کی کسی قدیم شاخ میں قائم رہا ہے کیونکہ مارب اور سبا کی نوآبادیوں کی تباہی کا اثر ہم بنی کہلان میں زیادہ پاتے ہیں اور مآرب تک حمیری حکومت کی ابتدار سبا کی بربادی سے شروع ہوتی ہے چنانچہ عام مورخین کے خلاف ابن عبدالبرؒ نے یہ تصریح کی ہے کہ سبا کی حکومت صرف حمیر کی نسل ہی میں نہیں رہی بلکہ کہلان کے خاندان میں بھی یہ سلسلہ رہا ہے وہ فرماتے ہیں۔

وولد سبا حمیر بن سبا وکھلان بن سبا	اور سبا کے دو بیٹے تھے حمیر اور کہلان اور حمیر و
فمن حمیر وکھلان کانت ملوک الیمن	کہلان دونوں ہی کی نسل سے یمن کے بادشاہ تبع
من التبابعۃ والاذواء ؎	اور ذو ہوئے ہیں۔

مکارب سبا و ملوک سبا سبا (طبقۂ اولیٰ) کے دورِ اول کے حکمراں تاریخ میں "مکارب سبا" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ لفظ "مکا" بمعنی مذہبی اور "رب" بمعنی مالک سے مرکب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سبا کا ابتدائی دورِ حکومت مذہبی پیشواؤں یعنی کاہن حکمرانوں سے شروع ہوتا ہے ان بادشاہوں کا دارالحکومت صرواح تھا اور یہ مآرب اور صنعار کے درمیان واقع تھا اور اس کے کھنڈرات بھی موجود ہیں اور ملوکِ سبا (شاہانِ سبا) کا دارالحکومت مآرب تھا اور ان کا بادشاہ اس کے مشہور قلعہ "سلحین" میں رہتا تھا۔ ابن علقمہ جاہلی شاعر، مسلمان مورخین سے قبل ان دونوں زمانہ ہائے حکومت کو الگ الگ ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

من یا من الحدثان بعد	ملوک صرواح ومآرب

صرواح اور مآرب کے بادشاہوں کے بعد اب کون حوادث سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اور یہی شاعر قلعہ سلحین کا بھی ذکر کرتا ہے۔

وقصر سلحین قد عفاہ	ریب الزمان الذی یریب

اور سلحین کا محل جس کو زمانہ کے حوادث نے فنا کردیا

وسعتِ حکومت حکومتِ سبا کی ابتدار جنوبی عرب "یمن" کے مشرقی حصہ سے ہوتی ہے اس کا دارالحکومت

اول صرواح تھا اور پھر مآرب ہوا آہستہ آہستہ اس حکومت نے ترقی کی اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ تجارتی ذرائع سے بھی بہت زیادہ کامیابی حاصل کی اس لئے اس کا رقبۂ حکومت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور شمالی عرب اور افریقہ تک اس کے حدود نظر آنے لگے چنانچہ حبشہ میں اذنیہ کا ضلع اسی کے مقبوضات میں تھا اور حکومتِ سبا کی جانب سے مغافر کے لقب سے ایک سبائی حکومت کرتا تھا یمن سے براہِ حجاز شام تک جو قدیم تجارتی شاہراہ تھی اور جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ قریش میں "رحلۃ الشتاء والصیف" کہکر کیا ہے اور دوسری جگہ جس کو "امام مبین" فرمایا ہے وہ بھی ان ہی کے قبضہ میں آ گئی تھی اور شام، فلسطین اور مدین کے نواح میں بھی ان کے مقبوضات موجود تھے اور اس طرح تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہل معین پر غلبہ پانے کے بعد سبا کی حکومت عرب کی عظیم الشان متمدن حکومت تھی۔ [1]

طرزِ حکومت سبا کے طرزِ حکومت کے متعلق اہلِ تاریخ یہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے محدود سلسلۂ رسل و رسائل کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ دار الحکومت سے فاصلہ پر آباد شہروں اور بستیوں پر آزاد گورنروں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہوں اور جو مرکزی حکومت کے تابع اور اس کے نائب کی حیثیت سے حکومت کیا کریں۔ پس اس اصول پر یمن کی حکومت قائم تھی اور اس کی ترتیب و تنظیم اس طرح پر تھی کہ آس پاس کے گاؤں اور قصبوں کے درمیان عموماً ایک قلعہ ہوتا تھا جس پر قلعہ دار رہتا تھا اور وہی ان آبادیوں کا حاکم اور ذو کہلاتا تھا اور اس مجموعہ آبادی کو "محفد" کہتے تھے۔ یمنی زبان میں "ذو" کے معنی "آقا" کے ہیں جو عربی میں بمعنی صاحب و مالک بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اذوار آتی ہے اور قلعہ کا جو نام رکھا جاتا تھا اسی کے انتساب سے قلعدار کا لقب قرار پاتا تھا مثلاً ذو غمدان، ذو ثعلبان۔

پھر چند محفد مل کر ایک "مخلاف" بنتا تھا اور اس مخلاف کے حاکم کو "قیل" (صوبہ دار) کہتے تھے قیل کی جمع "اقیال" ہے اور یہ سب اقیال "ملک" (بادشاہ) کے تابع فرمان ہوتے تھے، ان ہی بادشاہوں کو یمن کی تاریخ میں مکارب سبا اور ملوکِ سبا کہا جاتا تھا اور ہر بادشاہ کا بھی ایک زبردست اور محکم قلعہ

---

[1] دائرۃ المعارف للبستانی (سبا) ومعجم البلدان (یمن)۔

ہوتا تھا چنانچہ قلعہ "ریدان" اور "سلحین" ان ہی بادشاہوں کے قلعے تھے اور یہ بادشاہ ان ہی قلعوں اور دارالحکومت کے شہروں کے انتساب سے لقب پاتے تھے مثلاً "ملک سبا ذوریدان" یا "ملک سبا، ذوسلحین" مارب کے آثار سے جو سکے حاصل کئے گئے ہیں ان پر یہ نقش کندہ ہے "ضرب ببیت سلحین وحفر مارب" یعنی یہ قلعہ سلحین اور شہر مارب میں مسکوک کیا گیا۔

یمن کے اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے بعد بھی "اذواء" اور "اقیال" کا یہ نظم حکومت باقی رکھا گیا اور یہی وہ اقیال یمن ہیں جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کے لئے نامہائے مبارک تحریر فرمائے اور انھوں نے برضا ورغبت دعوتِ اسلام کو قبول کیا

سبا کی عمارات ہمدانی جو کہ قدیم مورخین کی طرح جدید مورخین یورپ کی نگاہ میں بھی بہت مستند اور سچا مورخ تسلیم کیا جاتا ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب اکلیل میں ایک باب سبا کی عظیم الشان اور عجیب غریب عمارات کے لئے مرتب کیا ہے اور حکومت سبا کے سلسلہ میں جو کتبات پائے گئے ہیں ان میں بھی اکثر ان قلعوں اور بے نظیر عمارات ہی کے کتبے ہیں اور یورپین سیاح بھی ان کھنڈرات کے عجیب و غریب حالات سناتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ قصر غمدان[۱] بے مثل صناعی کا نمونہ تھا یہ قصر بیس منزل رکھتا تھا اور ہر ایک منزل کا ارتفاع بقدر دس گز معماری تھا اور سب سے اوپر کی منزل نہایت بیش قیمت آبگینوں سے بنائی گئی تھی اور اس قصر میں سو وسیع و عریض کمرے تھے۔ اسی طرح بے نظیر عمارات کا سلسلہ تھا جو اس زمانہ کے رفیع تمدن اور سبا کی حیرت انگیز ترقی کا آئینہ دار تھا۔

سبا کا تمدن گذشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے کہ اہل سبا ایک تاجر قوم تھی اور یہ وصف ان کا قومی مزاج بن گیا تھا۔ اس لئے وہ حکومت کے وسائل ترقی کے لئے بھی اسی کو زیادہ اہم وسیلہ سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے حدودِ حکومت میں جو خزانے مدفون کر رکھے تھے وہ اور زیادہ ان کی اس فطرت کے لئے

---

[۱] یقال ان غمدان قصر بالیمن بناہ یعرب بن قحطان وملکہ بعدہ واخذہ واثلۃ بن حمیر بن سبا ویقال کان ارتفاعہ عشرین طبقۃ۔ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۷۹۔

تائیدِ غیبی بن گئے تھے کیونکہ عرب میں سونے اور جواہرات کی بہ کثرت کانیں موجود ہیں اور ان کا بیشتر حصہ ان ہی کے رقبۂ حکومت میں موجود تھا۔ مدین میں سونے کے علاوہ دوسری قسم کی معدنیات بھی پائی جاتی ہیں حضرموت اور یمن کا علاقہ خوشبودار اشیاء کی پیداوار کے لئے مشہور تھا اور اب بھی ہے عمان اور بحرین میں موتیوں کے خزانے ہیں جن سے آج بھی تمام دنیا میں بیش قیمت موتی جاتا ہے۔ خود یمن کے ساحل ہندوستان اور حبش کی پیداوار کے لئے منڈی تھے اور شام مصر، یورپ اور ہندوستان و حبش کے درمیان جو درآمد و برآمد ہوتی اور تجارتی کاروبار ہوتا تھا اس زمانہ میں سبا ہی اس کے واحد اجارہ دار اور براہِ حجاز ان ملکوں تک سامانِ تجارت پہنچاتے تھے۔ اسی بنا پر توراۃ میں سبا کی دولت و ثروت اور اس کی وجہ سے ان کے تمدن کی عظمت کے بہ کثرت تذکرے پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے۔

"مصر کے مزدور اور حبش اور سبا کے تجارتی مال اور تنومند آدمی تیرے پاس آئیں گے اور وہ تیرے ہوں گے۔" [۵۱]

اور اسی کتاب میں دوسری پیشینگوئی ہے۔

(اے یروشلم) اونٹوں کی قطاریں تجھ پر چھا جائیں گی، مدین اور عیفا کی اونٹنیاں (بھی) یہ سب سبا سے آئیں گی اور سونا اور لوبان لے کر آئیں گی۔" [۵۲]

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے۔

(خداوند غصہ کرتے ہوئے فرماتا ہے) کس مقصد کے لئے میرے پاس سبا کا لوبان پیش کرتے ہو [۵۳]

اور حزقیل نبی کی کتاب میں ہے۔

اور عوام کے ساتھ سبا والے بیابان (عرب) سے لائے گئے جن کے ہاتھوں میں کنگن ہیں اور خوبصورت تاج ان کے سروں پر ہیں۔ [۵۴]

اور دوسری جگہ ہے۔

اور سبا اور رعمہ کے سوداگر تیرے ساتھ سوداگری کرتے تھے وہ تیرے بازاروں میں ہر قسم کے

---

[۵۱] (۴۵-۱۴)، [۵۲] (۶۰-۶) [۵۳] (۶-۲۰) [۵۴] (۲۳-۴۲)

نفیس اور خوشبودار مصالحے اور ہر طرح کے جواہرات اور سونا اور (یمن کے شہروں) حسّران،
قانہ اور عدن اور سوداگرانِ سبا اور اشور اور کلماو تیرے سوداگر ہیں۔ یہ ہی تیرے تاجر تھے۔
ہر قسم کی چیزوں کے جو کمخاب اور چوغے اور ارغوانی اور منقش پوشاکیں اور سب طرح کے
بونے دار نفیس کپڑے رسّوں سے کسے ہوئے اور مضبوط بندھے ہوئے تیری تجارت گاہ میں
بیچنے کے لئے لاتے تھے۔ [1]

سدِ مارب | عرب میں مستقل دریا ناپید ہیں، اکثر بارش کے پانی پر گذر ہے اور کہیں کہیں پہاڑی چشمے بھی ہیں، بارش کا پانی ہو یا پہاڑی چشموں کا تمام پانی بہ کر وادی کے ریگستان میں جذب ہو کر ضائع ہو جاتا ہے، قومِ سبا نے اس پانی کو کام میں لانے اور باغات و زراعت کو سرسبز و شاداب بنانے کے لئے یمن کے تمام اقطاع و امصار میں ایک سَو سے زائد بند باندھے تھے اور ان کی وجہ سے تمام ملک سرسبز اور بہارستان بنا ہوا تھا ان ہی بندوں میں سے سب سے بڑا اور عظیم الشان بند "سدِ مارب" تھا جو دار الحکومت مارب میں بنایا گیا تھا۔

اس "سد" کے متعلق قدیم و جدید مورخوں اور سیاحوں نے جو حالات لکھے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ سبا کو فنِ انجنیری اور ہندسہ میں بہت بڑا کمال حاصل تھا۔

مارب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں جو کوہِ ابلق کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے درمیان بہت طویل و عریض وادی ہے جس کو وادیِ اُذنیہ کہتے ہیں جب پانی برستا یا پہاڑی چشموں سے بہ نکلتا تو وادی دریا بنجاتی۔ سبا نے یہ دیکھکر ۸۰۰ ق م میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بند باندھنا شروع کیا اور عرصہ تک اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔

بعض مورخینِ عرب کہتے ہیں کہ یہ بند دو میل مربع تھا [2] اور صاحب ارض القرآن ایک یورپین سیاح ارناؤ کے مضمون کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک سو پچاس فٹ لانبی اور پچاس فٹ چوڑی دیوار ہے جس کا بہت بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے اور ایک تہائی اب بھی باقی ہے اور وہ یہ بھی

---

[1] ۲۷ – ۲۲ – ۲۲۔ [2] تاریخ ابنِ کثیر ج ۳ ص ۱۵۹۔

تحریر فرماتے ہیں کہ اس سیاح نے اس کا بہت عمدہ نقشہ تیار کر کے اپنے مضمون کے ساتھ شائع کیا ہے جو فرینچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا ہے اور جس کو انھوں نے ارض القرآن میں بھی نقل کیا ہے۔

مورخین عرب یہ بھی کہتے ہیں کہ سبأ نے اس کو اس طرح تعمیر کیا تھا کہ پانی کو روکنے کے بعد موسموں کے اختلاف کے پیش نظر آبیاری کے لئے پانی کے اوپر نیچے تین درجے قائم کر دیئے تھے اور ہر درجہ میں تیس تیس کھڑکیاں رکھی تھیں جن کے ذریعہ پانی کو کھولا اور بند کیا جاتا تھا اور پھر ان کے نیچے ایک بہت بڑا حوض بنایا تھا اس کے دائیں اور بائیں دو بڑے بڑے آہنی پھاٹک تھے جن کے ذریعہ حوض کا پانی تقسیم ہو کر مارب کے دونوں جانب نہروں، گولوں اور جھیلوں کے ذریعہ حسب ضرورت کام میں آتا تھا۔ اس عظیم الشان بند کی وجہ سے تقریباً تین سو مربع میل تک داہنے اور بائیں چھواروں کے نخلستان میووں اور پھلوں کے حسین و جمیل باغ، خوشبوؤں کے کھیت اور مرغزار، دارچینی، عود اور مختلف قسم کے خوشبودار درختوں کے گنجان باغات اس کثرت سے ہو گئے تھے کہ تمام علاقہ چمنستان اور فردوس بنا ہوا تھا۔ [۵۱]

ابن کثیرؒ وغیرہ بروایت ابن منبہؒ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر ایک عورت کسی موسم میں بھی سر پہ ٹوکری رکھ کر ان باغات کے اندر گذر جاتی تو ہاتھ لگائے بغیر ہی اس کی ٹوکری پختہ پھلوں کے ٹپکنے سے بھر جاتی۔ [۵۲]

یمن کی طبعی خصوصیت کے لحاظ سے خوشبوؤں، پھلوں اور پھولوں کے درختوں کی کثرت، مارب کے بند کی وجہ سے اس میں عظیم الشان اضافہ اور ترقی، تجارتی کاروبار اور معدنیات کی کثرت کی وجہ سے سونا، چاندی اور جواہرات کی بہتات نے قوم سبا میں اس درجہ خوش عیشی، رفاہیت، فارغ البالی اور اطمینان پیدا کر دیا تھا کہ وہ ہر وقت مسرت و شادمانی کے ساتھ خدا کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے اور شب و روز طمانیت و مرفہ الحالی میں زندگی بسر کرتے تھے۔

اور ملک کے بہارستانوں اور چمنستانوں کی وجہ سے آب و ہوا میں اس درجہ اعتدال تھا

---

[۵۱] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸۔ [۵۲] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۲۔

کہ اہلِ سبا مچھروں، مکھیوں اور پسوؤں جیسے ایذا رساں کیڑوں سے پاک و محفوظ تھے چنانچہ سبا کے معاصر مورخ اہلِ سبا کی اس رشک پیدا کرنے والی زندگی کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

(ارانوسیتھنس (Eratoothens ..) ۱۹۴ق م لکھتا ہے۔

"عرب کے انتہائی حد پر سمندر (بحر ہند و عرب) کے پہلو میں . سبا کے لوگ ہیں جن کا دارالحکومت ماریب (Mariaba) ہے ... یہ قطعہ ملک مصر کے زیریں پڑا ہے گرمیوں میں بارش ہوتی ہے اور دریا جاری ہوتے ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں جاکر خشک ہو جاتے ہیں، اسی سبب سے زمین اس قدر سرسبز و شاداب ہے کہ تخم ریزی وہاں سال میں دوبار ہوتی ہے۔ حضرموت سے سبا کے ملک تک چالیس روز کا راستہ ہے اور معین سے سوداگر ستر دن میں ایلہ (عقبہ) پہنچتے ہیں۔ حضرموت، معین اور سبا کے ملک خوش و خرم ہیں اور ہیکلوں اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔

اور یونانی مورخ اگاتھرشیڈس (Agatherohides .) ۱۲۵ق م لکھتا ہے۔

سبا عرب آبادان (Arabiaflex) میں رہتے ہیں جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں، زمین جو سمندر کے متصل ہے اس میں بلساں اور نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اندرون ملک بخورات، دارچینی اور چھوارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت شیریں بو پھیلا کرتی ہے۔ درختوں کے اقسام کی کثرت و تنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے جو خوشبو اس میں سے اُڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گذرتے ہیں وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں . . . . وہ گویا آبحیات کا لطف اٹھاتے ہیں اور یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے مقابل میں ناقص ہے۔

اور یہی مورخ دوسری جگہ لکھتا ہے۔

سبا میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بکثرت ہر طرف سے لایا

جاتا ہے بُعد کے سبب سے کسی نے ان کو فتح نہیں کیا ہے اسی لئے حصوصاً ان کے دارالحکومت میں سونے چاندی کے برتن ہیں تخت اور نشستگاہیں ہیں جن کے ستون زرنگار اور نقرئی وطلائی نقش ونگار سے آراستہ ہیں، ایوان اور دروازے زروجواہر سے منقش ہیں۔ اس قسم کے زیب وزینت پر وہ نہایت ہنرمندی اور محنت صرف کرتے ہیں۔

اور مشہور مورخ آرٹی میڈوروس (Artimudorus) سنہ ق م باشندہ شہر افسس لکھتا ہے۔

"سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مارب میں ہے جو ایک پر اشجار پہاڑ پر زنانہ خوشنما رعیت دشت میں واقع ہو۔ میووں کی کثرت کے سبب سے لوگ سست اور ناکارہ ہوگئے ہیں۔ خوشبودار درختوں کی جڑوں میں لیٹے پڑے رہتے ہیں، جلانے کی لکڑی کے بدلے دارچینی اور خوشبودار لکڑی جلاتے ہیں کچھ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اور کچھ ملکی وغیر ملکی مسالوں کی تجارت کرتے ہیں۔ یہ مسالے مقابل کے حبشی ساحل سے لائے جاتے ہیں جہاں سبا کے لوگ چمڑے کی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں۔ قرب وجوار کے قبائل سبا سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو دیتے ہیں اور اسی طرح دست بدست وہ شام اور جزیرہ تک پہنچتے ہیں۔" لہ

جنتانِ عن یمینٍ وشمال | غرض یمن کی طبعی خصوصیات کے علاوہ جو اس ملک کی شادابی اور معتدل آب وہوا کے لئے قدرتی وسائل کی شکل میں موجود تھیں ملک کے اندر اس "بندِ آب" نے ہر قسم کی راحت اور عیش وعشرت کی زندگی کے لئے سامان فراہم کر دیئے تھے۔ اور ان سب چیزوں پر یہ مستزاد تھا کہ یمن سے شام تک جس مشہور شاہراہ "امامِ مبین" پر اہلِ سبا کے تجارتی قافلوں کی آمد ورفت تھی اس کے بھی دونوں جانب حسین وخوبصورت بلساں اور دارچینی کے خوشبودار درختوں کا سایہ تھا اور قریب قریب فاصلہ سے حکومتِ سبا نے ان کے سفر کو آرام دہ بنانے کے لئے کاروان سرائے بنا رکھی تھیں جو شام کے علاقہ تک ان کو اس آرام کے ساتھ پہنچاتی تھیں کہ خنک پانی اور میووں اور پھلوں کی افراط یہ بھی

لہ ارض القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۵۲،۲۵۴

محسوس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ اپنے وطن میں ہیں یا دشوار گذار سفر میں۔ حتیٰ کہ جب خوشگوار سایہ اور فرحت بخش ہوا میں ان کا کاروان ان کارواں سراؤں میں ٹھیرتا، میوے اور تازہ پھل کھاتا اور سرد و شیریں پانی پیتا ہوا حجاز اور شام تک آمد و رفت رکھتا تو ہمسایہ قومیں رشک و حسد سے ان پر نگاہیں اٹھاتی اور حیرت و تعجب کے ساتھ ان کے اس عیش و عشرت پر انگشت بدنداں ہو جاتی تھیں جیسا کہ آپ ابھی اُن کے معاصر مورخین کی زبان سے سن چکے ہیں کہ وہ کن الفاظ کے ساتھ ان کی اس خوشحالی کا تذکرہ کر رہے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بے دار زاں کر دیا تھا۔

ان تاریخی تصریحات کے بعد اب ہم کو قرآن عزیز کی ان آیات کا مطالعہ کرنا چاہئے جو سبا کی اس خوش حالی کا ذکر کرتے ہوئے اس کو اہل سبا پر خدائے تعالیٰ کا عظیم الشان انعام و اکرام اور احسانِ عظیم ظاہر کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ	بلاشبہ اہلِ سبا کے لئے ان کے وطن میں قدرتِ الٰہی کی عجیب و
آيَةٌ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَ	غریب "نشانی" تھی۔ دو باغوں کا (سلسلہ) داہنے بائیں"۔ اور
شِمَالٍ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ	خدا نے ان کو یہ فرما دیا تھا" اے سبا والو! اپنے پروردگار کی جانب
وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ	سے بخشی ہوئی روزی کھاؤ اور اس کا شکر کرو، شہر ہے پاکیزہ اور
وَّرَبٌّ غَفُورٌ (سبا)	پروردگار ہے بخشنے والا۔

ایک مرتبہ گذشتہ تاریخی تفاصیل کو اور مطالعہ کیجئے اور صرف مسلمان مورخین کی روایات کی روشنی میں نہیں بلکہ ان غیر مسلم مورخین کی معاصرانہ شہادتوں کی روشنی میں پڑھئے جو اسلام دشمنی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور پھر قرآن کی مسطورہ بالا آیات کا مطالعہ فرمائیے۔ قرآن کہتا ہے کہ سبا کے اپنے گھر ہی میں خدائے تعالیٰ کی بے نظیر اور عجیب و غریب نشانی موجود تھی وہ یہ کہ سینکڑوں میل تک ان کے شہر کے داہنے بائیں میووں پھلوں اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کا گنجان سلسلہ باغات کی شکل میں موجود تھا۔ یہ خدائے تعالیٰ کا عطا کردہ رزق تھا جو آس پاس کی قوموں کے مقابلہ میں دو طرح سے ان کو بخشا گیا تھا۔ ایک ملک کے طبعی خواص کے ذریعہ جو اللہ کی "فطرۃ" کے ہاتھوں سے معتدل ہوا، سرد و خنک پانی، عمدہ

پھلوں اور پھولوں کی خودرو پیداوار اور خوشبودار چیزوں سے درختوں کی طبعی نشوونما کی . . . شکل میں ظاہر ہوا اور دوسرا آب رسانی کے بہتر طریقوں کی صورت میں جو درحقیقت خالقِ کائنات ہی کی عطا کردہ عقل وخرد اور فہم وذکا کا نتیجہ تھا۔ پس اہلِ سبا کا فرض ہے کہ وہ اس خوش عیشی اور عافیت کوشی پر جو ان کو ان کے وطن ہی میں بے محنت حاصل ہے؟ اس کے شکرگزار بندے بنیں، اگر وہ ان نعمتوں کا شکر ادا کریں گے اور خدا کے رشتہ کو مضبوط کرنے کے لئے اس کی مرضیات پر گامزن رہیں گے تو بلاشبہ انھیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ایک جانب ان کی دنیا کی زندگی کے لئے ان کو ایسا عمدہ اور ہر طرح سے پاک صاف وطن حاصل ہے اور دوسری جانب ان کی حیاتِ ابدی اور نجاتِ اخروی کے لئے ان کا پروردگار بہت بخشنے والا ہے۔

اہلِ سبا اور خدا کی نافرمانی

اہلِ سبا ایک عرصہ تک تو اس جنتِ ارضی کو خدا کی عظیم الشان آیت ونعمت ہی سمجھتے اور حلقہ بگوش اسلام رہتے ہوئے احکامِ الٰہی کی تعمیل اپنا فرض یقین کرتے رہے لیکن تموّل، خوش عیشی اور ہر قسم کے تنعّم نے آہستہ آہستہ اُن میں بھی وہی اخلاقِ ردیّہ پیدا کردئے جو ان کی پیشرو گذشتہ متکبر اور مغرور قوموں میں موجود تھے اور یہ یہاں تک ترقی کرتے رہے کہ انھوں نے دینِ حق کو بھی خیرباد کہدیا اور کفر وشرک کی سابق زندگی کو دوبارہ اپنا لیا۔ تاہم "ربِّ غفور" نے فوراً گرفت نہیں کی بلکہ اس کی وسعتِ رحمت نے قانونِ امہال (مہلت دینے کا قانون) سے کام لیا اور انبیاء (علیہم السلام) نے ان کو راہِ حق کی تلقین فرمائی اور بتایا کہ ان نعمتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم دولت ثروت اور جاہ وحشمت کے نشہ میں چور ہوکر مست ہوجاؤ اور نہ یہ کہ اخلاقِ کریمانہ کو چھوڑ بیٹھو اور کفر وشرک اختیار کرکے خدا کے ساتھ بغاوت کا اعلان کردو، سوچو اور غور کرو کہ یہ راہ بُری راہ ہے اور اس کا انجام بُرا انجام ہے۔

محمد بن اسحاقؒ بروایت ابنِ منبہؒ کہتے ہیں کہ اس درمیان میں ان کے پاس خدائے تعالیٰ کے تیرہ نبی حقِ رسالت ادا کرنے آئے مگر انھوں نے مطلق توجہ نہ کی اور اپنی موجودہ خوش عیشی کو دائمی وراثت سمجھکر شرک وکفر کی بدمستیوں میں مبتلا رہے۔ ؎۱

؎۱ البدایہ والنہایہ ج ۲

آخر تاریخ نے خود کو دہرایا اور ان کا انجام بھی وہی ہوا جو گذشتہ زمانہ میں خدائے برحق کی نافرمان قوموں کا ہو چکا ہے۔

سیلِ عَرِم | چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ان پر دو قسم کا عذاب مسلط کر دیا جن کی بدولت ان کے جنت مثال باغات برباد ہو گئے اور ان کی جگہ جنگلی بیریاں، خاردار درخت اور پیلو کے درخت اُگ کر یہ شہادت دینے اور عبرت کی کہانی سنانے لگے کہ خدا کی پیہم نافرمانی اور سرکشی کرنے والی اقوام کا یہ حشر ہوتا ہے؟۔

پہلی سزا | ہوا یہ کہ وہ "بند" جس کی تعمیر پر ان کو بیحد ناز تھا اور جس کی بدولت ان کے دارالحکومت کے دونوں جانب تین سو مربع میل تک خوبصورت اور حسین باغات اور سرسبز و شاداب کھیتوں اور فصلوں سے یہ گلزار بنا ہوا تھا وہ خدا کے حکم سے ٹوٹ گیا اور اچانک اس کا پانی زبردست سیلاب بنا ہوا وادی میں پھیل گیا اور مارب اور اس تمام حصۂ زمین پر جن میں یہ فرحت بخش باغات تھے چھا گیا اور ان سب کو غرقِ آب کر کے برباد کر ڈالا۔ اور پھر جب پانی آہستہ آہستہ خشک ہو گیا تو اس پورے علاقہ میں "باغوں کی جنت" کی جگہ پہاڑوں کے دونوں کناروں سے وادی کے دونوں جانب جھاؤ کے درختوں کے جھنڈ جنگلی بیروں کے جھاڑ اور ان پیلو کے درختوں نے لے لی جن کا پھل بدذائقہ اور بکساپن لئے ہوتا ہے۔

اور خدا کے اس عذاب کو اہلِ مارب اور قوم سبا کی کوئی قوت و سطوت نہ روک سکی اور بند باندھنے میں انجنیری اور علم ہندسہ کی مہارتِ فن کا جو ثبوت انھوں نے دیا تھا وہ اس کی شکستگی کے وقت سب ناکارہ ہو کر رہ گیا۔ اور اہلِ سبا کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا کہ اپنے وطنِ مالوف اور "بلدۂ طیبہ" مارب اور نواحِ مارب کو چھوڑ کر منتشر ہو جائیں۔

قرآنِ عزیز نے اسی عبرتناک واقعہ کو بیان کر کے عبرت نگاہ اور بیدار قلب انسان کو نصیحت کا یہ سبق سنایا ہے۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ	پھر انھوں نے (قوم سبا نے) ان پیغمبروں کی نصیحتوں
سَیْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَیْهِمْ	سے منہ پھیر لیا۔ پس ہم نے ان پر بند توڑنے کا سیلاب
جَنَّتَیْنِ ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ وَّ	بھیجدیا اور ان کے دو (عمدہ) باغوں کے بدلے

وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ ۝ دو ایسے باغ اگا دیئے جو بدمزہ پھلوں، جھاؤ اور کچھ بیری
ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَ هَلْ کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ یہ ہم نے ان کی ناشکرگذاری
نُجٰزِیْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝ (سبا) کی سزا دی اور ہم ناشکر قوم ہی کو سزا دیا کرتے ہیں۔

غور کیجئے کہ یہ سیلاب بہ اسبابِ ظاہر کس طرح آیا، کیا اس لئے کہ "مارب کا بند" کہنہ اور شکستہ ہو گیا تھا؟ نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس قسم کے مہندسین اور انجنیری کے ماہرین نے اس کو بنایا تھا، سبا میں ان کی اس وقت بھی کمی نہ تھی اور وہ اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں سینکڑوں بند تعمیر کراتے رہے تھے پھر کیا وہ اس کی کہنگی اور شکستگی کا اتنا انتظام بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اگر اس کو اپنی طبعی عمر پر ٹوٹنا ہی ہے تو پانی کے زور کو اس طرح کم کر دیا جائے یا اس کے لئے تعمیر میں ایسے اضافے کر دئے جائیں کہ جس سے یہ اچانک شکست ہو کر اس مصیبتِ عظمیٰ کا باعث نہ بن سکتا، پھر یہ سیلاب کیوں آیا کیا اس لئے کہ اس حقیقت کے جان لینے کے باوجود کہ یہ بند عنقریب شکستہ ہو کر اس داہیۂ کبریٰ کا باعث بننے والا ہے۔ انھوں نے کاہلی اور سستی سے اس کی پرواہ نہیں کی؟ تو تاریخ کی روشنی میں یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ حکومتِ سبا کے متعلق جو معاصرانہ تاریخی شہادتیں ہم کو مہیا ہیں وہ یظاہر کرتی ہیں کہ وہ اس بند کی مضبوطی، استحکام اور ہر قسم کے حفاظتی امور کے بارے میں بہت مطمئن تھے اور برابر اس سے آبپاشی کا کام لے رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم وجدید تاریخیں اس ہولناک تاریخی واقعہ کے اسباب و علل کے بارے میں قطعاً خاموش ہیں اور اس لئے خاموش ہیں کہ سبا پر یہ عذاب بلاشبہ غیر متوقع اور اچانک آیا جس سے وہ خود بھی حیران و سراسیمہ ہو کر رہ ہوگئے اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکے کہ یہ جو کچھ ہوا اچانک غیبی ہاتھ سے ہوا کیونکہ بند کے استحکامات اور انتظامات میں بظاہر کوئی خرابی نہیں تھی پھر یکلخت بند کا ٹوٹ جانا اور پانی کا سیلابِ عظیم کی شکل میں پھیل کر تمام جنت نشان علاقہ کو تباہ و برباد کر دینا بجز عذابِ الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے جب جائز اور پاک خوش عیشی کو عیاشی اور بداطواری میں بدل دیا، خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے غرور و تکبر کے ساتھ کفرانِ نعمت کیا

نبیوں اور پیغمبروں کے بار بار رشد و ہدایت پہنچانے کے باوجود شرک و کفر پر اصرار کیا تو اچانک عذاب الٰہی آکر ان کو تباہ و برباد نہ کرتا تو اور کیا ہوتا۔ ”فاعرضوا فارسلنا علیہم سیل العرم ۰ ذالک جزینٰہم بما کفروا و ھل نجٰزی الا الکفور ۰“

ابن جریرؒ، ابن کثیرؒ اور دوسرے اصحاب سیرؒ نے اس موقعہ پر ایک اسرائیلی حکایت بیان کی ہے جس کو محمد بن اسحٰقؒ نے وہب بن منبہؒ سے نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب ”سد مارب“ کو برباد کرنے کا ارادہ کر لیا تو ”بند“ کی بنیادوں میں بڑے بڑے گھونس پیدا کر دیئے اور انھوں نے آہستہ آہستہ اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا، قوم سبا نے جب یہ دیکھا تو بند کی بنیادوں کے ہر ایک پایہ اور ستون سے بلیاں بندھوا دیں کہ اس خوف سے گھونس جڑوں کو کھوکھلا نہ کر سکیں گے۔

وہب بن منبہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں یہ پیشینگوئی درج تھی کہ اس سد کی بربادی گھونسوں کے ذریعہ ہوگی اس لئے جب انھوں نے سد میں گھونسوں کو دیکھا تو بلیاں باندھ دیں مگر جب خدائے تعالیٰ کی مشیت کے پورا ہونے کا وقت آیا تو گھونس اتنے منہ زور ہوگئے کہ وہ بلیوں سے گھبرانے کی بجائے ان پر حملہ آور ہونے لگے اور انھوں نے چند ہی روز میں بند آب کی جڑیں ہلا دیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ ”بند“ پانی کا زور برداشت نہ کر سکا اور سیلاب کی صورت میں بہ نکلا، اس روایت کو بعض راویوں نے بغیر سند کے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت قتادہ کی جانب بھی منسوب کیا ہے [۱]

یہ روایت، اسرائیلی حکایت اور اسرائیلی داستان سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی اور اصول روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابل اعتماد ہے، روایت کے لحاظ سے اس لئے قابل احتجاج نہیں کہ اس کے بعض طریقے بے سند ہیں اور بعض منقطع، اور درایت کے اعتبار سے اس لئے اعتماد کے قابل نہیں کہ اس روایت میں سیلاب سے متعلق جو واقعہ درج ہے یعنی گھونس اور بلیوں کا معاملہ وہ صرف وہب بن منبہ ہی کی روایت میں مذکور ہے اور وہب اسرائیلی روایات کے مدار ہیں نیز اگر ”سد مارب“ کی تباہی میں گھونسوں اور بلیوں کا یہ معرکہ بھی کچھ تعلق رکھتا تو قرآن، واقعہ کی اس اہم کڑی کو کبھی نظر انداز نہ کرتا۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۲ و روض الانف ج ۱۔

یا کم از کم کسی صحیح حدیث میں اس تفصیل کا تذکرہ ہوتا۔

علاوہ ازیں جس ملک میں ایسے ماہر انجنیر موجود ہوں جنھوں نے مآرب اور اس کے علاوہ یمن کے بہت سے حصوں میں بہترین "بندِ آب" اپنی فنی مہارت کی مدد سے بنائے ہوں ان کے متعلق عقل یہ کیسے باور کر سکتی ہے کہ جب ان کے علم میں یہ بات آئی ہو کہ اس "بندِ آب" کی بنیادیں گھونس کھو کھلا کر رہے ہیں تو بند کے استحکامات کی تمام ان حفاظتی تدابیر کو چھوڑ کر جو فنِ انجنیری اور استحکامات تعمیرات کے اصول پر ضروری تھیں صرف اس طفلانہ حرکت پر اکتفا کر لیا کہ بند کے ستونوں اور پایوں کے ساتھ بلیاں باندھ دیں پھر گھونس آزاد اور بلیاں مقید، یہ عجیب حفاظتی تدبیر کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔

اس روایت کے برعکس قرآنِ عزیز کی صنیع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنا پر "سیلِ عَرِم" کا یہ عذاب اچانک آیا اور اس نے اس طرح مآرب اور اطرافِ مآرب کو تباہ کیا کہ اہلِ مآرب کو سنبھلنے اور پیش آمدہ حالت کا صحیح اندازہ لگانے کا بھی موقع نہیں ملا۔ لہذا اگر چوہوں یا گھونسوں سے متعلق حکایات کو کسی درجہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو واقعہ کی حقیقت صرف اسی قدر ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے موسم میں جبکہ یمن میں بارش بہ کثرت برستی ہے "بندِ آب" میں بڑے بڑے گھونسوں کی اتنی کثیر تعداد پیدا کر دی ہو جنھوں نے غیر معمولی طور پر چند ہی دنوں میں اس کو کھو کھلا کر ڈالا اور پانی کے زور نے یکلخت بند کو شکست کر کے سیلابِ عظیم بپا کر دیا اور قومِ سبا اس حال سے ناواقف رہی اور اچانک حادثہ نے ان کو خانماں برباد کر کے اِدھر اُدھر منتشر کر دیا۔ اگرچہ اس تفصیل کا ثبوت بھی کسی صحیح روایت سے نہیں ملتا قرآنِ عزیز کا سیاق اور اس کا اسلوبِ بیان ان تمام روایات یا حکایات کا بھی انکار کرتا ہے جو محمد بن اسحٰق وغیرہ اصحابِ سیر نے اس سلسلہ میں نقل کی ہیں کہ انصار اور بعض دوسرے قبائل یمن کے بعض بزرگوں کو پرانی کتابوں یا کاہنوں کے ذریعہ سے "سیلِ عرم" کے متعلق تفصیلی حالات معلوم ہو گئے تھے اور اس لئے وہ اس حادثۂ کبریٰ کے واقع ہونے سے قبل ہی مختلف حیلوں اور بہانوں سے یمن (مآرب) چھوڑ کر یثرب، شام، عراق جیسے مقامات میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ابن اسحٰق وغیرہ کی روایات کا خلاصہ یہ ہے۔

عمرو بن عامر کمی اور بعض دوسرے ابو القبائل کو پرانی کتابوں اور کاہنوں کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ شہر مآرب پر سد کی شکست کی بدولت سخت بربادی آنے والی ہے اور اس سد کے شکست کا جب وقت آئے گا تو اول اس کی بنیادوں میں گھونس پیدا ہوں گے جو بنیادوں کو کھوکھلا کریں گے اور جب بندِ آب کمزور پڑ جائے گا تب برسات کے موسم میں ٹوٹ کر سینکڑوں میل تک سیلاب آجائے گا اور مآرب اور اس کے دونوں جانب میلوں تک حصہ ملک تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ سب سے اول عمرو بن عامر نے یہ دیکھا کہ چوہے یا گھونس "بند آب" کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں تب اس نے سمجھا کہ اب مآرب کی بربادی کا وقت آپہنچا اس لئے اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنی قوم کو اصل حقیقت سے مطلع کئے بغیر کسی حیلہ سے ترکِ وطن کر کے کسی دوسری جگہ آباد ہو جانا چاہیے تاکہ آنیوالی مصیبت سے محفوظ رہ سکیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ عمرو کی بیوی بھی کاہنہ تھی اور اس واقعہ کی اطلاع اس نے پہلے سے ہی اپنے شوہر کو دیدی تھی لہذا اس نے یہ طے کرلیا کہ یہاں سے ترک وطن کر دینا چاہیے مگر یہ ایسے طریقہ سے ہو کہ قوم کو کسی طرح علم نہ ہو سکے ورنہ تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو تنہائی میں بلا کر یہ سمجھایا کہ میں ایک خاص ضرورت کے پیشِ نظر یہ چاہتا ہوں کہ کل جب میں مجلس میں تجھ سے کسی کام کے متعلق حکم کروں تو انکار کر دینا اس پر میں مصنوعی غصہ سے تیرے منہ پر طمانچہ ماروں گا تجھ کو بھی چاہیئے کہ ادب و احترام کو بالائے طاق رکھکر میرے منہ پر انتقامی طمانچہ لگائے اس کے بعد میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اس کو کر سکوں گا۔

لڑکے نے باپ کا یہ انوکھا مشورہ سنا تو بیحد پریشان ہوا اور اس نے ایسی گستاخی کرنے سے انکار کر دیا لیکن باپ کے پیہم اصرار کے بعد اس کو منظور کرنا پڑا۔ چنانچہ دوسرے روز برسرِ مجلس وہی صورت پیش آئی جو باپ بیٹے کے درمیان مشورہ سے طے پائی تھی۔ عمرو نے جب بیٹے کے ہاتھ سے طمانچہ کھایا تو بیحد مشتعل ہوا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کو قتل کئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ اہلِ مجلس نے اس کے غصہ کو فرو کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے نہ مانا آخر لڑکے کے ماموں دخل انداز ہوئے اور انھوں نے عمرو کو دھمکی دی کہ اگر تو اپنے بیٹے کو قتل کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر ڈالیں گے۔ عمرو نے یہ سن کر

انتہائی غم وغصہ کے ساتھ اہلِ مجلس کو اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ جس ملک میں ایک باپ کو اپنے بیٹے کی سخت گستاخی کی سزا دینا ناممکن ہو ایسے ملک میں رہنا عبث ہے لہٰذا میں اپنی تمام جائداد اور عمدہ باغات کو ارزاں فروخت کر دینا چاہتا ہوں تاکہ میں ایسی جگہ سے کہیں دور جا بسوں یہ دیکھ کر لوگوں نے عمرو کی جائداد کو سستے داموں خرید لیا اور وہ مع اپنے اہل وعیال کے ترک وطن کرکے چلا گیا اور اسی طرح بعض دوسرے لوگ بھی حادثہ سے قبل ہی حادثہ کے خوف سے ترک وطن کر گئے۔

ان روایات کا اسلوبِ بیان خود بتا رہا ہے کہ یہ ایک فرضی داستان ہے جو داستان گوئی کے طرز پر بنائی گئی ہے نیز مستند تاریخی روایات سے بھی ان واقعات کی تائید نہیں ہوتی اور ان واقعات کے غیر مستند ہونے کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کا سیاق ان کے خلاف صاف طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ سبا کے قبائل اور خاندانوں کا تفرق وانتشار سیلِ عرم کے حادثہ کے بعد وقوع میں آیا ہے نہ کہ واقعہ سے قبل۔

پس تعجب ہے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (مرحوم ومغفور) جیسے دوررس عالم پر کہ انھوں نے "اشاعتِ اسلام" میں سبا اور سیلِ عرم پر مفصل ومدلل بحث کرتے ہوئے کس طرح ان داستانوں کو اہم روایات کی طرح بغیر کسی نقد وتبصرہ کے بیان فرما دیا؟

غرض یہ روایات صحیح ہوں یا غلط یہ بات واضح ہے کہ سبا اپنے غرور وتکبر، عیاشانہ کاہلی وغفلت اور کفر وشرک پر اصرار وسرکشی کے سبب "سیلِ عرم" کے ذریعہ اس طرح تباہ وبرباد ہوئے کہ فنِ تعمیر اور استحکاماتِ عمارات کی تمام مہارت اکارت اور رائیگاں گئی اور وہ خود کو اس عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکے اور خدا کی مشیت پوری ہو کر رہی۔

دوسری سزا | مارب کے "بندِ آب" ٹوٹ جانے پر جب شہر مارب اور اس کے دونوں جانب کے علاقے سبز کھیتوں، خوشبودار درختوں اور عمدہ میووں اور پھلوں کے شاداب باغوں سے محروم ہو گئے تو ان بستیوں کے اکثر باشندے منتشر ہو کر کچھ شام، عراق اور حجاز کی جانب چلے گئے اور کچھ یمن کے دوسرے علاقوں میں جا بسے مگر عذابِ الٰہی کی تکمیل ہنوز باقی تھی اس لئے کہ سبا نے صرف غرور وسرکشی اور

کفر و شرک ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو نہیں ٹھکرایا تھا بلکہ ان کو یمن سے شام تک راحت رساں آبادیوں اور کارواں سراؤں کی وجہ سے وہ سفر بھی ناپسند تھا جس میں ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ سفر کی صعوبتیں کیا ہوتی ہیں اور پانی کی تکلیف اور خورونوش کی ایذا کس شے کا نام ہے اور قدم قدم پر میلوں تک دو رویہ خوشبوؤں اور پھلوں کے باغات کی وجہ سے گرمی اور تپش کی زحمت سے بھی ناآشنا تھے۔

انھوں نے ان نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے بنی اسرائیل کی طرح ناک بھوؤں چڑھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان سفر کے ارادہ سے گھر سے نکلے تو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ حالتِ سفر میں ہے یا اپنے گھر میں، وہ بھی کیا خوش نصیب انسان ہیں جو ہمتِ مردانہ کے ساتھ سفر کی ہمہ قسم کی تکالیف اٹھاتے، پانی اور خورونوش کے لئے آزار سہتے اور اسبابِ راحت و آرام کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے لذتِ سفر کا ذائقہ چکھتے ہیں، اے کاش! ہمارا سفر بھی ایسا ہو جائے کہ ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ وطن سے کسی دور دراز جگہ کا سفر کرنے نکلے ہیں اور ہم دوریِ منزل کی تکالیف سہتے ہوئے حضر اور سفر میں امتیاز کر سکیں۔

بدبخت اور ناسپاس گذار انسانوں کی یہ ناشکری تھی جس کی تمناؤں اور آرزوؤں میں مضطر ہو کر خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے تھے اور اس کے انجامِ بد سے غافل ہو چکے تھے۔

سبا نے جب اس طرح کفرانِ نعمت کی تکمیل کر دی تو اب خدائے تعالیٰ نے بھی ان کو دوسری سزا یہ دی کہ یمن سے شام تک ان کی تمام ان آبادیوں کو ویران کر دیا" جو نزدیک نزدیک مسلسل چھوٹے چھوٹے قصبوں، گاؤں، کارواں سراؤں اور تجارتی منڈیوں کی صورت میں آباد اور ان کے راحت و آرام کی کفیل تھیں اور سفر کی ہر قسم کی صعوبتوں سے ان کو محفوظ رکھتی تھیں" اور اس طرح اس پورے علاقہ میں خاک اڑنے لگی اور یمن سے شام تک نو آبادیوں کا یہ سلسلہ ویرانہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

چنانچہ قرآن عزیز کی یہ آیت اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى ہم نے ان کے (ملک) اور برکت والی آبادیوں (شام) کے

الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا قُرًی ظَاهِرَةً وَّ	درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں اور
قَدَّرْنَا فِیْهَا السَّیْرَ سِیْرُوْا	ان میں سفر کی منزلیں (کاروان سرائیں) مقرر کی تھیں
فِیْهَا لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا اٰمِنِیْنَ	(اور کہہ دیا تھا) چلو ان آبادیوں کے درمیان دن رات بےخوف
فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا	خطر (مگر) انھوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں
وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ	(منزلوں) کے درمیان دوری کر دے اور (یہ کہکر) انھوں نے
اَحَادِیْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ	خود اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ پس ہم نے ان کو کہانی بنا دیا
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ	اور ان کو پارہ پارہ کر دیا بلاشبہ اس (واقعہ) میں عبرت
صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (سبا)	کی نشانیاں ہیں صابر اور شکر گذار بندوں کے لئے۔

مورخین کہتے ہیں کہ سبا کے مقابلہ میں عرصہ دراز سے رومیوں کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح وہ بھی ہندوستان اور افریقہ کے ساتھ عربوں کی طرح براہ راست تجارت کر کے بیش بہا فائدہ حاصل کریں مگر عرب کسی طرح ان کو اس کا موقع نہیں دیتے تھے اور ان تجارتی سواحل پر قابض تھے۔ لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں رومیوں نے یکے بعد دیگرے مصر اور شام پر قبضہ کر لیا اور اب ان کو موقعہ ملا کہ وہ اپنے منصوبہ کو پورا کریں لیکن تجارتی مراکز کے لئے جو شاہراہ " امام مبین " عربوں نے بنا رکھی تھی وہ خشکی کی راہ تھی اور گذرنے والوں کے لئے عربوں سے واسطہ پڑنا لازمی تھا اور رومی ان پہاڑی راہوں کو عبور کرنے میں ویسے بھی دقت محسوس کرتے تھے اس لئے انھوں نے عربوں کے خوف سے محفوظ رہنے کے لئے یہ کیا کہ ہندوستان اور افریقہ کی تجارت کے بری راستہ کو بحری راستہ میں تبدیل کر دیا اور بحر احمر میں کشتیوں کے ذریعہ تمام مال مصر اور شام کی بندرگاہوں پر اتارنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس جدید طریق تجارت نے یمن سے شام تک سبا کی تمام نوآبادیوں کو برباد کر دیا۔ اور وہاں چند دنوں ہی میں خاک اڑنے لگی اور سبا کا یہ خاندان تتر بتر ہو گیا، کسی نے شام کی راہ لی تو کسی نے عمان کی اور کسی نے عراق کا رخ کیا تو کسی نے حجاز کا اور کوئی نجد پہنچا تو کسی نے بحرین کی راہ اختیار کی اور اہل سبا کی حکومت کا شیرازہ اس طرح بکھر گیا کہ وہ حقیقتاً ایک کہانی بن کر رہ گئے

اور "فجعلناھم احادیث" اور "مزقناھم کل ممزق" کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا۔

اگر آپ تاریخ کا بغور مطالعہ کریں گے تو یہ بات حقیقت بن کر آپ کے سامنے آجائے گی کہ "سیلِ عرم" کا واقعہ اور طریقِ سفر کی تبدیلی کی یہ صورت کہ جس کی وجہ سے یمن سے شام تک سبا کی تو آبادیاں برباد ہو کر رہ گئیں۔ زمانہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہیں اور دونوں قسم کے عذاب کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہے۔

قرآنِ عزیز نے جب اہلِ عرب کو سبا اور "سیلِ عرم" کا یہ واقعہ سنایا تو اس وقت یمن کا ہر متنفس اس حقیقت کا بہ چشمِ خود مشاہدہ کر رہا تھا اور وہ تمام خاندان بھی جو حجاز، شام، عمان، بحرین، نجد میں اس حادثہ کی بدولت پناہ گزیں ہو گئے تھے اپنے آباء و اجداد کے اس مرکز کی حالتِ زار کو دیکھ اور سُن رہے تھے حتیٰ کہ ہمدانی" جو کہ چوتھی صدی ہجری کا سیاح مورخ ہے اپنی کتاب اکلیل میں یمن کے اس حصہ کے متعلق اپنی عینی شہادت پیش کرتا ہے کہ قرآن نے "جنتان عن یمین وشمال" کہکر جن باغوں کا ذکر کیا ہے بلاشبہ آج ان کی جگہ اس قدر کثرت سے پیلو کے درخت موجود ہیں کہ اتنی کثرت کے ساتھ اور کہیں نہیں پائے جاتے اور ان ہی درختوں کے ساتھ جھاؤ اور کہیں کہیں جنگلی بیر کے درخت بھی نظر آتے ہیں اور دیدۂ بینا اور گوشِ حق نیوش کو یہ کہکر سبا کی عبرت زا داستان سناتے رہتے ہیں۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔۔۔ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو

مولانا سید سلیمان نے ارض القرآن میں ابرہہ کے زمانہ کے کتبۂ عرم کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے

> اس عصرِ تاریخی میں جب ہر غیر معاصرانہ روایت قابلِ شک و اشتباہ ہے۔ خدائے قرآن نے اپنے کلام معجز کی صداقت کا نیا سامان پیدا کر دیا یعنی اس بند کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں واقعہ سیلاب کے مشرح حالات کا کتبہ جو ایک عیسائی فاتح یمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مل گیا ہے یہ عیسائی فاتح وہی ہے جو اپنے ہاتھیوں کے بل پر کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا لیکن آج اس دشمن کعبہ کا سنگی ہاتھ کعبۂ مکرمہ کی کتابِ مقدس کی تصدیق کے لئے بلند ہے۔ [1]

---

[1] ارض القرآن ج ۱ ص ۲۵۸ - ۲۵۷ -

اس کتبہ میں اُن حالات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر ہے جو سبا کے دور میں سیلِ عرم کی وجہ سے "بندِ آب" کی شکستگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

الحاصل۔ سبا کا یہ خاندان جو وسعتِ حکومت میں یمن (جنوبی عرب) اطرافِ شام و حجاز کی نوآبادیوں (شمالی عرب) اور حبشہ (افریقہ) پر حکمراں تھا ۱۱۵ ق م کے پس و پیش حکومت سے بھی محروم ہوگیا اور اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور حبشہ پر اکسومی (سبا، خاندان نے اور شمالی عرب میں اسمٰعیلی عربوں نے اور خود یمن میں حمیری (سبا) خاندان نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔[۱]

اس جگہ یہ بات قابلِ وضاحت ہے کہ "سیلِ عرم" کا سانحہ اور حادثہ سارے یمن پر پیش نہیں آیا تھا بلکہ یمن کے دارالحکومت مارب اور اس کے اطراف میں دونوں جانب سینکڑوں میل تک اس کا تباہی خیز اثر پڑا اور اس وقت صرف وہی قبائل ترکِ وطن پر مجبور ہوئے جو ان مقامات میں آباد تھے باقی ملک اور اس کے آباد باشندے یمن ہی میں مقیم رہے البتہ جب دوسرے عذاب نے رونما ہو کر پورے یمن کو اثر انداز کر لیا تب سبا کے باقی قبائل بھی منتشر ہونے پر مجبور ہوئے اور اس طرح ان کے اس مشہور خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

یہ بات کہ "سیلِ عرم" کے حادثہ کا تمام قبائلِ یمن پر اثر نہیں پڑا تھا عرب اور غیر عرب مورخین دونوں کے یہاں مسلّم ہے۔ چنانچہ ابن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"جب "سیلِ عرم" آیا تو تمام قبائلِ سبا یمن سے منتشر نہیں ہو گئے تھے بلکہ وہی قبائل منتشر ہوئے تھے جو مارب (دارالحکومت) میں مقیم تھے اور جن کے شہر میں مشہور "مارب کا بند" تھا۔ اور عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے جو حدیث سابق میں ذکر ہو چکی ہے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ان میں سے چار قبائل شام کے علاقوں میں جا بسے اور چھ قبائل یمن ہی میں مقیم رہے اور یمن میں مقیم قبائل مذحج، کندہ انمار، اشعر تھے اور انمار کی تین شاخیں تھیں خثعم، بجیلہ اور حمیر یہی وہ سبائی قبائل ہیں جن میں سے سبا کے تشتت و انتشار کے بعد یمن کے حکمراں ملوک اور تبابعہ پیدا ہوئے تا آنکہ ان سے حبشہ کے بادشاہ نے یمن چھین لیا اور اس پر قابض ہوگیا اور پھر حمیری بادشاہ سیف بن ذی یزن نے دوبارہ

شاہِ حبشہ سے یمن کو واپس لیا اور یہ واقعہ ولادت باسعادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تھوڑے زمانہ قبل ہی پیش آیا جس کا تفصیلی ذکر ہم اپنے موقعہ پر کریں گے۔ ۵۱

اور سبا کے جو قبائل و خاندان یمن سے نکل کر ادھر اُدھر جا بسے تھے ان کی تفصیل دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

سبا کے قبائل میں سے غسانی قبائل کی ایک شاخ بُصریٰ (شام) چلی گئی اور ایک شاخ خزاعہ نے یثرب جاتے ہوئے بطن مُر (تہامہ) کو شاداب دیکھ کر وہیں قیام کر دیا اور اوس و خزرج (انصار) یثرب (مدینہ) میں مقیم ہو گئے اور بنی ازد کا ایک حصہ عمان میں اور ایک وادی سراۃ میں جا بسا۔ اور اسی طرح سبا کے یہ قبائل اقطاع و امصارِ عرب میں منتشر اور شذر و مذر (پراگندہ) ہو گئے۔ ۵۲

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

شعبی کہتے ہیں کہ غسان، شام و عراق میں منتشر ہو گئے اور انصار (اوس و خزرج) یثرب (مدینہ) میں جا بسے اور خزاعہ تہامہ (مکہ) میں اور ازدؔ عمان میں جا بسے اور آس پاس منتشر ہو کر رہنے سہنے لگے۔ ۵۳

ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں۔

عرب میں سبا کا یہ تفرق و انتشار اس درجہ مشہور اور عبرتناک سمجھا جاتا ہے کہ جب اہلِ عرب کسی قوم یا خاندان کے تفرقِ و انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں "تفرقوا ایدی سبا و تفرقوا شذر مذر" ان کا حال سبا کا سا ہو گیا وہ پارہ پارہ ہو کر رہ گئے۔ ۵۴

چند تاریخی مباحث (۱) کتبِ سیر میں مذکور ہے کہ مارب کا بند "سبا ابن یعرب" نے بنایا تھا مگر وہ اس کو پورا نہ کر سکا اور اس کے بعد اس کے بیٹے حمیر نے اس کو مکمل کیا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کو ملکہ سبا "بلقیس" نے تعمیر کرایا تھا لیکن یہ دونوں باتیں حقیقت سے بہت دور محض ظن و تخمین کی پیداوار تھیں اس لئے کہ ماہرینِ علم الآثار نے "سد" کے کھنڈرات سے یہ پتہ چلایا ہے کہ اس بندِ آب کے بنوانے والوں کے

---

۵۱ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۹۱ ۵۲ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۵ و تاریخ ج ۲ ص ۱۹۱۔ ۵۳ تفسیر ابن کثیر ص ۵۲۹ ۵۴ تفسیر ابن کثیر ص ۵۳۴۔ ۵۵ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۹۔

نام سنگی کتبوں پر کندہ اسی بند کی شکستہ دیواروں پر موجود ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس بند کو سب سے پہلے ۸۰۰ ق م میں شیع امر بتین بن سمہعلی نیوف (مکارب سبا) نے بنانا شروع کیا تھا مگر اس کے زمانہ میں تعمیر مکمل نہ ہو سکی اور اس کے بعد کے بادشاہوں نے اس کو پورا کیا۔ تبع امر کے علاوہ جو نام ان کتبوں سے پڑھے گئے وہ یہ ہیں "سمہعلی نیوف بن ذمرعلی (مکارب سبا) کرب ایل بیتن بن شیع امر (مکارب سبا) ذمر علی ذرح (ملکِ سبا) یدع ایل وتار۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سد "مکارب سبا" کے زمانہ سے شروع ہو کر "ملوکِ سبا" کے ابتدائی دور تک طویل عرصہ میں تعمیر ہو سکی ہے [۵۱]

(۲) ترمذی میں بروایت ابن عباسؓ ایک حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک سائل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سبا کسی ملک کا نام ہے یا کسی عورت کا یا کسی مرد کا؟ آپ نے فرمایا کہ ایک مرد کا نام ہے جس کی نسل سے دس قبائل ہیں ان میں سے چار شام میں سکونت رکھتے ہیں اور چھ یمن میں۔ یمنی قبائل مذحج، کندہ، ازد، اشعر، انمار، حمیر ہیں اور شامی قبائل ہیں لخم، جذام، عاملہ، غسان ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے [۵۲] اور ابنِ کثیرؒ نے اس کے مختلف طُرق روایت کو بیان کر کے بعض طرقِ روایت کو حسن قوی کہا ہے [۵۳]۔ اور ابنِ عبد البرؒ نے انسابِ عرب پر بحث کرتے ہوئے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے۔

ھذا اولی ما قیل به فی ذلك	یہ روایت ان سب اقوال سے بہتر ہے جو اس
واللہ اعلم۔ [۵۴]	سلسلہ میں کہے جاتے ہیں۔

اس روایت سے قبائلِ مسطورہ بالا کا قحطانی ہونا ثابت ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ ان میں سے متعدد قبائل کے متعلق علمارِ انساب میں سخت اختلاف ہے کہ یہ عدنانی ہیں یا قحطانی، تاہم انصار (اوس و خزرج) کے متعلق جو بلاشبہ بنی ازد ہیں تمام علمارِ انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں [۵۵]۔ اور بخاری کی وہ حدیث کہ جس سے مصنف ارض القرآن نے ان کو عدنانی ثابت کرنا چاہا ہے بقول

---

[۵۱] ارض القرآن ماخوذ مضمون از آزاد فرینچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۷۴ء۔ [۵۲] کتاب التفسیر [۵۳] تفسیر ج ۳۔ [۵۴] الانباہ ص ۱۸۔ [۵۵] الانباہ ۱۰۶۸

علامہ ابنِ حجر عسقلانی ہرگز اس کے لئے دلیل نہیں بن سکتی جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں اور نہ ہم کو کسی عالم نسب انصاری کا یہ قول نظر آیا کہ اس نے خود کو قحطانی الاصل تسلیم نہ کیا ہو، البتہ یہ ممکن ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عدنانی اسمٰعیلی ہیں اس لئے بعض انصار نے حصولِ شرف و مجد کے جذبہ میں مادری سلسلہ سے خود کو عدنانی (اسمٰعیلی) کہدیا ہو۔

یہ بیشک صحیح ہے کہ بعض عدنانی قبائل نے چونکہ یمن میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے بعض قحطانی اور عدنانی قبائل کے درمیان علماءِ انساب میں اختلاف نظر آتا ہے اور قضاعہ کے عدنانی سے قحطانی بنجانے کا عجیب قصہ تو ابنِ عبد البَر اور خود شعراءِ عرب نے بیان کیا ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنے بھانجہ خالد بن یزید بن معاویہؓ کے اس مناقشہ میں جو اس کے اور بنو امیہ کے درمیان پیش آگیا تھا خالد کے کہنے سے اول خود کو یمنی قبائل کا حلیف بنایا اور پھر یمنی الاصل (قحطانی الاصل) ہونے کے مدعی بن گئے۔ [۱]

(۳) قرآنِ حکیم نے سورۂ سبا میں سبا کی مذہبی حالت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا کے طبقۂ اولیٰ کی ہر دو شاخوں کا مذہب یا آفتاب پرستی (ستارہ پرستی) رہا ہے اور یا سچی یہودیت (دینِ موسوی) اور طبقۂ ثانیہ کی ہر دو شاخوں میں یا صنم پرستی قومی مذہب رہا ہے اور یا عیسائی و یہودیت بھی کبھی کبھی ان میں نظر آجاتی ہے، قرآن نے اصحابِ اخدود کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے اس لئے کہ ذو نواس حمیری (یہودی) یمن ہی کا بادشاہ تھا۔

(۴) اہلِ عرب اس کے قائل ہیں کہ تمام قبائلِ عرب بلا استثناء صرف دو شخصوں کی نسل سے ہیں، عدنان اور قحطان مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ توراۃ اور تاریخ ان دو سلسلوں کے علاوہ بعض دوسرے سلسلے بھی بیان کرتی ہے بلکہ بعض صحیح روایات میں بنی جرہم کا بھی ذکر موجود ہے جو ان دونوں (قحطانی اور عدنانی) سلسلوں سے الگ تیسرا سلسلہ ہے۔ پھر علماءِ انساب کے پاس کون سی دلیل ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں ان دو سلسلوں کے سوا سب معدوم ہو گئے اور تمام قبائلِ عرب ان دو ہی سلسلوں میں منحصر ہو گئے ہیں؟

[۱] الانباہ ص ۶۰ - ۵۹

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ضعیف روایت اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عمرو بن میمونؒ اور محمد بن کعب قرظیؒ سے بروایت قوی منقول ہے کہ جب وہ اس آیت کو تلاوت فرماتے "والذین من بعدھم لا یعلمھم الا اللہ" اور وہ لوگ جوان (قوموں) کے بعد ہیں ان کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا" تو ارشاد فرمایا کرتے تھے "کذب النسابون" نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔ یعنی انھوں نے سچ میں بہت کچھ جھوٹ ملا دیا ہے۔

ابن عبدالبرؒ معرفتِ علمِ انساب کو مفید علم ثابت کرتے ہوئے اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے ان حضرات کا یہ جملہ قریش کے نسب کے لئے مخصوص ہو اور ان کا مطلب یہ ہو کہ اس سلسلہ میں عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے درمیان جو کڑیاں ہیں وہ تحقیقی نہیں ہیں اور اس میں نسابین کا جھوٹ شامل ہے مگر ہمارے نزدیک اس جملہ کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ اہلِ نسب کا یہ دعویٰ کہ "وہ بنی آدم کے سلسلۂ انساب کے ماہر اور محقق ہیں اور کوئی سلسلہ ہماری نگاہِ تحقیق سے نہیں چھوٹا" صحیح نہیں ہے اور وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں "ولا یعلمھم الا اللہ" اللہ کے سوا کون اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ (انتہیٰ) [1]

ہم ابنِ عبدالبرؒ کی اس توجیہ کی حرف بہ حرف تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرب قبائل میں ایسے سلسلے موجود ہیں جو عدنانی اور قحطانی سے الگ ہیں اور اکثر علماءِ انساب ان میں تمیز کرنے سے قاصر رہے ہیں جیسا کہ ہم ابنِ کثیرؒ کے حوالہ سے ثابت کر چکے ہیں۔

چند تفسیری مباحث (۱) مفسرین کو "عَرِم" کے معنی میں بحث ہے اور وہ چند معنی بیان کرتے ہیں:- "گہرا پانی"، "وادی"، "سیلابِ عظیم"، "بندِ آب" شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ نے "سیلابِ عظیم" مراد لیا ہے فرماتے ہیں "پس بھیجی ہم نے ان پر رَو زور کی"۔ اور مصنف ارض القرآن فرماتے ہیں کہ "جس کو عربِ حجاز "سد" کہتے ہیں اسی کو عربِ یمن "عرم" کہتے ہیں" ہمارے نزدیک زیادہ صحیح اور موقع کے مناسب یہی معنی ہیں اور جبکہ لغتِ عرب میں "عرمہ" کے معنی "بندِ آب" کے آتے ہیں تو دوسرے معانی کی جانب

---

[1] القصد والامم لابنِ عبدالبر ص ۱۹۔ [2] الانباہ ص ۴۹۔

توجہ غیر ضروری ہے۔ العرمۃ۔ سدٌ یعترض بہ الوادی"۔ اس معنی کے دلچسپ اور مناسب حال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح قرآنِ عزیز میں "بندِ آب" کا ذکر ثابت ہو جاتا ہے اور دوسرے معانی اگر مراد لیئے جائیں تو ان سے صرف یہ لازم آتا ہے کہ کوئی بندِ آب ہو گا جس کو سیلاب بہا کر لے گیا۔ بندِ آب کا ذکر صراحۃً ثابت نہیں ہوتا۔

(۳) کسی خطۂ زمین میں باغوں کا ہونا گو خوش عیشی کی دلیل ہے لیکن گذشتہ تفاصیل سے یمن کے طبعی خواص اور پھر بندِ آب کے عجیب و غریب طرزِ تعمیر نے سینکڑوں میل تک مارب سے داہنے بائیں مسلسل پھلوں، پھولوں اور میووں کے بے شمار باغات نے جو صورتِ حال پیدا کر دی تھی اس کے متعلق غیر مسلم مورخوں کی شہادتیں بھی یہ بتا رہی ہیں کہ مارب اور یمن کا یہ علاقہ دنیا میں فردوسِ نظیر بن گیا تھا اور ان کے ملک کی یہ صورتِ حال خدائے تعالیٰ کے خصوصی کرم کی رہینِ منت تھی۔ اسی لئے قرآنِ عزیز نے اس کو خدا کی "نشانی" کہا ہے "لقد کان لسبأ فی مسکنہم اٰیۃ جنتان عن یمینٍ وشمالٍ"۔

(۳) ان آیات میں ہے "بلدۃٌ طیبۃٌ وربٌّ غفورٌ" شہر ہے پاک اور پروردگار ہے بخشنے والا" اور اس کے بعد ہے "فاعرضوا" پس انھوں نے خدا سے روگردانی کی"۔ ان دونوں جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پہلے مسلمان تھے اور احکامِ الٰہی کے مطیع و فرماں بردار مگر آہستہ آہستہ انھوں نے نافرمانی اور کفر اختیار کر لیا جیسا کہ اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے "ذٰلک جزینٰہم بما کفروا" تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اور کفر کے یہ دو زمانے ان پر کب طاری ہوئے تاکہ ان آیات کی تفسیر، واقعاتِ تاریخی کی روشنی میں کی جا سکے۔

اس سوال کا حل یہ ہے کہ سورۂ سبا سے قبل سورۂ نمل میں قرآنِ عزیز نے ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کے واقعات میں یہ بیان کیا ہے کہ ملکۂ سبا اور اس کی قوم پہلے آفتاب پرست اور مشرک تھی مگر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی دعوت و ارشاد پر اس نے اسلام قبول کر لیا اور تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس کے بعد بھی اپنی زندگی میں سریر آرائے سلطنت رہی اور تمام قوم اس کی مطیع و فرمانبردار

تھی۔ پس جو اصحاب بصیرت اس زمانہ کی قوموں کے مذاہب کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد ملکہ کا سلطنت پر قائم رہنا اس کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ ملکہ کے ساتھ اس کی قوم بھی ایمان لے آئی تھی۔

آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن نامہائے مبارک کے "ان جملوں کو پڑھیے جو آپ نے شاہانِ عالم کے نام دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں بھیجے ہیں" "فان تولیت فعلیک اثم الیریسیین"۔ "فان تولیت فعلیک اثم القبط" "فان تولیت فعلیک اثم المجوس"۔ "اے شاہانِ روم و ایران و مصر اگر تم نے خدا کی دعوتِ حق کا انکار کر دیا تو تمہاری رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہاری گردن پر رہیگا" یہ آپ نے کیوں ارشاد فرمایا؟ صرف اس لئے کہ قدیم شخصی حکومتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کی قومی حکومتوں میں جو مذہب بادشاہ کا ہوتا تھا وہی پوری قوم کا مذہب بن جاتا تھا اور بعض اقوام میں تو بادشاہ خدا کا مظہر سمجھا جاتا تھا لہذا کسی بات کو اس کا قبول کر لینا گویا رعایا کے لئے خدا کے حکم کی برابر تھا۔

بہر حال سنہ ۹۵۰ ق م میں سبا نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا اور صدیوں تک انھوں نے اس امانتِ الٰہی کو سینہ سے لگائے رکھا لیکن گذشتہ قوموں کی طرح جب انھوں نے اس سے روگردانی شروع کی اور دوبارہ شرک اختیار کیا تب خدا کے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں آکر ان کو رشد و ہدایت کی جانب متوجہ کیا، غالباً یہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو بذاتِ خود یا اپنے نائبوں کے ذریعہ ان کو ہدایت کی جانب بلاتے رہے ہیں مگر انھوں نے عیش و عشرت، دولت و ثروت اور حکومت و شوکت کے نشہ میں کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ بنی اسرائیل کی طرح خدا کی نعمتوں کو ٹھکرانے لگے تب حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے خدا کی جانب سے سیلِ عرم اور آبادیوں کی تباہی کا عذاب آیا اور اس نے سبا کے اس خاندان کو پارہ پارہ کر دیا۔

ایک یونانی مورخ تھیوفرستینس جو حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً تین سو بارہ برس پہلے اور سبا کا معاصر تھا لکھتا ہے۔

"یہ ملک سبا سے متعلق ہے جو بخورات کی بڑی حفاظت کرتے ہیں ان بخورات کا ذخیرہ آفتاب کے

ہیکل میں لایا جاتا ہے جو اس ملک میں نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ۵۱

اور علماءِ اسلام میں سے ماہرین علم الآثار نے دوسری یا تیسری صدی ہجری میں یمن کے ایک کتبہ میں پڑھا تھا۔

ھذا ما بنی شمر یرعش لبیدۃ الشمس ۵۲۔ یہ شمر یرعش بادشاہ نے سورج دیوی کے لئے بنایا ہے۔

(۴) سورۂ سبا کی ان ہی آیات میں ہے:۔ وبین القری التی بارکنا فیھا" مفسرین نے ان برکت والی بستیوں کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کئے ہیں ان میں سے صحیح قول یہ ہے کہ اس سے شام کی بستیاں مراد ہیں اس لئے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ ان ہی بستیوں پر صادق آتا ہے جن کا تعلق یمن سے شام تک تجارتی شاہراہ سے تھا۔ مجاہد، حسن، قتادہ، سعید بن جبیر، ابن زید (رحمہم اللہ) وغیرہ یہی تفسیر کرتے ہیں۔

یعنی قری الشام یعنون انھم کانوا یسیرون من الیمن الی الشام فی قری ظاھرۃ متواصلۃ ۵۳

برکت والی بستیوں سے شام کی بستیاں مراد ہیں یعنی وہ یمن سے شام تک امن واطمینان کے ساتھ ان بستیوں میں ہوکر گذرتے ہیں جو اسی غرض سے قریب قریب بنائی گئی ہیں (کہ ان کا سفر آسان اور خوشگوار رہے)۔

اور ابن کثیر "قری ظاھرۃ" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ای بینۃ واضحۃ یعرفھا المسافرون یقیلون فی واحدۃ و یبیتون فی اخری۔ ۵۴

یعنی ایسی بستیاں جو مسافروں (تاجروں اور سیاحوں) کے لئے قریب قریب بنائی گئی تھیں اور جن کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے کہ ایک بستی میں دوپہر آرام سے گذاری تو شب باشی کیلئے دوسری بستی میں پہنچ گئے

(۵) مفسرین (رحمہم اللہ) جب سبا کی ان آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو "سیل عرم" اور "قری ظاھرۃ" یعنی یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سبا کی نوآبادیات کی بربادی دونوں ہی کا تذکرہ کرتے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ تاریخ کے اس پہلو پر نہیں ہے جو رومیوں کے تجارتی راہ بدل دینے سے سبا کو

---

۵۱ ارض القرآن ج ۲ ص ۱۶۳ ماخوذ از ہیرن کی ہسٹاریکل ریسر چیز ج ۱ ص ۳۵۔ ۵۲ تاریخ حمزہ اصفہانی ص ۱۱۰ کلکتہ
۵۳ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۳۔ ۵۴ ارض القران ج ۱ ص ۲۷۴۔

پیش آیا اور خود سبا کی اس مانگ پر "ربنا باعد بین اسفارنا" خدا نے ان کو اس حالت میں بدل دیا کہ وہ تلاش معاش کے لئے دیگر قبائل عرب کی طرح سفر کے مصائب جھیلتے پھریں، اور ان کو عبرت کی کہانی بنا دیا اور پارہ پارہ کر دیا۔ مگر ہم گذشتہ سطور میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ چونکہ بری تجارتی شاہراہ سے بحری راہ کی وہ تبدیلی کہ جس کے نتیجہ میں سبا کی نوآبادیاں بہت جلد برباد ہوگئیں اور سبا کا یہ خاندانِ حکومت پارہ پارہ ہوگیا تقریباً اس ہی زمانہ میں پیش آیا جو زمانہ "سیلِ عرم" کا تھا خواہ تبدیلی راہ کی داغ بیل اس سے بہت پہلے یونانیوں کے ہاتھوں پڑی ہو۔ پس مفسرین اگرچہ "قریٰ ظاہرۃ" کی بربادی میں تجارتی راہ کی تبدیلی کا تذکرہ نہیں کرتے مگر یہ وہ بھی مانتے ہیں کہ "سیلِ عرم" اور یمن سے شام تک کی سبائی آبادیوں کی بربادی دو جدا جدا معاملے ہیں یہ نہیں ہے کہ بندِ آب کے ٹوٹ جانے سے یہ تمام نوآبادیاں بھی برباد ہوگئی تھیں جیسا کہ ہم ابنِ کثیر سے سابق میں نقل کر چکے ہیں کہ سیلِ عرم کے بعد بھی مارب کے علاوہ یمن کے دوسرے حصوں میں قبائلِ یمن آباد تھے۔ لہٰذا قرآن کا فیصلہ مفسرین کے علی الرغم نہیں ہے جیسا کہ مصنف ارض القرآن نے سمجھا ہے۔[۵]

نتائج وعبر | (۱) اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عزیز میں موعظت ونصیحت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں۔

(الف) "تذکیر بآلاء اللہ" یعنی خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جن نعمتوں کی ارزانی فرمائی ہے ان کو یاد کر کے خدا کے احکام کی پیروی کی جانب متوجہ کرنا سورۂ اعراف میں ارشاد ہے۔

فاذکروا آلاء اللہ لعلکم تفلحون	پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو کہ تم فلاح پاؤ
فاذکروا آلاء اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔	پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے مت پھرو۔

(ب) "تذکیر بایام اللہ" یعنی ان گذشتہ قوموں کے حالات بیان کر کے نصیحت وعبرت دلانا جنھوں نے یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت وانقیاد کی وجہ سے کامرانی اور فلاحِ دارین حاصل کی اور یا سرکشی وطغیان کی انتہا پر پہنچ کر ہلاکت وتباہی مول لی اور عذابِ الٰہی کی مستوجب قرار پائیں۔ یا بالفاظ دیگر قوموں کے عروج وزوال کو پیش کر کے سامانِ عبرت مہیا کرنا۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

[۵] ج ۲ ص

وَذَکِّرْھم بِاَیّام اللہ اور اے پیغمبر! ان کو نصیحت کیجئے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ یاد دلا کر۔

(ج) "تذکیر بآیات اللہ" یعنی مظاہرِ قدرت کی جانب توجہ دلا کر خالقِ کائنات کی ہستی اور اس کی وحدت کا اعتراف کرانا اور تصدیقِ حق کے لئے اپنی نشانیوں (معجزات آیاتِ قرآنی) کے ذریعہ چشمِ بصیرت کرنا۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے۔

وکم من اٰیۃ فی السمٰوات و الارض یمرّون علیھا وھم عنھا معرضون۔	اور زمین اور آسمانوں میں خدا کے بہت سے نشانات ہیں کہ جن پر وہ بے توجہی کے ساتھ گذر جاتے ہیں اور پرواہ بھی نہیں کرتے۔

(د) "تذکیر بما بعد الموت" یعنی برزخ اور قیامت کے حالات سنا کر عبرت دلانا۔ سورۂ ق میں ہے

فذکّر بالقراٰن من یخاف وعید۔	پس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو اس شخص کو جو خدا کی وعید یعنی بعد الموت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

پس قومِ سبا کا یہ واقعہ "تذکیر بایام اللہ" سے تعلق رکھتا ہے اور ہم کو یہ عبرت دلاتا ہے کہ جب کوئی قوم عیش وراحت اور ثروت وطاقت کے گھمنڈ میں آ کر نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اول خدائے تعالیٰ اس کو مہلت دیتا اور اس کو راہِ راست پر لانے کے لئے اپنی حجت کو آخری حد تک پورا کرتا ہے، پس اگر وہ اس پر بھی قبولِ حق کی دشمن رہتی اور بغاوت وسرکشی کے اس اعلیٰ معیار پر پہنچ جاتی ہے کہ اس کو خدا کی نعمتیں اور عطا کردہ راحتیں بھی ناگوار گذرنے لگتی ہیں اور وہ ان کو ٹھکرانے لگتی ہے تو پھر قانونِ گرفت اپنا فولادی پنجہ آگے بڑھاتا اور ایسی بدبخت قوم کو پارہ پارہ کر دیتا اور ہلاکت وبربادی کے چرخ پر اتار دیتا ہے اور ان کا سارا کرّ وفر دنیا کے سامنے صرف ایک کہانی بن کر رہ جاتا ہے "سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المجرمین"۔ (اعاذنا اللہ من ذلک)

اصحابُ الاخدود (یا) قومِ تُبّع

۵۲۵ء

اخدود ۔ اصحابِ اخدود اور قرآن حکیم ۔ واقعہ کی تفصیلات ۔ تنقید و تبصرہ ۔ تُبّع ؟ عرب کی دو حکایتیں ۔ چند تفسیری نکات ۔ بصائر و عبر ۔

اخدود ؟ "خد یا اخدود" کے معنی گڑھے، کھائی اور خندق کے ہیں۔ یہ مفرد ہے اور اس کی جمع "اخادید" آتی ہے، چونکہ زیر بحث واقعہ میں کافر بادشاہ اور اس کے امراء و اعیانِ سلطنت نے خندقیں اور گڑھے کھدوا کر اور ان کے اندر آگ دھکا کر عیسائی مومنوں کو ان میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا اس نسبت سے ان کافروں کو "اصحاب اخدود" کہا جاتا ہے۔

اصحاب اخدود اور قرآنِ حکیم اصحابِ اخدود کا تذکرہ قرآنِ حکیم میں سورۂ بروج میں کیا گیا ہے اور اجمال و اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر پر اکتفا کیا گیا ہے جو رشد و ہدایت کے لئے باعثِ موعظت و بصیرت ہو۔

وہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ایک مقام پر حق و باطل کا معرکہ پیش آیا، ایک جانب خدا کے مومن بندے تھے جن کے پاس اگرچہ مادی قوت و طاقت نہیں تھی اور وہ اس لحاظ سے ضعیف و کمزور تھے مگر ایمان اور حق و صداقت کی قوت اور خدا کے نام پر ایثار و فداکاری کی طاقت کے مالک تھے، دوسری جانب ایمان باللہ اور قبولِ حق سے محرومی تھی مگر مادی شوکت و صولت اور قاہرانہ طاقت کی فراوانی تھی۔ ان حالات میں کافر و مشرک طاقت نے مومنوں کی ایمانی قوت اور قبولِ حق کی طاقت کو دعوتِ مبارزت دی کہ یا وہ ایمان باللہ کو ترک کر کے شرک و کفر پر واپس آجائیں ورنہ دنیا سے فنا ہو جانے کے لئے تیار ہو جائیں، مومنینِ صادقین نے اس دعوت مبارزت (چیلنج) کو ایمانی جرأت کے ساتھ قبول کیا۔ اور ایمان باللہ کی روشنی سے نکل کر شرک و کفر کی تاریکی میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔

یہ دیکھکر کافر جماعت کی جانب سے حاکمانہ طاقت اور قاہرانہ جبروت کے ساتھ شہر کے مختلف حصول میں خندقیں کھودی جارہی ہیں، خندقوں کے اندر آگ دہک رہی ہے، شعلے بھڑک رہے ہیں اور زمین کا اکثر حصہ کرۂ نار بنا ہوا ہے، اب مومن جماعت کے غیور اور فداکار انسان کشاں کشاں لائے جارہے ہیں وہ جگہ جگہ خندقوں کے دہانوں پر کھڑے کردیئے گئے ہیں اور کفر و شرک اپنی مادی قوت کے بل پر کہہ رہا ہے کہ یا مجھ کو قبول کرو ورنہ ..... بھڑکتی ہوئی آگ اور دہکتے ہوئے گڑھوں کی نذر کردیئے جاؤ گے یہ سن کر مومن جماعت کہتی ہے جہنم کی آگ کے مقابلہ میں تمہاری آگ کا یہ عذاب ایک کھیل ہے اسلئے ایمان باللہ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں بخوشی اس کو قبول کرتا ہے مگر شرک و کفر کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرسکتا، کفر و شرک کی طاقت یہ سن کر لاجواب ہوجاتی مگر غیظ و غضب میں آکر فداکارانِ توحید کو زندہ نذرِ آتش کردیتی ہے اور اس طرح حق کو فتح و کامرانی اور باطل کو شکست و ناکامی ہوجاتی ہے کیونکہ جو دنیا والوں کی نظر میں خندقوں کے اندر دہکتی آگ میں جلادئے گئے وہ جلے اور مرے نہیں بلکہ زندۂ جاوید بن کر ابدی جنت اور سرمدی بہشت سے نوازے گئے اور جو اپنی دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر نکوکار انسانوں پر بجھ جانے اور فنا ہوجانے والی آگ دہکا رہے تھے وہ ابدی اور دائمی آگ "جہنم" کے مستحق قرار پائے، انھوں نے دنیا میں آگ کی بھٹی روشن کی اور مومنین صادقین کو اس کا ایندھن بنایا، خدائے تعالیٰ نے عالمِ آخرت میں ایک ہولناک بھٹی (جہنم) روشن کر رکھی ہے جس کا ایندھن کافر و مشرک ہوں گے، جابر و ظالم ہوں گے، ان کی بھٹی کو بہ عجلت یا بہ دیر بجھ جانا ہے فنا ہوجانا ہے لیکن خدا کی دہکائی ہوئی بھٹی کو خلود اور ہمیشگی حاصل ہے وہ نہ بجھے گی اور نہ فنا ہوگی۔ کفر و شرک نے دنیا کی طاقت پر گھمنڈ کیا مگر اس کا نتیجہ "عذاب الحریق" اور "عذابِ جہنم" ہے اور ایمان باللہ نے خدا کی طاقت پر بھروسہ کیا تو اس کا نتیجہ "الفوز الکبیر" اور "جنت تجری من تحتہا الانہار" کی صورت میں ظاہر ہوا۔

غرض سورۂ بروج میں یہ واقعہ معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ اس طرح مذکور ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ	قسم ہے آسمان کی جس میں بُرج ہیں اور اس دن کی
الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝ قُتِلَ	جس کا وعدہ ہے اور اُس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور
اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ	اس دن کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں، مارے گئے
الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ	کھائیاں کھودنے والے آگ ہے بہت ایندھن والی جب
عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝	وہ اس پر بیٹھے، اور جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے ساتھ
وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ	اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اور ان سے بدلا نہیں لیتے
الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ	تھے مگر صرف اس بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر جو
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ وَاللّٰهُ عَلٰى	زبردست ہے تعریفوں کا مستحق ہے، جس کا راج ہے
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا	آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا	بیشک جو ایمان سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں
فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ	کو پھر توبہ نہ کرے تو ان کے لئے عذاب ہے دوزخ کا اور
الْحَرِيْقِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	ان کے لئے عذاب ہے آگ میں جلنے کا، بیشک جو لوگ
الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ	یقین لائے (اللہ پر) اور انھوں نے بھلائیاں کیں ان
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۝ ذٰلِكَ الْفَوْزُ	کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں یہ ہے
الْكَبِيْرُ ۝ (الآیۃ) البروج	بہت بڑی کامرانی۔

واقعہ کی تفصیلات مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں متعدد واقعات نقل کئے ہیں مگر ان میں سے دو زیادہ مشہور ہیں ایک کا ذکر امام احمدؒ نے مسند میں، امام مسلم نے صحیح میں اور نسائی و ترمذی نے سُنن میں کیا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت صہیب رومی فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' گذشتہ زمانہ میں ایک بادشاہ تھا اس کے دربار میں ایک جادوگر تھا جب وہ بہت بوڑھا ہوگیا تو ایک روز اس نے بادشاہ سے کہا: میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں اور موت کا وقت قریب ہے اس لئے میری

خواہش ہے کہ آپ ایک فہیم وزیرک لڑکا میرے حوالہ کردیں تاکہ میں اس کو اپنا یہ فن (سحر) سکھا کر اپنی زندگی ہی میں کامل کردوں چنانچہ بادشاہ نے ایک لڑکے کو اس کے سپرد کردیا اور اس نے ساحر سے سحر کی تعلیم شروع کردی۔ بادشاہ کے محل اور ساحر کے مکان کے درمیان ایک راہبؒ کی کٹی تھی ایک مرتبہ لڑکا اس راہب کے پاس چلا گیا اور اس کی باتوں اور اس کے طریقوں کو دیکھکر بہت مسرور ہوا اور اس کے پاس آنے جانے لگا۔ یہاں دیر ہونے لگی تو ساحر اور بادشاہ مقررہ آمدورفت میں تاخیر کرنے پر برافروختہ ہوئے۔ لڑکے نے راہب سے اس کی شکایت کی۔ راہب نے کہا کہ اس معاملہ کے مخفی رکھنے کی صرف یہ صورت ہے کہ جب بادشاہ باز پرس کرے تو یہ عذر کردینا کہ ساحر کے یہاں تاخیر ہوگئی اور جب ساحر ناراض ہو تو یہ کہدینا کہ بادشاہ کے پاس تاخیر ہوگئی۔

غرض یہ سلسلہ عرصہ تک یوں ہی جاری رہا کہ ایک مرتبہ لڑکے نے دیکھا کہ راہ میں بہت ہیبتناک اور عظیم الجثہ درندہ لوگوں کی راہ روکے ہوئے ہے اور کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کے سامنے سے گذر جائے۔ لڑکے نے سوچا کہ یہ بہترین وقت ہے اس بات کا کہ میں جانچ کروں آیا ساحر کا مذہب سچا ہے یا راہب کا (دین)؟۔ یہ سوچ کر اس نے ایک پتھر اٹھایا اور کہنے لگا "خدایا! اگر تیرے نزدیک ساحر کے مقابلہ میں راہب کا دین سچا ہے تو میرے اس پتھر سے تو اس جانور کو ہلاک کردے"۔ یہ کہکر اس نے جانور کو پتھر مارا، پتھر کا لگنا تھا کہ وہ وہیں ہلاک ہوگیا۔ لڑکا چل دیا اور راہب سے جاکر سارا ماجرا کہہ سنایا راہب نے کہا: صاحبزادے! تم مجھ پر فضیلت لے گئے مجھے ڈر ہے کہ تم آزمائش میں ڈالے جاؤگے دیکھو وہ وقت آئے تو میرا ذکر نہ کرنا۔ لوگوں نے لڑکے کی اس جرأت کو دیکھکر چرچا کیا اور کہنے لگے کہ اس کو تو عجیب وغریب علم آتا ہے یہ سن کر اس کے پاس اندھے اور جذامی آنے لگے اور انھوں نے کہا کہ اپنے علم کے زور سے ہم کو اچھا کر اور وہ خدا کے فضل سے اچھا کردیتا تھا۔ بادشاہ کا ایک درباری مصاحب نابینا ہوگیا تھا اس نے جو لڑکے کا چرچا سنا تو تحفے تحائف کا بہت بڑا سامان لے کر اس کے پاس آیا اور تحفے پیش کرتے ہوئے بینا کردینے کی درخواست کی لڑکے نے جواب دیا میں کچھ نہیں ہوں اور نہ مجھ میں

ؒ حق پرست عیسائی عابد۔

یہ طاقت ہے بلکہ شافیٔ مطلق تو خدائے واحد ہے پس اگر تو ایمان لے آئے اور اس واحد و یکتا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرے تو میں ضرور تیری شفاء کے لئے دعا کروں گا، درباری یہ سن کر خدائے واحد پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شفاء عطا فرمائی اور وہ بینا ہوگیا۔ اگلے دن جب وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے نابینا کو بینا پایا، تب بادشاہ نے سوال کیا کہ اپنے بینا ہونے کی حقیقت بیان کر اس نے جواب دیا "میرے رب نے مجھ کو شفا بخشدی" بادشاہ نے کہا تیرا رب تو میں ہوں میں نے تجھ کو اچھا کر دیا؟ درباری نے جواب میں کہا "نہیں۔ تیرے اور میرے اور کل جہان کے پروردگار نے اچھا کر دیا" بادشاہ نے (غصہ میں آکر) کہا "کیا میرے سوا بھی کوئی تیرا رب ہے؟" درباری نے کہا "جی ہاں۔ اللہ تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے" تب بادشاہ نے اس کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا آخر اس نے لڑکے کا ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا "بیٹا! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو سحر کے ذریعہ سے اندھوں کو بینا اور مبروص اور جذامی کو شفا دیتا ہے؟" لڑکے نے کہا مجھ میں یہ طاقت کہاں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے شفاء دینے سے شفایاب ہوتے ہیں" بادشاہ نے کہا "کیا میرے علاوہ بھی تیرا کوئی اور رب ہے؟" لڑکے نے کہا "وہ خدا جو واحد و یکتا ہے تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے" تب بادشاہ نے اس کو بھی عذاب میں مبتلا کرنا شروع کر دیا آخر اس نے راہب سے متعلق تمام واقعہ کہہ سنایا۔ بادشاہ نے راہب کو بلایا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ دینِ حق سے پھر جائے مگر راہب نے کسی طرح اس کو قبول نہیں کیا تب بادشاہ نے اس کے سر پر آرہ چلوا دیا اور اس طرح اس کو شہید کر ڈالا۔ اب لڑکے سے کہا کہ تو راہب کے دین سے پھر جا لڑکے نے بھی صاف انکار کر دیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی پر لیجا کر وہاں سے گرا دو کہ پاش پاش ہو جائے جب سرکاری آدمی لڑکے کو پہاڑ پر لے کر چڑھے تو لڑکے نے دعا کی "الٰہی! تو ان لوگوں کے مقابلہ میں میرے لئے کافی ہو جا" چنانچہ اسی وقت پہاڑ زلزلہ میں آگیا اور سرکاری آدمی گر گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح و سالم بچ کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہو گیا، بادشاہ نے یہ دیکھا تو کہا کہ تیرے ساتھ والے کہاں گئے لڑکے نے کہا خدا نے ان کے مقابلہ میں میری

مدد کی تب بادشاہ نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو لیجاؤ اور دریا میں لیجا کر غرق کردو۔ سرکاری آدمی جب اس کو دریا کے بیچ میں لے کر پہنچے تو لڑکے نے پھر وہی دعا کی "خدایا! ان سے مجھ کو نجات دے"۔ فوراً ہی دریا میں جوش آیا اور وہ سب غرق ہو گئے اور لڑکا پھر بچ گیا اور صحیح و تندرست بادشاہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے پھر وہی سوال کیا اور لڑکے نے پھر وہی جواب دیا اور اس مرتبہ وہ کہنے لگا "بادشاہ! اس طرح تو ہرگز ہرگز مجھ پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا البتہ جو ترکیب میں بتاؤں اگر اس کو اختیار کرے تو بیشک تو مجھ کو قتل کر سکتا ہے"۔ بادشاہ نے لڑکے سے وہ ترکیب دریافت کی۔ لڑکے نے کہا "تو شہر کی تمام مخلوق کو بلند جگہ پر جمع کر جب سب جمع ہو جائیں تو اس وقت مجھ کو درخت پر سولی دینا اور میرے ترکش سے تیر لے کر اور یہ پڑھ کر میرے سینہ پر مارنا "بسم اللہ رب الغلام" اللہ کے نام پر جو اس لڑکے کا پروردگار ہے" تب میں مر سکتا ہوں"۔ بادشاہ نے لڑکے کے قول پر عمل کیا اور جب تمام شہر جمع ہو گیا تو لڑکے کو سولی پر لٹکا کر اور لڑکے کی بتائی ہوئی عبارت پڑھ کر اس کے تیر مارا اور لڑکا تیر کھا کر جان بحق ہو گیا۔ مخلوق نے یہ دیکھا تو سب نے یکدم بآواز بلند نعرہ لگایا "امنا برب الغلام۔ امنا برب الغلام۔ ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے" اور سب مسلمان ہو گئے۔ درباری کہنے لگے "بادشاہ! جس بات کا تجھ کو خوف تھا آخر وہی ہو کر رہی اور یہ تمام رعایا مسلمان ہو گئی"۔ بادشاہ یہ دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ شہر کے ہر ایک محلہ اور گلی کوچہ میں خندقیں کھودو اور ان میں خوب آگ دہکاؤ اور پھر ہر محلہ کے لوگوں کو جمع کرو اور ان سے کہو کہ وہ اس دین سے باز آ جائیں جو باز آ جائے اس کو چھوڑ دو اور جو انکار کرتا جائے اس کو دہکتی آگ میں ڈالتے جاؤ۔ لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے اور دینِ حق سے باز نہ رہنے کا اقرار کرتے اور دہکتی آگ میں بخوشی ڈالے جاتے تھے اور اس جان گسل اور ہولناک نظارہ کو بادشاہ اور اس کے مصاحبین مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت لائی گئی جس کی گود میں شیرخوار بچہ تھا۔ عورت بچہ کی محبت میں جھجکی فوراً بچہ نے کہا "ماں! صبر سے کام لے اور بے خوف خندق میں کود جا اس لئے کہ بلاشبہ تو حق پر ہے اور یہ ظالم باطل پر ہیں"۔ ؎۱

۱؎ مسلم۔ نسائی۔ ترمذی۔ مسند احمد۔

اور دوسرا واقعہ صاحب سیرۃ محمد بن اسحٰق نے بہ سلسلۂ سند محمد بن کعب سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ شام اور حجاز کے درمیان جو بستی نجران کے نام سے مشہور ہے اس کے باشندے بت پرست اور مشرک تھے اور ان کے قریب کی آبادی میں ایک ساحر رہتا اور وہ نجران کے لڑکوں کو سحر کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد نجران اور ساحر کی بستی کے درمیان ایک راہب آکر خیمہ زن ہوا وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اس کا نام فیمون تھا، نجران کے جو لڑکے ساحر سے سحر کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان میں ایک لڑکا عبداللہ بن تامر بھی تھا ایک روز عبداللہ راہب کے خیمہ میں چلا گیا راہب نماز میں مشغول تھا، عبداللہ کو راہب کی نماز اور طریق عبادت بہت پسند آیا اور اس کے پاس آنے جانے لگا اور اس سے اس کے دین کو سیکھنا شروع کر دیا اور ایمان لے آیا اور راہب سے مسیحی مسیحیت کی تعلیم حاصل کر کے آہستہ آہستہ عالم دین بن گیا۔ اب اس نے راہب سے یہ اصرار کیا کہ مجھکو اسم اعظم کے متعلق کچھ بتائے مگر راہب یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ برادر زادہ! مجھے یہ خوف ہے کہ تو اس کو برداشت نہ کر سکے گا کیونکہ میں تجھ کو کمزور پاتا ہوں، لڑکا خاموش ہو گیا۔ یہاں تو یہ سلسلہ جاری تھا، اور ادھر عبداللہ کا باپ تامر یہ سمجھتا رہا کہ میرا لڑکا ساحر سے سحر سیکھ رہا ہے۔ کچھ دن خاموش رہ کر لڑکے سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے یقین کر لیا کہ راہب بخل کر رہا ہے اور بتانا نہیں چاہتا۔ یہ سوچ کر اس نے تیروں کا مٹھا لیا اور ہر ایک تیر پر خدا کا ایک ایک نام لکھا اور پھر آگ روشن کی اور ایک ایک تیر کو اس میں ڈالنا شروع کیا، تیر آہستہ آہستہ آگ کی نذر ہوتے اور جلتے رہے مگر ایک تیر جب آگ میں پہنچا تو فوراً اُچھل کر دور جا گرا، لڑکا سمجھ گیا کہ اس تیر پر اسم ذات کندہ ہے یہی اسم اعظم ہے اور اس کے بعد راہب کو سارا قصہ کہہ سنایا، راہب نے سنا تو عبداللہ کو نصیحت کی کہ اس کو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھنا عبداللہ نے اس کو دینِ حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا، وہ جس کسی کو مریض پاتا تو اس سے یہ کہتا کہ اگر تو خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مومن بن جائے تو میں تیرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں کہ وہ تجھ کو تندرست کر دے اور جب وہ شخص سچے دل سے ایمان لے آتا تو یہ دعا کرتا اور مریض چنگا ہو جاتا شدہ شدہ یہ بات نجران کے بادشاہ تک پہنچی اس نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تو نے میری مملکت

میں فساد مچا دیا اور میرے اور میرے باپ دادا کے دین کی مخالفت شروع کردی اس لئے اب تیری سزا یہ ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے۔

لڑکا کہنے لگا: بادشاہ! میرا قتل تیری قدرت سے باہر ہے۔ بادشاہ نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دو، سرکاری آدمیوں نے اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیا مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو صحیح سالم رکھا اور وہ بادشاہ کے پاس واپس آگیا، اب بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو دریا میں لیجا کر غرق کر دو لیکن وہ دریا میں پھینک دیئے جانے کے باوجود غرق نہ ہوا اور اس کو مطلق کوئی گزند نہیں پہنچا تب لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ اگر تو واقعی مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تو خدائے واحد کا نام لے کر مجھ پر حملہ کر تو میں مارا جا سکتا ہوں، بادشاہ نے خدائے واحد کا نام لیکر لڑکے پر حملہ کیا تو لڑکا جاں بحق ہو گیا مگر ساتھ ہی عذابِ الٰہی نے بادشاہ کو بھی اسی جگہ ہلاک کر دیا۔

اہلِ شہر نے جب لڑکے اور بادشاہ کے درمیان جنگ کا یہ نظارہ دیکھا تو وہ سب صدق دل سے خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مشرف باسلام ہو گئے اور انھوں نے سچائی کے ساتھ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور انجیل کے احکام کی پیروی کو اپنا دین بنا لیا چنانچہ نجران میں نصرانیت کے حقیقی اور سچے دین کی بنیاد اسی واقعہ سے پڑی۔

نجران میں عیسائیت کی ترویج اور لڑکے اور راہب کے واقعہ کا تذکرہ یہودی المذہب شاہِ یمن، ذونواس تک بھی پہنچا، اس نے سنا تو سخت اشتعال میں آگیا اور لشکرِ جرار لے کر نجران پہنچا اور تمام شہر میں منادی کرا دی کہ کوئی شخص عیسائیت پر قائم نہیں رہ سکتا یا تو وہ یہودیت قبول کرے ورنہ مرنے کے لئے طیار ہو جائے، اہلِ نجران کے قلب میں عیسائیت اس درجہ گھر کر چکی تھی کہ انھوں نے مرجانا قبول کیا مگر عیسائیت سے منہ نہ موڑا، ذونواس نے یہ دیکھا تو غیظ و غضب میں آگیا اور حکم دیا کہ شہر کی گلیوں اور شاہراہوں میں خندقیں اور کھائیاں کھودی جائیں اور ان میں آگ دہکائی جائے جب لشکریوں نے تعمیل کر دی تو اس نے شہریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ جو شخص یہودیت قبول کرنے سے انکار کرتا جائے مرد ہو یا عورت یا بچہ اس کو زندہ آگ میں ڈالدو چنانچہ اس حکم کے مطابق بیس ہزار کے قریب مظلوم

انسانوں کو جامِ شہادت پینا پڑا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ بروج میں کیا ہے۔ "قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ" (الآیہ)۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد ابن اسحٰق کہتا ہے کہ ذونواس، یمن کا مشہور بادشاہ ہے اس کا اصل نام زرعہ تھا مگر سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد یوسف ذونواس کے نام سے شہرت پائی اس کے باپ کا نام تبان اسعد تھا اور ابوکرب کنیت رکھتا تھا، یمن کے ان بادشاہوں کا لقب "تبع" تھا اس لئے کتبِ تاریخ میں یہ خاندان تبابعۂ یمن کہلاتا ہے، ابوکریب وہ پہلا "تبع" ہے جس نے بت پرستی چھوڑ کر یہودیت کو قبول کر لیا تھا، اس نے مدینہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا مگر بنی قریظہ کے دو یہودی علماء کی تلقین پر سچے دین موسوی کو قبول کر کے مدینہ سے واپس چلا آیا اور پھر مکہ معظمہ پہنچ کر کعبہ پر غلاف چڑھایا اور دونوں یہودی علماء کو یمن ساتھ لے آیا، انھوں نے یمن میں یہودیت کی تبلیغ کی اور آہستہ آہستہ اہلِ یمن نے یہودیت قبول کر لی۔

الحاصل۔ ذونواس نے ایک دن میں نجران کے بیس ہزار حق پرست انسانوں کو شہید کر دیا مگر ان میں سے ایک شخص دوس ذوثعلبان کسی طرح جان بچا کر نکل بھاگا اور شام میں مقیم قیصرِ روم کے دربار میں پہنچ کر نجران کے حادثہ کی ہوشربا داستان کہہ سنائی اور احتجاج کیا۔ قیصر نے فوراً حبشہ کے بادشاہ "نجاشی" کو لکھا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے ذونواس سے اس ظلم کا انتقام لے۔ نجاشی نے اس پر چڑھائی کر دی اور تھوڑے سے ہی عرصہ بعد اس کو شکست دے کر تمام یمن پر قبضہ کر لیا۔ ذونواس نے دریا کے راستہ فرار ہونے کی کوشش کی مگر غرق ہو گیا اور اس طرح تقریباً ستر سال تک یمن نصاریٰ کے زیرِ حکومت رہا، اس کے بعد حمیری خاندان کے ایک رئیس سیف بن ذی یزن نے کوشش کی کہ اپنے خاندان کے زیرِ نگیں ملک پر دوبارہ قبضہ کرے چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کسریٰ فارس سے مدد طلب کی، کسریٰ نے حکم دیا کہ مملکت میں جس قدر بھی قیدی ہیں ان کو رہا کر کے اور ان کی فوج بنا کر سیف بن ذی یزن کی مدد کی جائے اور سیف نے سات سو ایرانی اور باقی اپنی فوج کی مدد سے یمن پر حملہ کیا اور نصاریٰ کے

ہاتھ سے یمن کو آزاد کرالیا۔ [1]

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نجران کا بادشاہ بت پرست تھا۔ پس اگر عیسائی راہب کے ذریعہ نجران میں عیسائیت پھیل گئی تو ذونواس کو جو کہ یہودی المذہب تھا اس درجہ طیش کیوں آیا؟ اس کا جواب یورپین مورخین یہ دیتے ہیں کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت سیاسی اور تجارتی صورتِ حال ایسی بن گئی تھی کہ رومی (عیسائی) اور حبشی ایک فریق تھا اور حمیری (یہودی) اور ایرانی دوسرا فریق تھا اور دونوں میں زبردست رقابت قائم تھی اس لئے ذونواس نجران میں عیسائیت کو برداشت نہ کرسکا۔

ہم اس میں اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ تاریخ اس بات کو بھی ثابت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے واقعۂ صلیب کے اس نظریہ کی بنا پر جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے یہاں مسلمہ ہے اس درجہ آپس میں عداوت اور بغض بڑھ گیا تھا کہ دونوں فریق بت پرستوں کی ترقی کو برداشت کرسکتے تھے لیکن ایک دوسرے کی مذہبی ترقی ان کے لئے نا قابلِ برداشت تھی اور اس کا مظاہرہ اس درجہ نمایاں تھا کہ جب کبھی یہود کو موقعہ ملا ہے تو انھوں نے عیسائیوں پر محض مذہب کے نام پر سخت سے سخت مظالم روا رکھے ہیں اور حکومت کے دباؤ سے زبردستی ان کو یہودی بنانے کی کوشش کی ہے اور جب کبھی عیسائیوں کو موقعہ ہاتھ آیا ہے تو انھوں نے یہودیوں پر اسی طرح کے مظالم سے گریز نہیں کیا پس نجران کا واقعہ ایسے زمانہ میں پیش آیا جبکہ مسطورہ بالا سیاسی اور تجارتی رقابت کی موجودگی میں رومی تاجر سواحلِ یمن تک پہنچتے اور رہالِ تجارت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کو بھی جاری رکھتے تھے، آہستہ آہستہ نتیجہ یہ نکلا کہ نجران" جو ساحلِ یمن پر واقع تھا" رومی تاجروں کا تجارتی اور تبلیغی مرکز بن گیا، حمیری بادشاہ یہ دیکھتے تھے اور سخت برہم ہوتے تھے مگر صاف طور سے ظلم کرنے کا بہانہ ہاتھ نہیں آتا تھا کہ حسب اتفاق راہب اور لڑکے کا یہ واقعہ پیش آگیا۔ اور ذونواس نے جب یہ دیکھا کہ بات ریاست و تجارت سے گذر کر مذہب تک پہنچ گئی تو یہودیت کے روایتی تعصب نے قابو سے باہر کردیا اور پھر جو کچھ پیش آیا گذشتہ سطور میں آپ اس کا مطالعہ کرچکے ہیں۔

[1] تفسیر ابنِ کثیر ج ۴ ص ۴۹۵ - ۴۹۴ - والبدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۳۱ - ۱۳۰ -

ان دو واقعات کے علاوہ مشہور محدث ابن ابی حاتمؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے صاحبزادہ ربیع فرماتے ہیں کہ اصحاب اخدود کے متعلق ہم نے سنا ہے کہ "فترۃ" کے زمانہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان زمانہ) میں خدائے تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک جماعت نے جب یہ یہ دیکھا کہ زمانہ بہت ہی خراب ہو چلا ہے اور فتنوں اور شرارتوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے اور دینِ حق گروہ بندیوں کی نذر ہو کر ہر شخص کی ذاتی رائے کے تابع بن گیا ہے تو انھوں نے باہم مشورہ کر کے عام آبادیوں سے بہت دور ایک چھوٹی سی بستی آباد کر لی اور اس میں سچی عیسائیت کے مطابق عبادت و صداقت کی زندگی بسر کرنے لگے مگر ان کا یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ اس زمانہ کے بت پرست بادشاہ تک پہنچ گیا اس نے آ کر بستی کا محاصرہ کر لیا اور ان کو توحیدِ الٰہی کے خلاف بت پرستی پر مجبور کرنے لگا لیکن ان حق پرستوں پر اس کی سختیوں کا مطلق اثر نہ ہوا اور انھوں نے شرک و بت پرستی سے صاف انکار کر دیا تب بادشاہ نے غضبناک ہو کر خندقیں کھدوانے اور ان میں آگ دہکانے کا حکم دیا اور پھر جو شخص بت پرستی سے انکار کرتا جاتا تھا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ حق پرست گروہ کے بزرگ پروانہ وار آگ میں کود جاتے تھے اور اپنے بچوں اور نوجوانوں کو تسلی دیتے جاتے تھے کہ آج کا دن خوف کھانے کا دن نہیں ہے، یہ آگ ہمارے لئے جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کا پیش خیمہ ہے چنانچہ تمام حق پرستوں نے حق پر نثار ہو جانا قبول کیا مگر شرک و بت پرستی پر آمادگی ظاہر نہ کی، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی ان پر اپنا یہ فضل فرمایا کہ جب وہ آگ میں ڈالے جاتے تو آگ تک پہنچنے اور اس کی تکلیف سہنے سے قبل ہی ان کی روح قبض کر لی جاتی تھی، مگر خندق اور کھائیوں کی آگ اس درجہ بھڑک رہی تھی کہ ان نکوکار انسانوں کو کھا لینے کے بعد بھی نہ بجھی اور بے قابو ہو کر کچھ اس طرح پھیلتی گئی۔ کہ بت پرست ظالم بادشاہ اور اس کے تمام لشکری سب کے سب اس کے اندر گھر گئے اور جل کر وہیں خاکِ سیاہ ہو گئے۔ قرآنِ عزیز کی یہ آیات "قتل اصحٰب الاخدود النار ذات الوقود (الایہ)" اسی واقعہ کا تذکرہ کر رہی ہیں۔ ؎۱

؎۱ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۳۔

اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ یہ واقعہ فارس میں پیش آیا، جب فارس کے بادشاہ نے دینِ حق چھوڑ کر باطل پرستی اختیار کرلی اور اپنے محارم (ماں بہن بیٹی وغیرہ) سے نکاح کرنا جائز قرار دے لیا تو ان کے بعض علماء نے جو ابھی تک دینِ حق پر قائم تھے بادشاہ کو اس بات سے منع کیا۔ بادشاہ نے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے غضبناک ہوکر یہ حکم کیا کہ کھائیاں کھدوائی جائیں اور جو شخص نکاحِ محارم کو باطل کہے اس کو کھائی میں جھونک کر زندہ جلادیا جائے چنانچہ اہلِ حق کی جماعت نذرِ آتش کردی گئی اور پارسیوں میں آج تک نکاحِ محارم کو جائز سمجھا جارہا ہے۔[۱]

انتقاد ان روایات کے مفہوم اور مقصد پر اگر نظر کی جائے اور تفصیلات وجزئیات کو نظر انداز کردیا جائے تو سب کا حاصل ایک ہی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ گذشتہ زمانہ میں مشرک یا یہودی بادشاہ نے ایک حق پرست اور توحیدِ الٰہی سے سرشار جماعت کو بت پرستی یا باطل پرستی پر مجبور کیا اور جب انھوں نے اس کے مطالبہ کو ٹھکرادیا اور ایمان باللہ اور حق پرستی کو ترک کردینے سے انکار کردیا تو ظالم وجابر بادشاہ نے ان کو آگ میں جھونک کر زندہ جلا دیا مگر نتیجہ کے اعتبار سے حق پرست جماعت کے حصہ میں ابدی کامرانی اور سرمدی فوز و فلاح آئی اور ظالم و باطل کوش جماعت دنیا میں بھی خائب و خاسر ہوئی اور آخرت میں ابدی جہنم پائی۔

نیز اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ نزولِ آیات و سُوَر میں اصل شے مفہوم و مراد ہے اور شانِ نزول کو ثانوی اور تاریخی حیثیت حاصل ہے جیسا کہ حکیم الامۃ شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہ) نے الفوز الکبیر میں تصریح فرمائی ہے تو پھر بآسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ باختلافِ زمانہ اس چرخِ نیلی فام کے نیچے ایسے واقعات متعدد پیش آچکے ہیں جن کا ذکر مسطورہ بالا روایات میں کیا گیا ہے چنانچہ یہ بھی ایک مستقل واقعہ ہے جس کو مسلمؒ نے صحیح میں اور امام احمدؒ نے مسند میں نقل کیا ہے اور وہ بھی جس کو محمد بن اسحٰق نے سیرۃ میں بیان کیا اور وہ بھی جس کو ابنِ کثیر نے بروایت حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نقل کیا ہے بلکہ ابنِ کثیرؒ نے بحیثیت ایک مورخ کے یہ ثابت کیا ہے کہ بلاشبہ اس نوعیت کے واقعات

---

[۱] تفسیر ابنِ کثیر ج ۴ ص ۴۹۳۔

...متعدد پیش آچکے ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

وقد یحتمل ان ذلک قد وقع فی العالم	اور یہ ممکن ہے کہ ایسے واقعات عالم میں بہت ہوگذرے
کثیرًا کما قال ابن ابی حاتم ...	ہوں مثلاً ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ خدود کا معاملہ
کانت الاخدود فی الیمن زمان	ایک تو یمن میں تبع کے زمانہ میں پیش آیا اور دوسرا قسطنطین
تُبع وفی القسطنطینۃ زمان قسطنطین	کے زمانہ میں قسطنطنیہ میں اور تیسرا عراق (بابل) میں
... وفی العراق فی ارض بابل بخت نصر	بخت نصر کے زمانہ میں پیش آیا جس نے ایک بت بنا رکھا تھا
الذی صنع الصنم وامر الناس ان	اور وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ اس کو سجدہ کریں اور جو
یسجدوا لہ ¹	سجدہ نہ کرتا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔
وعن مقاتل قال کانت الاخدود ثلاثۃ	اور مقاتلؒ فرماتے ہیں کہ "اخدود" تین واقعے ہیں، ایک
واحدۃ بنجران بالیمن والاخری بالشام	یمن (عرب) کے شہر نجران میں پیش آیا، دوسرا شام میں
والاخری بفارس احرقوا بالنار اما التی	اور تیسرا فارس میں ان واقعات میں مظلوموں کو
بالشام فھو انطنانوس الرومی واما	دہکتی آگ میں ڈالا گیا تھا اور شام کا واقعہ انطنانوس
الذی بفارس فھو بخت نصر واما التی	رومی کے ہاتھوں پیش آیا اور فارس کا بخت نصر (بنوکدنذر)
بارض العرب (نجران) فھو یوسف	کے ہاتھوں اور نجران کا واقعہ یوسف ذونواس کے
ذونواس فاما التی بفارس والشام فلم	ہاتھوں پیش آیا۔ لیکن فارس اور شام کے واقعات کا
ینزل اللہ تعالی فیھم قرانًا وانزل فی	ذکر قرآن میں نہیں ہے البتہ نجران میں جو واقعہ پیش آیا
التی کانت بنجران ۔ ² ³	اس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ ² ³

¹ و ² تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج۔

³ شام وفارس کے واقعات میں شام کے واقعہ سے تو غالباً قسطنطین کا واقعہ مراد ہے وہ یہ کہ جب قسطنطین بانی قسطنطنیہ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دینِ حق کی بجائے مروجہ مسیحیت کو اپنا دین بنایا اور توحید کی جگہ تثلیث کو عقیدہ کی بنیاد قرار دیا اور صخرہ بیت المقدس سے منحرف کرکے مشرق کو قبلہ بنایا اور تمام قلمرو میں منادی کر دی کہ یا آبا و اجداد کا دین چھوڑ کر دینِ مسیحی اختیار کرو اور جو انکار کرے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۲۲)

بہرحال اگرچہ مسطورہ بالا روایات بلکہ ان کے علاوہ اسی قسم کے اور واقعات اپنے مفہوم و مراد اور مقصد کے لحاظ سے سب ہی سورۂ بروج کی آیات زیر بحث کا مصداق بن سکتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ قرآنِ عزیز نے خصوصیت کے ساتھ کس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے تو مشہور تابعی مقاتلؒ کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ نجران اور ذونواس سے تعلق رکھتا ہے اور یہی قول صحیح ہے اور یہ اس لئے کہ مسلم اور مسند کی روایت کے تو کسی ایک جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو سورۂ بروج کی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرمایا ہے یہی وجہ ہے کہ امام مسلمؒ نے اس روایت کو کتاب التفسیر میں نقل نہیں فرمایا، البتہ ترمذی نے ایک "حسن غریب روایت" میں ضرور اس واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مربوط اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا یہ سورۂ بروج کی زیر بحث آیات کی تفسیر ہے لیکن ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ترمذی کی حدیث سے تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے بلکہ یہ قوی احتمال ہے کہ یہ واقعہ راوی حدیث حضرت صہیب رومی کا اپنی جانب سے بیان کردہ ہو کیونکہ وہ اہلِ کتاب کے قصص و واقعات کے بہت بڑے عالم تھے۔ ترمذی کی حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

> ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے لبِ مبارک کو اس طرح حرکت دی گویا کچھ بات فرمانا چاہتے ہیں مگر بیان نہ فرمائی تب کسی نے عرض کیا کہ آپ کچھ ارشاد فرمانا چاہتے تھے مگر فرمایا نہیں لبوں کو حرکت دے کر رہ گئے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاءِ سابقین میں سے ایک نبی اپنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۱) اس کو دہکتی آگ میں جھونک دو۔ اوائل چھٹی صدی عیسوی میں ہزاروں انسان دہکتی آگ میں جھونک دیئے گئے۔ اور فارس کے واقعہ سے متعلق ابن کثیر نے ایک اسرائیلی روایت جو کہ دانیال نبی کے صحیفہ میں بھی مذکور ہے یہ بیان کی ہے کہ عراق (بابل) میں بخت نصر نے سونے کا ایک بت بنوایا تھا اور تمام رعایا سے اس کو سجدہ کراتا تھا۔ سب نے سجدہ کیا لیکن دانیال (علیہ السلام) اور ان کے رفقاء نے سجدہ سے انکار کر دیا تب بخت نصر نے خندق میں آگ دہکا کر اس میں ان سب کو دھکیل دیا مگر وہ ان پر بردو سلام ہو گئی اور کوئی آنچ نہ آئی۔ اور جن نو آدمیوں نے آگ کی بھٹی میں ان کو ڈالا تھا وہ جل کر خاک ہو گئے۔

امت کا حال دیکھ کر ازراہِ فخر کہنے لگے کہ ایسی امت کس نبی کی ہوگی؟ کون اس کے مقابلہ میں اپنی امت پیش کر سکے گا؟ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ انداز پسند نہ آیا اور ان پر فوراً وحی نازل ہوئی کہ دو باتوں میں سے ایک بات قبول کر و یا امت پر مصیبت کا نزول ہو یا ان پر دشمن کا تسلط ہو، خدا کے نبی نے دشمن کے تسلط پر مصیبت کے نزول کو ترجیح دی چنانچہ ستر ہزار کے قریب موت کی آغوش میں سلا دیئے گئے۔ (اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں) وکان اذا حدث بهذا الحدیث حدث بهذا الحدیث الاٰخر۔ اور جب وہ اس واقعہ کو بیان کیا کرتے تھے تو اس کے ساتھ ایک اور واقعہ سنایا کرتے تھے (یہ دوسرا واقعہ وہی ہے جو مسلم میں مذکور ہے)۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں۔

وهذا السیاق لیس فیہ صراحۃ ان سیاق هذہ القصۃ من کلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال شیخنا الحافظ ابو الحجاج المزی: فیحتمل ان یکون من کلام صهیب الرومی فانہ کان عندہ من اخبار النصاریٰ۔ [1]	اور روایت کا یہ طرقِ بیان ہرگز اس کی صراحت نہیں کرتا کہ اس دوسرے واقعہ کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کیا گیا، ہمارے استاد ابو الحجاج مزی فرماتے ہیں: اس بیان میں یہ احتمال ہے کہ یہ واقعہ صہیب رومی کی جانب سے ہو اس لئے کہ وہ نصاریٰ کے قصص و واقعات کے عالم تھے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "اصحابِ اخدود" کے متعلق کتبِ تفسیر و سیر میں تین روایات مذکور ہیں۔ ایک روایت اوپر بیان ہو چکی دوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ یمن میں پیش آیا ہے اور تیسری روایت میں ہے کہ یہ حبشہ کا واقعہ ہے مگر ان تینوں روایات میں سے کسی ایک روایت کے متعلق بھی ان سے یہ بصراحت مذکور نہیں کہ وہ ان میں سے کسی واقعہ کو تاریخی حیثیت سے ان آیات کی تفسیر سمجھتے ہیں۔

پس جبکہ مسلم کی روایت اس مسئلہ میں خاموش ہے اور ترمذی کی روایت سے بھی اس کے متعلق کوئی بات صاف ثابت نہیں ہوتی اور حضرت علیؓ کی روایات بطور توسع اور مفہوم و مقصد کے پیشِ نظر

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۴۔

توآیات کا مصداق بنتی ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے شانِ نزول پر دلالت نہیں کرتیں تو اس صورت حالات میں مقاتل کی صراحت اپنے اندر قوت رجحان رکھتی ہے چنانچہ اہل تحقیق کا رجحان اسی جانب ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ ذونواس سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

وماذکرہ ابن اسحاق یقتضی ان قصتھم	اور ابن اسحٰق نے جو واقعہ نقل کیا ہے اس کا اقتضا یہ ہے
کانت فی زمان الفترۃ التی بین عیسیٰ و	کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم
محمد علیھما من اللہ السلام وھو اشبہ [۵۱]	کے درمیان زمانہ (فترۃ) کا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔
وقد تقدم فی قصۃ اصحاب الاخدود	اور اصحاب اخدود کے واقعہ میں گذر چکا ہے کہ ذونواس
ان ذونواس وکان اخر ملوک حمیر وکان	ہی وہ بادشاہ تھا جس نے تقریباً بیس ہزار سچے
مشرکا وھو الذی قتل اصحاب الاخدود	عیسائیوں کو خندقوں میں ڈال کر مار ڈالا تھا۔
وکانوا نصاریٰ وکانوا قریبا من عشرین	یہ بادشاہ مشرک تھا اور شاہان حمیر میں سے آخری
الفا [۵۲]	بادشاہ تھا۔

اور شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن یہ دونوں بزرگ ذونواس کو مشرک کہتے ہیں مگر تاریخی سند سے ثابت ہو چکا ہے کہ ذونواس اپنے باپ کے دین یہودیت ہی پر قائم تھا علاوہ ازیں قیاس بھی یہ چاہتا ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ نجران اور ذونوس سے ہی تعلق رکھتا ہے اس لئے کہ اس سلسلہ میں بیان کردہ واقعات میں سے یہ واقعہ زمانہ کے لحاظ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ملکی اعتبار سے بھی خود عرب کے اندر کا واقعہ ہے اس لئے نزول قرآن کے وقت اہل عرب اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہوں گے لہذا حق و باطل کے مختلف معرکوں میں سے موعظت و عبرت کے لئے قرآن نے اس واقعہ کو بیان کر دیا اور اس کے علاوہ دوسرے واقعات یا تو بہت ہی قدیم زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یا عرب کے باہر دوسرے ملکوں سے علاقہ رکھتے ہیں اس لئے وہ اس کے مقابلہ میں قابل ترجیح نہیں ہو سکتے۔ [۵۳]

---

[۵۱] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۵ [۵۲] جلد ۴ ص ۵۴۹ سورۃ الفیل۔ [۵۳] حاشیہ ص ۳۲۵ پر ملاحظہ فرمایئے۔

تبع: سیلِ عرم کی بحث میں اگرچہ سبا کے ضمن میں "تبع" اور "تبابعہ" کا تفصیلی ذکر آچکا ہے تاہم مختصر طور پر یہاں بھی یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ان کا لقب رہا ہے جنھوں نے تقریباً ڈھائی سو سال تک یمن کے مغربی حصہ کو دار السلطنت قرار دے کر عرب، شام، عراق اور افریقہ کے بعض حصوں پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ جدید تحقیق کے اصول پر حمیر حُمرۃ (سرخی) سے ماخوذ ہے اور اس کے مقابلہ میں سودانی، سواد (سیاہی) سے بنایا گیا ہے، چونکہ اہلِ عرب یعنی حمیری، حبشیوں کو سیاہ فام ہونے کی وجہ سے "سودانی" کہتے تھے اس کے جواب میں حبشی ان کو احمر (سرخ) کہتے تھے یہی لفظ آگے چل کر "حمیر" بن گیا اور لفظ "تبع" اصلاً حبشی لفظ ہے یا سامی الاصل ہے؟ اس کے متعلق عرب مورخین کی رائے یہ ہے کہ یہ عربی (سامی) لفظ ہے اور "تبع" سے بمعنی متبوع (سردار) بنالیا گیا ہے اور جدید اہلِ تحقیق یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ حبشی الاصل ہے اور بمعنی قاہر و غالب آتا ہے یعنی عربی میں "سلطان" اور حبشی زبان میں "تبع" مرادف ہے۔

قرآنِ عزیز نے بھی تبع کا ذکر دو مقامات سورۂ قٓ اور سورۂ دخان میں کیا ہے۔ سورۂ دخان میں

(حاشیہ صفحہ ۳۲۴) محققِ عصر حضرت استاذ علامہ انور شاہ (نور اللہ مرقدہ) ارشاد فرماتے تھے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت کا شانِ نزول تاریخی حیثیت سے متعین ہوتا ہے پھر بھی آیت کے مفہوم و مراد کے لحاظ سے اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ اس قسم کی دوسری جزئیات کو خود صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کا شانِ نزول فرمادیا کرتے ہیں چنانچہ اس کی بہترین مثال سورۂ توبہ کی یہ آیت ہے۔ لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیہ (الآیہ) یہ آیت باتفاقِ جمہور مسجد قبا کے بارے میں نازل ہوئی لیکن ایک مرتبہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "مسجدی ہذا" اس آیت کا مصداق میری یہ مسجد (مسجد نبوی) ہے" چنانچہ تمام محدثین کے نزدیک آپ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جن اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے چونکہ اس کا مصداق مسجدِ قبا سے بھی زیادہ مسجد نبوی بنتی ہے اس لئے یہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کو شانِ نزول بنایا جائے۔

لیکن آپ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تاریخی حیثیت سے آیت کا شانِ نزول مسجدِ قبا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مسجد نبوی سے رکھتا ہے۔ پس اگر مسئلہ زیرِ بحث میں یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ترمذی کی روایات میں مذکور واقعہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے سورۂ بروج کی آیات کا شانِ نزول فرمایا ہے تو نقل و عقل سے پیدا شدہ قرائن و دلائل اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ آپ کا یہ ارشادِ مبارک مصداق کے توسع کے پیشِ نظر ہے نہ کہ اس حیثیت سے کہ تاریخی بنا پر ترمذی میں مذکور واقعہ ہی آیات کا شانِ نزول ہے۔

مختصر طور پر ان کی مادی قوت وطاقت کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جب خدا کی نافرمانی کر کے وہ ہلاکت سے نہ بچے تو قریش جوان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں وہ سرکشی کر کے کیسے بچ سکتے ہیں اور سورۂ ق میں صرف مجرم قوموں کی فہرست میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

اھم خیرام قوم تبع والذین من قبلھم اھلکنٰھم وانھم کانوا مجرمین۔ (دخان)	یہ (قریش) بہتر (قوی وطاقت ور) ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے گذر گئیں ہم نے ان کو اس لئے ہلاک کر دیا کہ وہ مجرم تھیں۔
کذبت قبلھم قوم نوح واصحاب الرس وثمود وعاد وفرعون واخوان لوط و اصحاب الایکۃ قوم تبع (الآیہ) ق	ان (مشرکین مکہ) سے پہلے نوح کی قوم نے اصحاب الرس نے ثمود، عاد، اخوانِ لوط اور اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے (خدا کے پیغمبروں کو) جھٹلایا ہے۔

عرب کی دو حکایتیں ابن کثیرؒ نے مشہور محدث ابوبکر بن ابی الدنیا کے واسطہ سے بروایت محمد بن جعفر بن ابیطالبؓ یہ حکایت نقل کی ہے کہ انھوں نے بعض اہلِ علم سے سُنا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے جب اصفہان فتح کر لیا اور شہر میں فاتحانہ داخل ہو گئے تو شہر پناہ کا ملاحظہ کیا دیکھا تو ایک جانب میں دیوار شکستہ ہے، انھوں نے حکم دیا کہ دیوار کا یہ حصہ درست کر دیا جائے لیکن جب دیوار کو درست کر دیا گیا تو وہ ٹھیر نہ سکی اور یکلخت پھر گر گئی۔ چنانچہ دوبارہ مرمت کی گئی مگر وہ پھر منہدم ہو گئی تب بعض لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ اس مقام پر کسی مردِ صالح کی قبر معلوم ہوتی ہے یہ سوچ کر جب بنیاد کو کھدوایا گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا مدفون ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور تلوار پر عبارت کندہ ہے جس کا حاصل یہ ہے "میں حارث بن مضاض ہوں جس نے اصحابِ اخدود سے انتقام لیا" حضرتِ ابوموسیٰؓ نے اس کو وہاں سے نکال کر قبرستان میں دفن کرا دیا اور دیوار کی تعمیر کرا دی جو صحیح وسالم رہی۔ [1]

حارث بن مضاض عرب کے خاندان جرہم کا ایک بادشاہ تھا جس نے نابت بن اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد سے مکہ کی حکومت لے کر حکمرانی کی تھی اور یہ تقریباً حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) سے پانچسو سال

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴

بعد کا زمانہ ہے، اس اعتبار سے اصحابِ اخدود کا واقعہ بہت قدیم زمانہ سے متعلق ہو جاتا ہے مگر یہ روایت سیر کی روایات میں سے ہے اور اس کی سند منقطع ہے اس لئے اس کی حیثیت حکایت اور کہانی سے زیادہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر یہ واقعہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ ان مختلف واقعات میں سے ایک واقعہ ہو ...... جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے مگر وہ آیاتِ بروج کے مصداق میں داخل ہیں۔

اسی طرز کی ایک حکایت مشہور محدث محمد بن ابوبکر بن حزمؒ نے بغیر سند کے بیان کی ہے کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ میں نجران کا ایک شخص زمین کھود رہا تھا۔ دیکھا تو اس جگہ ایک قبر ہے۔ اندر جھانک کر دیکھا تو ایک نعش کو اس طرح بیٹھے ہوئے پایا کہ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہے جب لوگوں نے اس کے ہاتھ کو سر سے ہٹایا تو اس سے خون بہنے لگا اور جب ہاتھ کو اسی طرح رکھ دیا تو خون بند ہو گیا، اس شخص کے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی اور اس کے نگینہ پر یہ عبارت کندہ تھی "ربی اللہ" اس واقعہ کی خبر فوراً حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کو دی گئی حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شخص کو اس کی حالت پر رہنے دیا جائے اور اسی جگہ دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اس زمانہ میں لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ نعش عبد اللہ بن تامر کی ہے۔

نجران میں چونکہ راہب اور عبد اللہ بن تامر کا واقعہ پیش آچکا تھا اس لئے کوئی محل تعجب نہیں کہ اس قسم کی حکایات وہاں مشہور رہی ہوں اور عیسائیوں نے اپنی برتری کے لئے ان کو خوب آب و رنگ دیا ہو۔

چند تفسیری نکات

(۱) والسماء ذات البروج والیوم الموعود وشاھد ومشھود" قرآن عزیز کی ان آیات میں "واو بمعنیٰ قسم" ہے اور ان آیات کے علاوہ قرآن کی متعدد سورتوں میں مختلف اشیاء کی قسم کا تذکرہ موجود ہے، عام طور پر ان مقامات کی تفسیر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح ہم آپس میں قسمیں کھاتے ہیں یا ایسی چیز کی قسم کھاتے ہیں جو ہمارے لئے بہت زیادہ عزت و عظمت کے لائق ہے مثلاً باپ، استاد، پیر، پیغمبر اور خدا کی قسم، اور یا ایسی شے کی قسم کھائی جاتی ہے جو ہماری نگاہ میں بہت

زیادہ محبوب ہو۔ مثلاً اولاد کی یا محبوب کی قسم، اسی طرح خدائے تعالیٰ نے بھی قرآن میں قسمیں کھائی ہیں اور یہ سمجھ کر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو قسم کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ قسم تو صرف اس لئے کھائی جاتی ہے کہ مخاطب کو اگر ہماری بات میں کوئی شبہ ہے تو ہم جس چیز کی عزت کرتے یا اسے بہت زیادہ محبوب سمجھتے ہیں اس کی عزت و محبت کو واسطہ بنا کر اپنی بات کی صداقت کا یقین دلائیں، پس جبکہ خدائے برتر کی ذات سے نہ کوئی برتر ہے اور نہ وہ اپنی صداقت کی تائید کے لئے کسی محبوب سے محبوب شے کا محتاج تو پھر ان اقسام القرآن کا کیا مطلب ہے؟

نیز جو شخص خدائے تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے وہ تو خود اس کا قائل ہے کہ اُس ذاتِ واحد سے زیادہ کوئی سچا نہیں ہے "ومن اصدق من اللہ قیلا" اور العیاذ باللہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا اس کے لئے یہ سب قسمیں بیکار ہیں۔ لہذا قرآن عزیز میں مذکور اقسام کے کیا معنی؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ عزیز کے ان مقامات میں واوِ قسم یا لفظِ قسم سے متعارف قسم سمجھنا اور جن اشیاء کو واوِ قسم یا لفظِ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان سے یہ مراد لینا "کہ جس طرح عام طور پر ہم باپ یا بیٹے کی یا اپنے سے معظم و محترم یا پیاری شے کی قسم کھاتے ہیں اسی طرح خدا نے بھی قسمیں کھائی ہیں" قطعاً غلط اور عربی زبان کے محاورات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اور یہ اس لئے کہ عربی محاورات میں ان مواقع پر بھی واوِ قسم کو استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی شے کو بطور تاکیدِ کلام کے یا بطور شہادت و استشہاد کے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کلام میں ایسی بات کہی گئی ہے جس کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ وہ اچھی طرح ذہن میں نہیں آئے گی جب تک کہ اس کو دوسرے کلام کے ساتھ مؤکد نہ کر دیا جائے حتی کہ وہ بات جس کے لئے گفتگو شروع کی گئی ہے دلنشین ہو جائے، اس صورت میں الواو للقسم بمعنی "الواو للتاکید" ہو جاتی ہے اسی طرح اگر متکلم کی جانب سے کوئی ایسی بات کہی گئی ہے جس کا سمجھنا مخاطب کے لئے اس وقت تک مشکل ہے جب تک اس بات سے متعلق ایسے شواہد نہ پیش کیے جائیں جو اس بات کو دلنشین بنا سکیں تو ایسے موقعہ پر واوِ قسم کے ساتھ ایسے امور کو بیان کیا جاتا ہے جو اس مضمون کو تہِ قلب میں اتارنے کے لئے مدد دے سکیں جس کے لئے متکلم مخاطب سے کلام کر رہا ہے اور ایسے موقعہ استعمال میں الواو للقسم کے

معنی "لواو للشہادۃ" کے ہوجاتے ہیں چنانچہ جن مقامات پر واوِ قسم کو "تاکید" یا "شہادت" کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور ان مقامات میں جن چیزوں کو واو یا لفظِ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ متکلم کے لئے بزرگ و محترم یا محبوب ہی ہوں بلکہ دنیا و مافیہا کی جو شے بھی متکلم کے مقصد "تاکیدِ مضمون" یا "شہادت و استشہاد" کے مفید اور موقعہ کے مناسب حال ہو اس کا بیان کیا جانا ضروری ہے۔

پس قرآنِ عزیز میں جن جن مقامات پر "واوِ قسم" یا "لفظ قسم" سے کلام کی ابتداء کی گئی ہے ان تمام مقامات میں قسم سے متعارف معنی (حلف) مراد لینا قطعاً غلط اور باطل ہیں بلکہ عربی محاورۂ زبان کے مطابق ان میں سے اکثر مقامات میں واو بمعنی شہادت ہے اور بعض مقامات میں معنی تاکید ہے۔

مثلاً "سورۂ والتین" میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائناتِ ہست و بود میں "انسان" کو سب سے بہتر مخلوق بنایا ہے مگر اُن انسانوں کے علاوہ جو ایمان باللہ اور عمل صالح کے ذریعہ اپنی انسانیت کے امتیاز کو باقی رکھتے ہیں جن انسانوں نے عقل و شعور کے خصوصی امتیازات کے باوجود اپنے خالق اور پروردگار سے سرکشی کی وہ ذلت و رسوائی کے اسفل سافلین میں پھینک دیئے گئے۔

لیکن یہ دونوں باتیں سطحی نظر میں دل لگتی نہیں تھیں اس لئے کہ کائنات عالم میں انسان سے زیادہ قوی و طاقت ور اور وسیع و عریض مخلوق موجود ہیں جیسے شمس و قمر کواکب و سیارات اور ارض و سمٰوات نیز انسان، عالم کی ہر شے کا کسی نہ کسی درجہ میں محتاج ہے اور عالم کی کوئی شے اس کی محتاج نظر نہیں آتی لہذا یہ کس طرح باور کیا جائے کہ ایک ضعیف البنیان اور ہر شے کی محتاج مخلوق اپنی خلقت کے اعتبار سے کل کائنات سے بہتر ہو اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو پھر احسنِ تقویم کے اعزاز سے معزز ہونے کے بعد اسفلِ سافلین میں گرا دیئے جانے کے کیا معنی؟ اس ادق مضمون کو سمجھانے اور فہم و ادراک کے قریب لانے کے لئے قرآن نے اول تین واقعات کو بطور شہادت کے پیش کیا اور پھر اصل مضمون کو واضح کیا، اس نے کہا: والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین۔ کسی شے کے "احسن تقویم" پر ہونے کا معیار اس کی جسمانی طاقت یا عرض و طول کی فراوانی اور احتیاج سے استغناء نہیں ہے بلکہ عقل و شعور ادراکات و جذبات کا وجود اس کیلئے

صحیح معیار رہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ اپنے اندر ودیعت شدہ متضاد قوتوں کا توازن صحیح رکھ کر تمام کائنات سے ممتاز و معزز نظر آئے اور یہ وصف صرف انسان ہی کے اندر تخلیق کیا گیا ہے اور دوسری اشیاءِ عالم اس سے یکسر محروم ہیں اور ان ہی اوصاف کی بدولت وہ بدی اور گمرہی سے محفوظ رہتا اور نیکی اور ہدایت کی راہ پر گامزن ہوکر اپنے خالق کی معرفت حاصل کرتا اور ابدی وسرمدی نجات وفلاح پاتا ہے بلکہ عالم کی راہنمائی اور کائناتِ الٰہی میں خدا کے پیغاماتِ حق کی پیغمبری کا عظیم الشان اعزاز بھی اسی کے لئے مخصوص ہے

تم اگر تاریخ ماضی کے اوراق کا مطالعہ کروگے تو تم پر بآسانی اس کی صداقت ظاہر ہوجائیگی مثلاً شام (بیت المقدس) کا وہ مقام جہاں بہ کثرت انجیر وزیتون کے درخت اور باغات پائے جاتے ہیں اس بات کے لئے شہادت دے رہا ہے کہ اس جگہ خدا کا وہ سچا ہادی پیدا ہوا جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے اور جس نے پاکبازی کے ساتھ دنیا کو ہدایت اور راستی کا سبق سکھایا اور اگر اس سے قدیم تاریخ کا مطالعہ کرو تو طور سینا راس کا گواہ ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اس پر خدا کے کلام کو کتنی بار سنا اور خدا کی پیغمبری کا شرف حاصل کرکے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور مساوات انسانی کا سبق سنایا۔ اور دور کیوں جاتے ہو اس بلد امین (مکہ) سے پوچھو وہ شہادت دیگا۔ کہ اس کی آغوش میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسی مقدس ہستی اور خدا کے بزرگترین پیغمبر نے جنم لیا اور عرب کے بے برگ وگیاہ ریگستان میں کھڑے ہوکر ساری کائنات کو حق وصداقت اور اخوت ومساوات کا سبق سنایا اور توحیدِ الٰہی کی جانب صحیح راہنمائی کی۔ کیا یہ تینوں مقدس ہستیاں انسان کے سوا کچھ اور تھیں اور عالم کی راہنمائی کا جو کام انھوں نے انجام دیا کیا وہ شمس وقمر، آسمان وزمین، بلکہ جن وملک انجام دیسکتے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، پس اگر تاریخِ ماضی کی یہ سب شہادتیں صحیح اور حق ہیں تو اب اس اقرار میں پس وپیش کیوں ہو کہ بلاشبہ انسان کو خدا نے بہترین قوام سے مخلوق کیا ہے۔ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اور جب ایسا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ جو انسان ان مقدس ہستیوں کے طریق کار پر کاربند نہیں ہے اور ان کی راہِ ہدایت سے منحرف ہوکر بدی اور گمرہی کو اپنی زندگی بنائے ہوئے ہے وہ یقیناً انسانیت کے معیار سے گر گیا اور وہ اسی قابل ہے کہ انجام کار

انتہائی قعرِ مذلت" اسفل السافلین" میں پھینکدیا جائے" ثم رددناہ اسفل سافلین"۔

ہاں جس نے ایمان باللہ اور عمل صالح کو اختیار کرکے یعنی "اسلام" کو راہِ عمل بنا کر اپنی انسانیت کے شرف و امتیاز کو محفوظ رکھا اس کے لئے خدا کے پاس بے منت اجر و ثواب اور نتائج و ثمرات کی کامرانی ہے۔" الا الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت فلھم اجر غیر ممنون"۔

یہ ہے مطلب قرآن کی قسموں کا جو اس ایک مثال سے ظاہر ہے لہٰذا باقی اقسام القرآن بھی اسی طرح اپنی اپنی سورت میں بیان کردہ مضمون کو دلنشین بنانے کے لئے مناسب حال شواہد و نظائر کا کام دیتی اور بعض مقامات پر تاکیدِ مضمون کا حق ادا کرتی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد سورۂ بروج کی اقسام کی تفسیر بہت سہولت کے ساتھ ذہن و فکر میں آسکتی ہے۔ اس سورۃ میں چند چیزوں کو واؤِ قسم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ (۱) والسماء ذات البروج برجوں والا آسمان۔ (۲) الیوم الموعود قیامت کا دن۔ (۳) شاھد۔ جمعہ کا دن یا ہر وہ شخص جو حاضر و موجود ہو۔ (۴) مشھود عرفہ کا دن یا ہر وہ شخص جو اس واقعہ سے متعلق ہے۔ اور ان کے بعد یہ کہا گیا" قتل اصحاب الاخدود النار ذاتِ الوقود اذھم علیھا قعود (الآیہ)" یعنی جن باطل پرستوں نے خندقیں کھدوا کر اور ان میں آگ دہکا کر مومنوں کو خدا پرستی کی بنا پر ایسی حالت میں آگ کے اندر دھکیل کر زندہ جلادیا کہ خود کناروں پر بیٹھے اپنی اس انسانیت سوز حرکت کا تماشا دیکھ رہے تھے وہ اپنی اس کمینہ حرکت پر زیادہ دن نازاں نہ رہ سکے اور انجام کے لحاظ سے ہلاکت و بربادی ظالموں کے ہی حصہ میں آئی اور دائمی سرور و کامرانی مظلوموں نے پائی۔

اس واقعہ میں دو باتیں واضح کی گئی ہیں ایک یہ کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ایسا المناک واقعہ پیش آیا۔ دوسری بات یہ کہ نتیجہ اور ثمرہ کے پیشِ نظر ظالم خسارہ میں رہا اور مظلوموں کو فوز و فلاح نصیب ہوئی اور جبکہ پہلی بات گذشتہ تاریخ سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری بات بھی یا تو تاریخِ ماضی سے ہی متعلق تھی یا مستقبل سے اس کا تعلق تھا تو ضروری ہوا کہ مخاطب کو یہ دلنشین کرایا جائے کہ ایسا ضرور ہوا اور جب کبھی ایسا ہوا ہے تو اس کا انجام ظالم کے حق میں خسران ہی رہا ہے۔ چنانچہ اظہارِ مقصد سے قبل

"واو قسم" کے ذریعہ اس طرح کلام کی ابتدا کی گئی کہ برجوں والا آسمان اس بات کا شاہد ہے کہ اسی چرخ نیلی فام کے نیچے ایک المناک واقعہ پیش آیا اور یوم قیامت بھی گواہ ہے جس میں ہر حق و باطل کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک ہو جانے والا ہے" کہ اس المیہ کا انجام ظالم کے حق میں برا رہا اور ہر وہ شخص اس کا گواہ ہے جو واقعہ کے وقت موجود تھا اور خود وہ ظالم و مظلوم گواہ ہیں جن کا اس معاملہ سے تعلق رہا ہے کہ بلاشبہ خندق کھود کر آگ میں انسانوں کو جلانے والے ہی انجام کار ہلاک و برباد ہوئے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ برجوں والا آسمان جو اپنی حیرت زا صنعت اور کواکب و نجوم کے ساتھ زینت پر خدائے واحد کی وحدانیت کا اقرار کر رہا ہے اور وہ قیامت کا دن جس دن میں خدائے واحد کے سوا کسی کی قوت و طاقت باقی نہ رہے گی اور جہاں "لمن الملك اليوم لله الواحد القهار" کا اعلان ہوگا اور وہ جمعہ کا دن جس میں ہر ہفتہ کروروں انسان خدا کے سامنے سربسجود ہو کر اسی کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہیں اور وہ عرفہ کا دن جس میں سال بھر میں تمام خدا پرست دنیا خدائے واحد کی پرستش کا مظاہرہ کرتی ہے یہ سب اس بات کے لئے شاہد اور گواہ ہیں کہ "اصحاب اخدود" اپنے ظلم کے نتیجہ میں ناکام رہے اور ہلاک و برباد ہوئے اور نہ صرف وہ بلکہ ہر ظالم کا انجام "جہنم" اور ابدی ذلت و رسوائی ہے اور مظلوم کے لئے دنیا و دین دونوں میں فوز و فلاح اور کامرانی ہے اور پھر اس بات کو ثابت کرنے کے لئے چند تاریخی واقعات کو بھی دہرایا گیا اور بتایا گیا کہ تم ثمود اور فرعون کے واقعات پر غور کرو اور تاریخ ماضی میں محفوظ ان کی عبرتناک داستانوں کا مطالعہ کرو تاکہ تم کو یقین ہو جائے کہ جن حقائق کی جانب سورۂ بروج میں توجہ دلائی گئی ہے ان کا ایک ایک حرف صحیح اور صادق ہے، کیا "اصحاب الاخدود" کی طاقت و قوت ثمود اور فرعون سے زیادہ تھی اور کیا جب انھوں نے خدا کے مقابلہ میں سرکشی کر کے مظلوم ایمان داروں پر ہولناک مظالم کئے اور اس کی سزا میں خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت نے ان کو بے یار و مددگار بنا کر ہلاک و برباد کر دیا تو دنیا کی کوئی طاقت و قوت یا خود ان کی قوت و سطوت ان کے کچھ بھی کام آئی اور ان کو تباہی سے بچا سکی؟ "هل اتاك حديث الجنود ه فرعون وثمود ه بل الذين

کفر وا فی تکذیب واللہ من ورائھم محیط ؕ

(۲) ذات البروج" میں مفسرین نے برج کی تفسیر کرتے ہوئے تین معنی مراد لئے ہیں۔ (الف) بڑے بڑے نجوم و کواکب مراد ہیں۔ (ب) بروج ہیئت مراد ہیں جن کی تعداد بارہ ہے اور بحساب ہیئتِ قدیم ہر ایک برج میں سورج پورے ایک ماہ میں دورہ کرتا اور چاند دو دن اور تہائی دن میں دورہ کرتا اور دو راتیں مستور رہتا ہے اور اس طرح یہ دونوں مہینے اور سال بناتے ہیں۔ (ج) بروج سے وہ قلعے مراد ہیں جو آسمان پر محافظ فرشتوں کے لئے بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآنِ عزیز میں دوسرے معنی قطعاً مراد نہیں ہیں اس لئے کہ ہیئت کا یہ حساب ضروری نہیں کہ صحیح ہو بلکہ آج کی ترقی یافتہ ہیئت نے تو تجربہ اور مشاہدہ کی حد تک یونان کی ہیئت قدیم کو تقویم پارینہ بنا دیا ہے اور بطلیموس کا نظام فلکی فرسودہ داستان بن کر رہ گیا ہے اور پہلے اور تیسرے معانی میں پہلے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بڑے بڑے کواکب و نجوم ہی محافظ ملائکۃ اللہ کا مستقر ہیں تو پہلے اور تیسرے معنی میں مطابقت ہو جائے گی۔

(۳) وشاھدٍ ومشھود" کی تفسیر میں جلیل القدر صحابہ اور تابعینؒ سے مختلف اقوال منقول ہیں (الف) شاہد سے مراد جمعہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، انسان یا اللہ تعالیٰ مراد ہے۔ (ب) مشہود سے عرفہ قیامت یا جمعہ مراد ہے۔ مگر اکثر کا رجحان یہ ہے کہ شاہد سے جمعہ اور مشہود سے عرفہ مراد ہے اس لئے کہ جمعہ کا دن ہر ہفتہ آتا ہے اور دنیا کے ہر گوشہ سے لوگ عرفات میں حاضر ہوتے ہیں۔

ابن جریر طبریؒ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک روایت اسی طرح کی بیان کی ہے

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیوم الموعود یوم القیمۃ وان الشاھد یوم الجمعۃ وان المشھود یوم عرفۃ (الحدیث)"۔

(۴) اصحاب اخدود کو قیامت کے دن جو عذاب ہوگا اس کے متعلق قرآنِ عزیز نے عذابِ جہنم کے ساتھ "عذاب الحریق" "آگ لگنے کا عذاب" کا بھی ذکر کیا ہے اس سے یا تو عذابِ جہنم ہی مراد ہے، اور "جزاء از جنس عمل" کے اصول پر اس کو عذابِ حریق بھی کہدیا گیا ہے یا جہنم میں ہی جلنے کا کوئی

خاص قسم کا عذاب مراد ہے۔ حافظ ابن کثیر کی یہی رائے ہے اور شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ نے یہ معنی مراد لئے ہیں کہ آخرت میں جہنم کا عذاب اور دنیا میں آگ کے اندر جلنے کا عذاب اور اس سے اُن کا مقصد غالباً اس واقعہ کی جانب اشارہ کرنا ہے جس کو ہم ابن ابی حاتم کی روایت سے نقل کر آئے ہیں۔

بصائر و عبر

(۱) جب انسان، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے خوف سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اس کو دولت و حکومت کا نشہ کبر و غرور کی اس بلندی پر پہنچا دیتا ہے جس پر چڑھ کر اس کی نگاہ میں تمام مخلوق ہیچ اور حقیر نظر آنے لگتی ہے تو اخلاقِ حسنہ اور جذبات عالیہ اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی ذات اور ذاتی اغراض کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا۔ تب یکایک غیرت حق کو حرکت ہوتی ہے اور وہ اس کو اس طرح بلندی سے پٹخ دیتی ہے کہ پستی و ذلت کے تاریک غار کے علاوہ اس کے لئے اور کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور "انا ربکم الاعلیٰ" کہنے والا ربِ حقیقی کی ایسی سخت گرفت میں آجاتا ہے کہ پھر کائنات کی بھرپور طاقت اس کے کام آتی ہے نہ عالم ہست و بود کی دولت و حشمت اور اس کو سرنگوں ہو کر یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ "ان بطش ربك لشديد"

(۲) انسان "انسانیت کے امتیازات و خصائص" سے بنتا ہے ورنہ حیوان سے بھی بدتر ہے اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب انسان کو ہمہ قسم کی دولت و حشمت اور سامانِ عیش میسر ہوں اور سطوت و طاقت بھی بے اندازہ نصیب ہو تو اس وقت بھی خدا اور خوفِ خدا سے ہرگز بیگانہ نہ ہو۔ ظفر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

ظفرؔ اس کو آدمی نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

"واذكروا اذ جعلكم خلفاء من بعد قوم نوح وزادكم في الخلق بسطة فاذكروا الاء الله ولا تعثوا في الارض مفسدين" اور اے قومِ عاد! وہ وقت یاد کرو جب تم کو قومِ نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا اور تم کو مخلوق میں ہر طرح کی فراخی عطا کی۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

"ولقد مکنٰکم فی الارض وجعلنا لکم فیہا معایش قلیلاً ما تشکرون"۔ اور ہم نے بے شبہ تم کو زمین میں قدرت وسطوت عطا کی اور تمہارے لئے ان میں زندگی کے سامان بخشے پھر تم میں بہت کم شکر گذار ہیں۔

(۳) انسان جب خدائے تعالیٰ پر یقین محکم کرلیتا اور حلاوتِ ایمانی سے فیضیاب ہوجاتا ہے تو پھر کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت اور عالم کا ہولناک سے ہولناک ظلم بھی اس کو حق وصداقت سے متزلزل نہیں کرسکتا اور وہ کوہِ استقامت بن کر ایثار وقربانی کا پیکر ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اصحاب اخدود کا واقعہ اس کی زندہ شہادت ہے۔

(۴) "جزاء از جنسِ عمل" خدائے تعالیٰ کا قانون ناطق ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ظالم و متکبر کو ظلم وکبر کے عالمِ وجود میں آتے ہی فوراً سزا مل جائے اس لئے کہ بہ تقاضائے صفتِ رحمت یہاں ساتھ ساتھ قانونِ امہال (مہلت دینے کا قانون) بھی کام کررہا ہے۔ البتہ جب اچانک گرفت کرلی جاتی ہے تو پھر چھٹکارا ناممکن ہے۔

اصحابُ الفیل

۵۷۱ء وسنہ ولادت باسعادت (صلی اللہ علیہ وسلم) عام الفیل

حبش۔ حکومت۔ نجاشی۔ مذہب وتمدن۔ یمن وحبش کی کشمکش۔ ابرہۃ الاشرم۔ القلیس اصحٰب الفیل۔ قرآنِ حکیم اور اصحاب الفیل، تفسیری مباحث۔ بصائر وعبر۔

حبش سبا کی بحث میں یہ ذکر آچکا ہے کہ حکومتِ سبا کی حدودِ مملکت جنوبی عرب سے شروع ہوکر شمال عرب اور افریقہ تک وسیع ہوگئی تھیں۔ مورخین کہتے ہیں کہ یمن اور افریقہ کے درمیان بحرِاحمر اور بحرِعرب کے جو گوشے حائل ہیں ان کو بحرِ حبش کہا جاتا ہے اس لئے یمن کے مقابل بحرِ حبش عبور کرکے افریقہ کے سواحل پر جو آبادیاں ہیں اور جو دراصل سبا کی تجارتی نوآبادیاں تھیں اس قطعہ کو عرب جغرافیہ دان حبش کہتے ہیں اور یہ یورپین اقوام میں ایبی سینیا، یونان میں اتھوپیا اور خود اہلِ حبش میں جبیز کہلاتا ہے۔ لغتِ عرب میں "حبش" کے معنی اختلاط وامتزاج کے آتے ہیں۔[۱] چونکہ عرب مورخین کے نزدیک حمیر (سبا) اور حبشہ کے اصل باشندوں کے اختلاط سے یہ قوم عالمِ وجود میں آئی اس لئے انھوں نے ان کا یہ نام تجویز کیا ہے۔[۲]

اور علماءِ انساب کہتے ہیں کہ جب اہلِ حبش (اکسوم) نے یمن پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا تو سبا کے خاندانوں میں یہ کہہ کر سلسلۂ ازدواج قائم کیا کہ اصلاً وہ بن اُدَد (بنی کہلان) کی اولاد میں اور سبا ہی کی ایک شاخ ہیں۔[۳]

اور یورپین مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ اہلِ حبش (اکسوم) غیر مخلوط سامی الاصل نہیں ہیں بلکہ اصل باشندوں کے ساتھ مختلف اقطاعِ عرب کے مختلف قبائل مل گئے ہیں۔[۴]

---

[۱] حبش الشیٔ جمعہ والاحابیش۔ جماعۃ من اناس لیسوا من قبیلۃ واحدۃ۔ [۲] دائرۃ المعارف للبستانی ووجدی ودائرۃ المعارف الاسلامیہ (حبش وسبا)، [۳] الفضد والامم ص ۲۶ لابن عبدالبرؒ۔ [۴] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (سبا) ج ۲۴ ص ۶۲۸۔

بہرحال ان اقوال کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ افریقی قبائل (بنی حام)، سبائی عرب قبائل (بنی سام) کے اختلاط سے قوم "حبش" وجود میں آئی ہے۔

حکومت اس مخلوط سبائی قوم کا دار الحکومت شہر اکسوم تھا جو ملک حبش کے صوبہ "تجرپے" میں بجانب مشرق واقع تھا۔ اس شہر کے آثار اب تک باقی ہیں اور اہلِ حبش اس کو مقدس شہر سمجھتے ہیں[1]۔ کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں حمیر نے ریدان کے قلعہ میں اپنی حکومت کا پرچم بلند کیا اسی زمانہ میں حبش نے اکسوم میں حکومت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً ۱۵۰ ق م سے چھٹی صدی ہجری تک قائم رہی۔

نجاشی عرب، حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی کا لقب دیتے ہیں۔ دراصل یہ حبشی لفظ نجوس کا معرب ہے۔ حبش کی زبان میں نجوس کے معنیٰ "بادشاہ" کے ہیں۔ اصحمہ بن ابجر مشہور نجاشی حبش ان خوش قسمت بادشاہوں میں سے ہیں جنھوں نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا زمانہ پایا اور اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے۔ ان ہی کے زمانہ میں مسلمانوں نے پہلی ہجرت حبشہ کی جانب کی، نجاشی نے ان کو باعزت پناہ دی اور قریش کے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا کہ مسلمانوں کو ان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اور حضرت جعفر بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کی اس تقریر سے متاثر ہو کر جو نجاشی کے دربار میں انھوں نے صداقتِ اسلام اور حقیقتِ اسلام پر کی تھی اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی وہ نجاشی ہیں جن کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ مراسلت رہا ہے اور یہی وہ نجاشی ہیں جن کے انتقال پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غائبانہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو بذریعہ وحی ان کے انتقال کی خبر دی۔

مذہب و تمدن حبش کا مذہب اور ان کا تمدن شروع سے ہی مصر و عرب کے مذہب و تمدن سے متاثر رہا ہے اس لئے ان کا تمدن قریب قریب عرب ہی کا تمدن ہے اور مذہبی اعتبار سے یہ خاندان شروع میں مصری اور یمنی قبائل کی طرح بت پرست تھا لیکن جب رومی بادشاہوں کے اثر سے مصر نے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا ایڈیشن ۹ ج ۱ ص ۶۷ - ۶۶

عیسائیت کو قبول کر لیا تو اس کا اثر حبش پر بھی پڑا اور ۳۳۰ء میں سب سے پہلے اُذینہ نجاشی نے عیسائیت کو قبول کیا۔

حبش و یمن کی کشمکش

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ روم وایران کی رقیبانہ وحریفانہ کشمکش نے یمن اور حبش کو بھی متاثر کئے بغیر نہ چھوڑا اور سیاسی اور تجارتی رقابت نے ان دونوں کے درمیان بھی کشمکش قائم کر دی جس کے نتیجہ میں یمن اور ایران ایک جانب نظر آتے ہیں اور حبش و روم دوسری جانب پھر عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جس زمانہ میں حبش میں عیسائیت کا ظہور ہوا اسی کے قریب یمن میں یہودیت نے قدم جمائے، اگرچہ اس زمانہ میں عیسائیت کو کافی فروغ حاصل تھا مگر نہیں معلوم کن وجوہ کی بنا پر اہل عرب عیسائیت کے ساتھ مانوس نہیں تھے اس لئے یمن نے جب تبدیل مذہب کیا تو یہودیت کو قبول کیا اور عیسائیت کی جانب رجحان نہ کیا مگر چوتھی صدی عیسوی میں جب اُذینہ نجاشی حبشہ نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو یمن اور حبش کے درمیان مذہبی منافرت کے جذبات نے سابق رقابت کو اور زیادہ مشتعل کر دیا اور اسی اشتعال کے نتائج میں "اصحاب اخدود" کا سانحہ پیش آیا اور ذونواس شاہ یمن کے اس ظلم کی دادرسی کے لئے نجران کے ایک سردار دوس بن ثعلبان نے نجاشی کے توسط سے قیصر روم تک فریاد پہنچائی اور قیصر روم نے نجاشی حبش کو حکم دیا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے حمیریوں سے انتقام لے

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

> اوائل چھٹی صدی میں حمیر (ذونواس) نے عیسائیوں کو سخت تکلیف پہنچائی، جسٹینن اول نے شاہ حبش کالب الاصبح کو لکھا کہ ان کی امداد کرے چنانچہ اس نے حمیر کے ہاتھ سے یمن چھین لیا۔ ؎۱

اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ دوس نے قیصر روم کے پاس براہ راست فریاد کی اور قیصر نے ایک حکم نامہ دے کر اس کو نجاشی کے پاس بھیجدیا۔ دوس جب قیصر کا شاہی فرمان نجاشی کے پاس لے کر پہنچا تو وہ ستر ہزار فوج کے ساتھ یمن پر حملہ آور ہوا، ذونواس بھی فوج گراں لے کر مقابلہ پر آیا مگر شکست کھا گیا اور گھوڑے پر سوار دریا میں کود گیا کہ پار اتر کر فرار ہو جائے مگر پار نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا۔ ؎۲

؎۱ ج ۲ اول مضمون ابی سینیا۔ ؎۲ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۹۔

عرب مورخین کہتے ہیں کہ یمن کے فاتح کا نام ارباط تھا اور ابرہۃ الاشرم اس کے ہمرکاب تھا مگر یونانی کہتے ہیں کہ اس کا نام اسمیفوس تھا اور اس زمانہ کے نجاشی کا نام الیباس (الاصبح) تھا۔ سے

غرض مورخینِ عرب کی روایت کے مطابق ارباط یمن کا پہلا گورنر بنایا گیا حتیٰ کہ چند سال کے بعد ابرہہ نے اس پر بغاوت کردی اور اس کو مار ڈالا اور بلا شرکتِ غیرے یمن پر قابض ہو گیا۔ جب نجاشی الاصبح کو یہ خبر پہنچی تو وہ سخت غضبناک ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ ابرہہ کو قتل کر کے اس کے دارالحکومت کو پیروں تلے روند ڈالے گا۔

ابرہہ نے یہ سنا تو بہت گھبرایا اور اپنے جسم سے کچھ خون نکال کر ایک شیشی میں بند کیا اور ایک تھیلہ میں یمن کی خاک بھری اور دونوں چیزوں کو قاصد کے ہاتھ نجاشی کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ جس طرح ارباط آپ کا تابع فرمان تھا اسی طرح یہ غلام بھی ہمیشہ تابع اور مطیع رہے گا جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ حضور والا مجھ سے خفا ہیں اس وقت سے سخت پریشان ہوں اور میں آپ کی قسم کو پورا کرنے کے لئے اپنا خون اور یمن کی خاک بھیج رہا ہوں کہ آپ اس خون کو یمن کی خاک پر ڈال کر پیروں سے روند دیجئے اور اپنی قسم پوری کر لیجئے۔ نجاشی نے ابرہہ کی معافی کو وقت کی مصلحت کے مناسب خیال کرتے ہوئے قبول کر لیا اور یمن پر ابرہہ کی گورنری کو منظور کر لیا اور اس طرح وہ یمن پر مطمئن حکومت کرنے لگا۔ سلہ

ابرہۃ الاشرم | ابرہہ کے متعلق مورخین کا یہ بیان ہے کہ یہ شاہی خاندان سے تھا اور چونکہ نکٹا تھا اس لئے اہلِ عرب اس کو ابرہۃ الاشرم کہتے ہیں، عربی میں "اشرم" نکٹے کو کہتے ہیں اس کی حکومت کا آغاز بعض کے نزدیک ۵۲۵ء اور بعض کے نزدیک ۵۴۳ء سے ہوتا ہے۔ صاحب ارض القرآن دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابرہہ، ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے، یہ عیسائیت میں بہت پرجوش تھا۔ اس نے تمام قلمرو میں عیسائی مبلغ مقرر کئے اور شہروں میں بڑے بڑے گرجا (کنیسا) تعمیر کرائے، ان تمام کلیساؤں میں سب سے بڑا اور مشہور کلیسا دارالحکومت صنعاء میں تیار کرایا جس کو اہلِ عرب "القلیس" کہتے ہیں جو یونانی لفظ

سلہ تاریخ ابن کثیر ج ۲

"کلیسا" کا معرب ہے۔

القلیس | ابن جریرؒ اور ابن کثیر بروایت محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ "کلیسا" بلحاظ فنِ تعمیر عدیم النظیر تھا اور جب یہ تعمیر ہو گیا تو ابرہہ نے نجاشی کو لکھا کہ میں نے آپ کے لئے صنعاء میں ایسا بے نظیر گرجا تعمیر کرایا ہے کہ اس سے قبل تاریخ نے ایسا گرجا کبھی نہ دیکھا ہوگا، اب میری تمنا یہ ہے کہ اقطاع و امصار کے عرب جو مکہ میں کعبہ کا حج کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں ان سب کا رخ اس "کلیسا" کی جانب پھیر دوں اور کل عرب کے لئے یہی مقامِ حج بن جائے، اہلِ عرب نے یہ سنا تو ان میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ [۱]

سہیلی کہتے ہیں کہ ابرہہ نے اس کی تعمیر میں یمن پر بہت سخت مظالم کئے، اہلِ یمن کو جبرًا مزدور بنایا اور یمن کی بے اندازہ دولت اور بیش بہا زر و جواہر کو بے دریغ اس پر صرف کیا۔ یہ بیش قیمت پتھروں کی بہت خوبصورت اور بہت طویل و عریض عمارت تھی اور عجیب و غریب زرکار نقوش سے منقش اور جواہر ریزوں سے مزیّن تھی اور ہاتھی دانت اور آبنوس کے نہایت حسین و جمیل منقش منبروں اور سونے چاندی کی صلیبوں سے اس کو سجایا گیا تھا۔ [۲]

اصحاب الفیل | تاریخ عرب اس کی شاہد ہے کہ تمام اہلِ عرب خواہ وہ کسی بھی فرقہ اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں کعبہ کی بہت زیادہ عظمت کرتے اور اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اس کا حج کرنا مقدس فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ خاص کعبہ کے اندر عرب کے مختلف فرقوں کے بت تین سو ساٹھ کی تعداد میں نصب تھے [۳]

حتیٰ کہ حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل حضرت عیسیٰ حضرت مریم (علیہم السلام) کی تصاویر بھی موجود تھیں اور جب فتح مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ داخل ہوئے ہیں تو آپ کے ارشاد پر جس وقت حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے ان بتوں کو کعبہ سے خارج کیا ہے تو

---

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۰۔ [۲] اس کے آثار عباسی خلیفہ اول سفاح کے زمانہ تک موجود تھے۔ روض الانف ج ۱ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۰۔ [۳] بخاری و مسلم۔

اس وقت بھی یہ تصاویر کعبہ کے اندر موجود تھیں اور ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ ذکر آیا کہ مشرکینِ عرب نے حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی تصویر اس طرح بنائی ہے کہ ان کے ہاتھ میں ۂ پانسے" ہیں تو آپ نے ارشاد فرمایا مشرکین جھوٹے ہیں اور اسمٰعیل (علیہ السلام) کا دامن اس بیہودہ عمل سے پاک ہے۔ ؎۱

بہر حال جب صنعا میں مقیم کسی حجازی نے یہ سنا کہ ابرہہ نے "القلیس" کو اس نیت سے بنایا ہے تو اس کو غصہ آیا اور اس نے ایک شب میں موقعہ پاکر اس کلیسا کو نجس کر دیا ابرہہ کو جب صبح کو یہ معلوم ہوا اور تحقیق کے بعد یہ پتہ چلا کہ یہ کام کسی حجازی کا ہے تو غصہ سے بے قابو ہو گیا اور گرجا کی بے حرمتی دیکھ کر غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھانے لگا اور قسم کھائی کہ اب کعبۂ ابراہیمی کو برباد کئے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا۔ یہ ارادہ کر کے ابرہہ لشکرِ جرار اور ہاتھیوں کی ایک تعداد ساتھ لے کر مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ یہ خبر تمام قبائلِ عرب میں ہوا پر سوار ہو کر پہنچ گئی اور تمام عرب میں اس سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا سب سے پہلے یمن ہی کے ایک امیر ذونضر نے یمن سے نکل کر عرب کے مختلف قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ میں ابرہہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں آپ کو چاہئے کہ اس نیک مقصد میں میرا ساتھ دیں۔ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر ابرہہ کے مقابل آیا اور اس سے جنگ کی مگر شکست کھا گیا اور ذونضر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد قبیلہ بنی خثعم کے سردار نُفیل بن حبیب سے مقابلہ ہوا اور اس کو بھی شکست اٹھانی پڑی اور وہ بھی گرفتار ہو گیا جب ابرہہ طائف پہنچا تو بنی ثقیف کے سردار مسعود بن معتب نے آگے بڑھ کر ابرہہ کو یقین دلایا کہ مجھکو اور میرے قبیلہ کو آپ سے کوئی پرخاش نہیں ہے اس لئے کہ ہم کو یہ یقین ہے کہ آپ "بیت اللات" کے انہدام کا ارادہ نہیں رکھتے جس میں ہمارا سب سے معظم و محترم معبود لات نصب ہے۔ ابرہہ نے ان کو اطمینان دلایا اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا مسعود ثقفی نے راستہ بتلانے کے لئے ایک شخص ابو رغال کو رہنما بنا دیا مگر ابو رغال وادی مغمس پہنچ کر مر گیا۔ کہتے ہیں کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں اس کی قبر کو سنگسار کیا کرتے تھے کہ یہ کعبہ کے انہدام کے لئے راہنما بنا تھا۔

مغمس پہنچ کر ابرہہ نے ایک حبشی فوجی افسر کو جس کا نام اسود بن مقصود تھا حکم دیا کہ وہ مکہ

؎۱ بخاری باب فتح مکہ

جاکر چھاپہ مارے، اسود، مکہ کے قریب پہنچا تو قریش اور دوسرے قبائل کے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو جو کثیر تعداد میں چر رہے تھے" پکڑ کر اپنے لشکر میں لے گیا۔ ان میں عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ شامل تھے۔

اس زمانہ میں عبدالمطلب قریش کے سردار تھے۔ یہ حال دیکھکر قریش، کنانہ، ہزیل اور دیگر قبائل نے آپس میں مشورہ کیا کہ ابرہہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ ہم میں طاقتِ مدافعت نہیں ہے اس لئے ہم کو مکہ چھوڑ کر قریب کی پہاڑی پر چلے جانا چاہیے۔ ابھی یہ لوگ مکہ ہی میں تھے کہ ابرہہ کی جانب سے جناطۃ الحمیری پہنچا اور دریافت کیا کہ مکہ کا سردار کون ہے؟ لوگوں نے عبدالمطلب بن ہاشم کی جانب اشارہ کیا۔ جناطہ نے کہا "میں ابرہہ کی جانب سے آیا ہوں ہمارے بادشاہ کا یہ حکم ہے کہ آپ تک یہ پیغام پہنچا دوں کہ ہمارا ارادہ آپ لوگوں کو نقصان پہنچانے کا نہیں ہے اور نہ ہم آپ سے جنگ کرنے کے لئے آئے ہیں، ہم تو صرف اس گھر (بیت اللہ) کو ڈھانے کے لئے آئے ہیں۔ پس اگر تمہارا ارادہ مقابلہ اور مدافعت کا ہو تو تم جانو اور اگر تم ہمارے اس ارادہ میں حائل نہ ہو تو ہمارا بادشاہ آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا" ہمارا قطعاً ارادہ نہیں کہ ہم تمہارے بادشاہ سے جنگ کریں اور نہ ہم میں یہ طاقت ہے، یہ اللہ کا گھر ہے اور اس کے برگزیدہ نبی ابراہیم کی یادگار، پس اگر اللہ اس کی حفاظت کرنا چاہے گا تو وہ کر سکتا ہے اور اگر اس کو اس کی حفاظت مقصود نہیں ہے تو ہم قوتِ مدافعت کے قابل قطعاً نہیں ہیں۔

غرض اس گفتگو کے بعد عبدالمطلب ابرہہ کے لشکر میں پہنچے اور ایک درباری کی جانب سے سفارش و تعارف پر اس کے سامنے پیش ہوئے۔ عبدالمطلب بہت شاندار اور وجیہ و شکیل انسان تھے۔ ابرہہ نے دیکھا تو ان کے ساتھ عزت سے پیش آیا اور اپنے برابر ان کو جگہ دی۔

گفتگو شروع ہوئی تو ان کی طلاقت لسانی اور خطابت سے ابرہہ بہت زیادہ متاثر ہوا، دورانِ گفتگو میں جب معاملہ پر بات چیت شروع ہوئی تو عبدالمطلب نے شکایت کی کہ آپ کے ایک سردار نے میرے اونٹ گرفتار کر لئے ہیں لہذا آپ سے درخواست ہے کہ ان کو میرے حوالہ کر دیجئے، ابرہہ نے

یہ سنا تو کہا: عبد المطلب! میں تو تم کو بہت فہیم و عقیل سمجھتا تھا لیکن اس سوال پر سخت متعجب ہوں، تم کو معلوم ہے کہ میں کعبہ کو ڈھانے کے لئے آیا ہوں جو تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ باعظمت اور مقدس ہے لیکن تم نے اس کے متعلق ایک جملہ بھی نہیں کہا اور ایسی چھوٹی اور حقیر بات کا ذکر کر رہے ہو؟ عبد المطلب نے جواب دیا" بادشاہ! یہ اونٹ چونکہ میری ملکیت ہیں اس لئے میں نے ان کے متعلق درخواست پیش کی اور کعبہ میرا گھر نہیں خدا کا مقدس گھر ہے وہ آپ اس کا محافظ ہے میں کون ہوں جو اس کے لئے سفارش کروں؟" ابرہہ کہنے لگا: اب اس کو میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ عبد المطلب نے جواب دیا: "آپ جانیں اور رب البیت جانیں" یہاں پہنچ کر سلسلۂ گفتگو ختم ہو گیا اور ابرہہ نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ عبد المطلب کے اونٹ واپس کر دیئے جائیں۔

ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ عبد المطلب کے ہمراہ بنی بکر کا سردار یعمر بن نفاثہ اور بنی ہذیل کا سردار خویلد بن واثلہ بھی تھے روانگی سے قبل انھوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیشکش کی کہ اگر کعبہ کے انہدام سے باز آجائیں تو ہم تہامہ کا ایک تہائی مال آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے۔ مگر ابرہہ نے اپنی طاقت کے نشہ میں اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور اپنے ارادہ پر اڑا رہا تب یہ لوگ ناکام واپس آگئے۔

عبد المطلب نے واپس آکر قریش اور دوسرے قبائل عرب کو جمع کیا اور ان کو تمام گفتگو سنا کر یہ مشورہ دیا کہ اب ہم سب کو قریب کی کسی پہاڑی پر پناہ گزیں ہو جانا چاہیے تاکہ اس منظر کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں۔ جب اہلِ مکہ پہاڑی پر جانے لگے تو عبد المطلب کی قیادت میں کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور اس کی زنجیر پکڑ کر درگاہِ الٰہی میں یہ دعا کی۔

"خدایا! ہم اس بارے میں غمگین نہیں ہیں کہ جب ہم اپنی متاع کی حفاظت کر سکتے ہیں تو اپنی متاع (کعبہ) کی حفاظت کے لئے تجھ کو بھی ضرور حفاظت کرنی ہے اور تیری تدبیر پر نہ صلیب کی طاقت غالب آسکتی ہے اور نہ اہلِ صلیب کی کوئی تدبیر، ہاں اگر تو ہی یہ چاہتا ہے کہ ان کو اپنے مقدس گھر کو خراب کرنے دے تو پھر ہم کون؟ جو تیرا جی چاہے سو کر۔

مورخین نے عبد المطلب کے ان اشعار کو بھی نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنے خاص

انداز خطابت کے ساتھ فی البدیہہ درگاہِ الٰہی میں پیش کئے اور جن کا ترجمہ ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

لا ھم إن العبد یمنع رحلہ فامنع رحالك

لا یغلبن صلیبھم و محالھم غدوا محالك

ان کنت تارکھم و قبلتنا فأمر ما بدا لك[1]

اس کے بعد عبد المطلب اور تمام قریش مکہ کو خالی کر کے قریب کے پہاڑوں پر چلے گئے اور گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو کر حالات کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے دن صبح کو ابرہہ نے اپنا لشکر مکہ کی جانب بڑھایا، اگلی قطاروں میں ہاتھی تھے اور ان کے پیچھے لشکرِ جرار، ابھی یہ لشکر مکہ تک نہیں پہنچا تھا کہ راہ میں ہی اچانک پرندوں کے غول کے غول نمودار ہوئے اور لشکر کے سر پر فضا میں چھا گئے ان کی چونچ اور ان کے پنجوں میں سنگریزے تھے پرندوں نے ان سنگریزوں کو لشکر پر پھینکنا شروع کیا، جس شخص کے سنگریزے لگتے تھے بدن پھوڑ کر باہر نکل آتے تھے اور فوراً ہی اعضاء گلنے اور سڑنے لگتے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر میں سارا لشکر زیروزبر ہو کر رہ گیا۔

. محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اسی حال میں لشکر سے فرار ہو کر یمن اور حبشہ پہنچے اور انھوں نے ابرہہ اور اس کے لشکر کی تباہی کا حال سنایا۔

اور مشہور محدث ابن ابی حاتم بروایت عُبید بن عُمیر نقل کرتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اڑتے ہوئے لشکر پر چھا گئے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے ان کے منہ اور ان کے دونوں پنجوں میں سنگریزے تھے۔ انھوں نے اول تو آواز کی اور پھر لشکر پر سنگریزے مارنے لگے ساتھ ہی تند و تیز ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگباری کو لشکر کے لئے مصیبتِ عظمٰی بنا دیا چنانچہ جس شخص پر یہ سنگریزے گرے بدن پھوڑ کر باہر نکل آئے اور بدن گلنے اور سڑنے لگا اور اس طرح ان سنگریزوں نے

---

[1] تاریخ ابنِ کثیر ج ۲۔

سارے لشکر کو چھلنی کر ڈالا۔ سلہ

محمد بن اسحٰق نے بروایت عکرمہؓ نقل کیا ہے کہ اسی سال عرب میں مرض چیچک کا ظہور ہوا۔

قرآن اور اصحاب فیل قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کا سورۃ الفیل میں اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے گویا یہ ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خدائے تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور ان کے اعزاز و اکرام کا "عظیم الشان نشان" ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تُو نے نہیں دیکھا، تجھ کو معلوم
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝	نہیں کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ
وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝	کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکارہ نہیں بنا دیا؟ اور
تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝	بھیجے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ، وہ پھینک
فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝	رہے تھے ان پر سنگریزے پس کر دیا ان کو کھائے بھوسہ کی طرح۔

سلہ کہتے ہیں کہ ... ابرہہ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ مکہ کی جانب بڑھے جب وہ مکہ کے قریب پہنچی ہے تو ہاتھیوں کی قطار میں سے سب سے پہلے اس ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا جس پر ابرہہ سوار تھا۔ فیلبان اگرچہ اس کے انکس پر انکس لگا رہا اور زبانی ڈپٹ رہا تھا مگر وہ کسی طرح آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن جب اس کو یمن کی جانب چلاتے تھے تو وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگتا تھا اس حال میں اچانک پرندوں کے غول نے آ گھیرا۔

گویا قدرت کی جانب سے ابرہہ کے لئے یہ آخری تنبیہ تھی کہ وہ اب بھی سمجھ جائے کہ اس کا یہ ارادہ باطل اور ناپاک ہے اور یہ جرأت دراصل خدا کی طاقت کو چیلنج ہے اس لئے اس کو اس سے باز آ جانا چاہیئے، لیکن اس بدبخت نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کردار کی پاداش کو پہنچ کر رہا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب پرندوں کی سنگساری سے ابرہہ کا لشکر برباد ہو گیا تو اس میں سے بعض آدمی جو بد حالی کے ساتھ فرار ہو کر یمن پہنچے تھے، ان میں سے خود ابرہہ بھی اس حالت میں پہنچا کہ اس کے تمام اعضا گل سڑ کر گر چکے تھے اور وہ صرف ایک مضغۂ گوشت نظر آتا تھا۔

یعنی قدرت نے جس طرح فرعون کو غرق کر دینے کے بعد اس کی نعش کو اس لئے کنارہ پر پھینک دیا تھا کہ وہ مصر کے قبطیوں اور بنی اسرائیل دونوں کے لئے سامان بصیرت و عبرت بنے اسی طرح یمن اور حبش کے باشندوں کی عبرت کے لئے ابرہہ کو اس حالت میں یمن پہنچایا کہ وہ یہ غور کریں کہ جس شخص نے اپنی مادی قوت کے گھمنڈ پر خدا کی طاقت کو چیلنج کیا تھا آج قدرت کے زبردست ہاتھ نے اس کا یہ حال کر دیا۔ "فهل انتم منتهون"۔

اصحاب فیل کا یہ عجیب و غریب واقعہ ماہِ محرم میں ولادت باسعادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے چالیس یا پچاس روز قبل پیش آیا، اہل عرب میں یہ واقعہ اس درجہ اہمیت اور شہرت رکھتا تھا کہ انہوں نے اس سال کا نام "عام الفیل" (ہاتھیوں والا سال) رکھدیا اور اس کے بعد کے تاریخی واقعات کو اسی سنہ کے حساب سے شمار کرنے لگے جو عیسوی سنہ کے حساب سے ۵۷۰ء اور رومی سنہ کے حساب سے ۸۸۲ سکندری کے مطابق ہوتا ہے

روایاتِ عرب اور عرب مورخین میں یہ واقعہ اس درجہ مشہور و معروف تھا کہ جب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر مکہ کی زندگی مبارک مین سورۃ الفیل کا نزول ہوا تو مشرکین، یہود اور نصاریٰ کی اس عداوت کے باوجود جو آپ کی ذاتِ مبارک سے ان کو تھی کسی سمت سے بھی اس سورۃ میں بیان کردہ واقعہ کے خلاف کوئی صدا بلند نہیں ہوئی کہ یہ واقعہ غلط ہے یا اس کی اصل حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ دوسری ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ یہ واقعہ صرف ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں بلکہ تمام عرب خصوصاً قریش کی عظمت و عزت بڑھاتا تھا اس لئے کسی نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی یہ بات اس لئے غلط ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہو رہی ہے اس وقت عرب میں مذہبی فرقہ بندی کے اعتبار سے عرب کے مختلف حصوں میں عموماً اور نجران کے مشہور شہر میں خصوصاً عیسائیت، مشرکینِ مکہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی حریف اور رقیب تھی اس لئے وہ عربی نژاد ہونے کو قطع نظر کر سکتے تھے مگر عیسائیت کی اس توہین کو جو ان کے زعم میں یا قریشِ مکہ کی عزت کو بڑھاتی تھی اور یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ اور یہود دونوں ایسے واقعہ کو سننا بھی گوارا نہ کرتے جو ان کے قبلہ "صخرۂ بیت المقدس" کے علاوہ ایسے مقام "کعبہ" کی صد ہزار عظمت کا اظہار کرتا ہے جس کے قبلہ بننے کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ . . اور علی الاعلان اس کو جھٹلاتے تھے۔

بہرحال تاریخ کی صاف اور بے لوث شہادت یہ ثابت کر رہی ہے کہ ایک عیسائی معاصر نے بھی اس واقعہ کے خلاف لب کشائی کی جرات نہیں کی اور ہجرت کے بعد جب آپ کی خدمتِ اقدس میں

میں نجران کا وفد (ڈیپوٹیشن) آیا ہے تو وہ اپنے خیال میں اسلام کے خلاف جس قسم کی نکتہ چینیاں کر سکتا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی تکذیب میں جو دلائل دیکھتا تھا وہ سب اس نے پیش کئے لیکن اس واقعہ کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو جس تاریخ نے ساڑھے تیرہ سو برس سے اُن تمام اعتراضات کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے جو معاندین کی جانب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور اسلام پر کئے گئے ہیں وہ کیسے اس اعتراض کو فراموش کر سکتی تھی۔

لہذا تعصب سے پاک حقیقت بیں نگاہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یہ واقعہ اپنی تفصیلات کے ساتھ جس طرح عرب روایات اور مورخین عرب کے یہاں محفوظ اور مشہور ہے وہ قطعاً صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی آخر کون سی وجہ ہے جبکہ سورۃ الفیل کے نزول کے وقت اس واقعہ کو گذرے صرف بیالیس تینتالیس سال ہی ہوئے اور اس لئے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھنے والے ہزاروں اور اپنے والدین اور وطنی روایات سے سننے والے لاکھوں کی تعداد میں تمام اقطاع عرب میں موجود تھے

لیکن صدیوں کے بعد آج یورپین مورخین یہ کہتے ہیں "واقعہ صرف اتنا ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو فوج لے کر نکلا راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہو گئی" اور لطف یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعوی کے لئے نہ کوئی تاریخی دلیل ہے اور نہ معاصرانہ شہادت بلکہ صرف عرب مورخین (محمد بن اسحٰق وغیرہ) کے اس بیان سے "کہ اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا" یہ فیصلہ کر لیتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا یہ کون سا نظریہ ہے کہ ایک روایت کے تمام واقعات کا تو اپنے مخالف سمجھ کر بلا دلیل انکار کر دیا جائے اور اس واقعہ کے ایک ضمنی جملہ کے مفہوم کو بدل کر اور بغیر کسی سند کے اپنی جانب سے اس میں اضافہ کر کے ایک نیا مطلب پیدا کر لیا جائے

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بقول ابن اسحٰق اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا اور غیر اسلامی روایات کے مطابق ہم یہ بھی قبول کئے لیتے ہیں کہ اسی سال یمن اور حبش میں بھی اس مرض نے سر نکالا تاہم اس سے یہ کیسے لازم آجاتا ہے کہ (۱) ابرہہ "کعبہ" کے ڈھانے کے لئے لشکر لے کر نہیں نکلا تھا جیسا کہ مستند تواریخ سے ثابت ہوتا ہے بلکہ رومیوں کی مدد کو نکلا تھا۔

بلکہ رومیوں کی مدد کو نکلا تھا جیسا کہ یورپین مورخین بے دلیل محض اٹکل سے کہتے ہیں۔ (۳) اور یہ کہ ابرہہ کا لشکر ربِّ کعبہ کے حکم سے چڑیوں کی سنگباری سے تباہ نہیں ہوا جیسا کہ معاصر شہادتوں اور تواتر کے درجہ کی روایاتِ ملکی و تاریخی سے ثابت ہے بلکہ چیچک کی وبا سے برباد ہوگیا جس کے لئے تاریخ میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

یہ بات تو ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ ابرہہ "القلیس" کے انتقام میں کعبہ ہی کو ڈھانے نکلا تھا پس اگر سمندر کی جانب سے آنے والی چڑیوں نے سنگریزوں کے ذریعہ سے بحکم ربِّ کعبہ چیچک کے ایسے سخت جراثیم پیدا کر دیے کہ انھوں نے حملہ آوروں کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور سنگریزوں کے لگنے کے فوراً بعد ہی بدن گلنے اور سڑنے لگا اور سارا لشکر زیر و زبر ہو کر رہ گیا۔ تو اس کو کیا کہنا چاہیے؟ اور اگر یہ قادرِ مطلق کی جانب سے ابرہہ اور اس کے لشکر پر عذاب نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ فھل من مدکر؟۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ فطرت پرست "یورپین مورخین" یا تو اس واقعہ کو اس وجہ سے مسخ کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے کعبۃ اللہ کی عظمت اور وقت کی خود ساختہ عیسائیت کی اہانت کا پہلو بہت صاف اور نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اور قدرت کے ہاتھوں حق و باطل کے معرکہ میں حق کے غلبہ اور باطل کی مغلوبیت کا اعلان ہو جاتا ہے یا محض فطرت پرستی اور مادہ پرستی کے جذبہ میں انھوں نے خدائے تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کے مشاہدہ سے آنکھ بند کر لی ہے اور وہ ایسے واقعات کو ناممکن خیال کر لیتے ہیں حالانکہ اسی آسمان کے نیچے تاریخ اقوام و امم نے بارہا ایسے مشاہدے کئے ہیں اور تاریخ نے ان کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے کہ جب بھی کوئی قوم ظلم و تکبر طغیان و عصیان اور فساد و سرکشی میں حد سے گذر گئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اجرامِ ارضی و سماوی میں سے کبھی ہوا کو کبھی برق کو، کبھی بادو باراں کو کبھی ہولناک چیخ کو اور کبھی حیوانات کی یورش کو اس طرح ان پر مسلط کر دیا ہے کہ آنکھوں دیکھتے وہ اور ان کا زبردست تمدن سب کا سب خاک میں مل گیا، عاد، ثمود، نمرود، فرعون، اصحابِ ایکہ اصحابِ اخدود جیسی قومیں اپنے اپنے زمانہ میں زبردست تمدن و حکومت کی مالک تھیں مگر جب انھوں نے

خدا کی زمین میں فساد مچا دیا، زیردستوں پر ظالمانہ قابض ہو کر ان کو کچل ڈالا، شرک وکفر میں بیباک ہو کر خدا کے پیغمبروں کے ساتھ بیرحمانہ سلوک کیا اور انانیت میں آکر بعض نے خدائی کا دعویٰ تک کر دیا تو ان ہی عناصر اور مخلوق ارضی وسماوی کے ذریعہ جن کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے" اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح ہلاک وبرباد کر دیا کہ تاریخ کے اوراق کے سوا دنیا میں ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔

مگر انسان کی اس غفلت کو کیا کیجئے کہ وہ کوتاہی عقل سے گذشتہ واقعات کا انکار کرنے پر بہت جلد آمادہ ہو جاتا اور نئے عذاب اور نئے کرشمۂ غیبی کا طالب ہوتا ہے بلکہ بنی اسرائیل کی طرح بیجا جسارت کے ساتھ یہ کہہ اٹھتا ہے "لن نؤمن لک حتی نری اللہ جھرۃ" اور جب وہ بھی اگلوں کی طرح عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتا ہے تو حسرت وافسوس کرتا ہوا دوسروں کے لئے سامانِ عبرت وبصیرت بن جاتا ہے اور اس وقت کا اعتراف واقرار اور اس وقت کی حسرت وندامت اس کے کسی کام نہیں آتی" فلما راوا باسنا قالوا امنا باللہ وحدہ وکفرنا بما کنا بہ مشرکین۔ فلم یک ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا۔ سنت اللہ التی قد خلت فی عبادہ وخسر ھنالک الکفرون" [1]

یہی حال آج یورپین مادہ پرستوں اور ان کے کورباطن مقلدوں کا ہے، کاش کہ وہ حقیقت حال کو سمجھنے کی کوشش کریں اور حقائق سے انکار اور اس کا استہزاء نہ کریں، انھیں تاریخ کے دہرائے ہوئے اس سبق کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ لارڈ کچنر نے اسی زمانہ میں مصر پر جارحانہ مظالم کرتے ہوئے بڑے تکبر کے ساتھ سربلند کرتے ہوئے یہ کہا تھا "آج میں مصر کا فرعون ہوں" پھر تم نے دیکھا کہ خدائے برتر کے قانون "پاداشِ عمل" نے اس کو وہی جواب دیا جو فرعون کو ملا تھا" فغشیھم من الیم ما غشیھم" اور اس کی غرقِ دریا نعش کو یورپ کی سائنس جدید کا کوئی کرشمہ بھی قعرِ دریا سے اوپر نہ لا سکا۔

---

[1] سورۂ مومن: پس جب دیکھا انھوں نے عذاب ہمارا تو انھوں نے کہا: ہم ایمان لائے ایک خدا پر اور جس چیز کو خدا کا شریک ٹھیراتے تھے اس سے منکر ہوئے پس ان کے اس ایمان نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا جب انھوں نے ہمارا عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے جو ہمیشہ سے اس کے بندوں کے ساتھ جاری ہے اور کافروں نے اس موقعہ پر خسارہ ہی اٹھایا

یہ واقعہ صدیوں کا نہیں ہے، ہماری اور تمہاری زندگی کا واقعہ ہے پھر کیا منکرین خدا اور منکرین قدرت خدا نے اس واقعہ سے کوئی سبق حاصل کیا؟ نہیں، بلکہ انھوں نے یہ کہہ کر ضمیر کی آواز کو دبا لیا کہ یہ تو بخت و اتفاق کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جو ہو گذرا، آخر انھوں نے ایسا کیوں سمجھ لیا؟ قرآن کہتا ہے: صرف اس لئے کہ "لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور" یعنی یہ بات نہیں ہے کہ وہ کور چشم ہیں، وہ خوب دیکھتے ہیں لیکن ان کے سینوں کے اندر ان کے دل اندھے ہو گئے ہیں" اس لئے جو کچھ دیکھتے ہیں اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ لہٰذا ایسی جماعت کے لئے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے: "فانتظروا انی معکم من المنتظرین"۔

سورۂ فیل اور بعض دیگر تفسیر سطورِ بالا میں سورۂ فیل کی تفسیر سلفِ صالحین (رحمہم اللہ) اور جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہے۔ اس تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرمِ کعبہ کی صیانت و حفاظت کے لئے ابرہۃ الاشرم اور اس کے عظیم الشان لشکر کو اپنے قانون "تعذیبِ امم" کے پیشِ نظر اس لئے معجزانہ طور پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے ذریعہ کنکریوں کی مار سے ہلاک و برباد کر دیا کہ قریش باسباب ظاہر اس لشکرِ جرار کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور ربِ کعبہ کو بہر حال کعبہ کی حفاظت مقصود تھی یہ تفسیر لغتِ عرب کی مطابقت، سلف صالحین سے منقول روایات اور تاریخی تواتر کے پیشِ نظر بغیر کسی ردّ و انکار کے تیرہ سو سال سے قابلِ قبول رہی ہے۔

لیکن اس تفسیر کے مطابق چونکہ اس واقعہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اعجازِ قدرت اور معجزانہ فعل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اس لئے گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر یورپ کے الحاد سے مرعوب ہو کر بعض حضرات نے سلف کے خلاف یہ سعی فرمائی ہے کہ خواہ حقیقتِ حال نظر انداز ہو جائے مگر کسی طرح اس واقعہ کا عجوبہ پن دور کر دیا جائے چنانچہ انھوں نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے "تفسیر بالرائے" سے کام لیا ہے۔ تفسیر بالرائے کے یہی معنی ہیں کہ اس پر نظر کئے بغیر کہ اس بارہ میں قرآن خود کیا کہتا ہے اور ایک خالی الذہن انسان اس سے کیا مطلب اخذ کرتا ہے اپنی جانب سے پہلے ایک خاص خیال قائم کر لیا جائے اور اس کے بعد آیات قرآنی کی تفسیر اپنے اس اختراعی خیال پر کر دی جائے۔

تفسیر بالرائے کے اصول پر سورۃ الفیل کی پہلی تفسیر سرسید کی جانب سے تہذیب الاخلاق میں کی گئی، سید صاحب چونکہ بذاتِ خود عربیت (علوم لغتِ عرب) اور ان علوم سے جو قرآنِ عزیز کے حقائق سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہیں بیگانہ تھے اس لئے ان کی یہ تفسیر سرتاسر اغلاط اور لغو تاویلات پر مبنی ہے۔ اور تفسیرِ احمدی کے ان دوسرے مقامات کی طرح جن میں انھوں نے خود قرآنِ عزیز کی دوسری آیات اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول صحیح روایات کے خلاف تفسیر بالرائے بلکہ تحریف معنوی پر غلط اقدام کیا ہے اس مقام پر بھی قرآن کی زبان سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جس کو قرآن کہنے کے لئے تیار نہیں اور اس کے منہ میں وہ بات رکھ دینی چاہتے ہیں جسے خود اس کی زبان قبول نہیں کرتی۔

سرسید کی تفسیر سورۃ الفیل کی بنیاد اس امر پر قائم ہے ایک یہ کہ آیت "وارسل علیھم طیرًا ابابیل" میں "طیر" سے "پرند" نہیں بلکہ "بدفالی" مراد ہے۔ اور کنایۃً یہ لفظ "بلاء و مصیبت" کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

مگر سید صاحب اس بات سے قطعاً ناآشنا ہیں کہ عربی لغت میں "طیر" کے معنی "بدفالی" کے ہرگز نہیں آتے اور وہ لفظ "طائر" ہے جس کے معنی بدفالی کے آتے ہیں اور جس سے کنایۃً "مصیبت و بلاء" کا مفہوم مراد ہو سکتا ہے نیز وہ عربیت کے اس قاعدہ سے بھی قطعاً ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ اگر بفرضِ محال "طیر" کے معنی "بدفالی" کے تسلیم بھی کر لئے جائیں تب بھی اس مقام پر یہ معنی اس لئے نہیں بن سکتے کہ لغتِ عرب میں اس معنی کے ہوتے ہوئے اس کی جانب "ارسال" کی نسبت قطعاً غلط اور باطل ہے بلکہ اس کے لئے "ارسل علیھم" کی جگہ "انزل علیھم"، "نزل علیھم" اور "اتقی علیھم" بولا جاتا ہے۔

حقائق قرآن سے بے بہرہ مگر یورپ کے الحاد و زندقہ سے مرعوب یہ حضرات قرآن کی تفسیر پر جرأت بے جا تو کرتے ہیں مگر اس بات کو یکسر فراموش فرما دیتے ہیں کہ قرآن، عربی زبان میں نازل ہوا ہے "انا انزلناہ قرآنا عربیا" اور تمام زبانوں کی طرح عربی الفاظ و تراکیب کے لئے بھی کچھ قواعد اور شروط ہیں، پس اگر کوئی شخص ان کے خلاف اس کے الفاظ اور اس کے جملوں کے معنی اور مفہوم بیان کرتا ہے تو درحقیقت تحریف معنوی کا مجرم بنتا ہے۔ بہرحال سید صاحب کی تفسیر اس قسم کی اغلاط کا مجموعہ ہے اس لئے

علمی مباحث میں جگہ پانے کے لائق نہیں ہے۔

سلف صالحین کے خلاف سورۃ الفیل کی دوسری تفسیر مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ مصنف نظام القرآن کی ہے، یہ تفسیر سلف اور جمہور کی تفسیر سے قطع نظر کرکے صرف عربیت اور اشعارِ عرب کے پیش نظر کی گئی ہے اور یہ اگرچہ مولانائے مرحوم کی علمی دیانت، تقویٰ وطہارت اور درکِ علوم قرآنی کے پیش نظر ان حضرات کی تفاسیر کی فہرست میں شامل نہیں ہے جنھوں نے محض معجزات کے انکار کی بنا پر تفسیر بالرائے کی مجرمانہ جسارت کی ہے تاہم واقعہ کے عجوبہ پن کو دور کرنے کے لئے مولانائے مرحوم کی یہ سعی معنوی استقام کی حامل ہے اور اس لئے ہم مولانائے مرحوم کی خدمتِ قرآن کا احترام کرتے ہوئے ان کے بعض دوسرے تفسیری مقامات کی طرح اس مقام سے بھی اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔

مولانائے مرحوم کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" نہیں ہے بلکہ "انت" ہے جو "الم تری" کا بھی فاعل ہے اور آیت "وارسل علیھم طیراً ابابیل" اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے جو عام طور پر عربوں کا خیال تھا کہ جب کوئی جرار فوج کسی جانب کا رخ کرتی ہے تو مردار خوار جانوروں کا غول پرے باندھے ساتھ ہوا میں اڑتا چلتا ہے مثلاً ابو نواس کہتا ہے "ہمارے ممدوح کی فوج کے ہمراہ پرندے ہیں کیونکہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے" یا بصرہ میں جنگِ جمل سے جو صورت حال پیش آئی اس کا حال اسی روز اہل حجاز کو اس لئے معلوم ہو گیا تھا کہ مردار خوار جانور انسانوں کے کٹے ہوئے اعضا پنجوں میں لئے اڑتے پھرتے تھے۔

اس تفسیر کے پیش نظر سورۃ الفیل کی آیات کے معنی یہ ہوں گے۔

"تونے دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا؟ اس نے ان پر پرندوں کے پرے کے پرے بھیجے، تو ان ہاتھی والوں کو پتھروں سے مارتا تھا، پھر خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔

اس تفسیر پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

(۱) اگر "ترمی" کا فاعل "انت" ہے "طیر" نہیں ہے تو "بحجارۃ من سجیل" میں "سجیل" کا اضافہ

بے ضرورت بلکہ بے معنی ہوجاتا ہے۔

(۲) اس صورت میں "وارسل علیھم طیراً ابابیل" کی غرض وغایت یا اس کے فائدہ اور مقصد سے خود قرآن خاموش ہے اور اس طرح سورۃ کی آیات کے باہم ربط باقی نہیں رہتا بلکہ نظم وانسجام میں خلل واقع ہوجاتا ہے۔

(۳) شعراءِ عرب کے کلام میں فوج کے ساتھ پرندوں کے غول کا چلنا صرف ایک شاعرانہ تخیل ہے۔ اس لئے قرآن کے بیان کردہ حقائق کی تفسیر کو اس خیال سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۴) واقعہ کے معاصر یا کچھ عرصہ بعد کے عرب شعراء جبکہ خود اپنے اشعار میں اقرار کرتے ہیں کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" ہے نہ کہ "الم تر کی ضمیر انت" (قریش) تو اس سے عدول کیوں اور کس لئے؟

(۵) فجعلھم کعصفٍ مّاکول" میں "فا" ثمرہ اور نتیجہ ہے "ترمی" کا اور "جعل" کا فاعل "رب" ہے تو معلوم ہوا کہ قریش کی سنگباری سے ہاتھیوں والی فوجِ جرار کا کھائے ہوئے بھس کی طرح ہوجانا تب ہی صحیح ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعجازِ قدرت کا عمل بھی ہو ورنہ بلحاظ اسبابِ عادیہ یہ صورت قطعاً غیر معقول ہے اور اگر اس میں اعجاز کا دخل ہے تو جس عجیب بات سے بچنے کے لئے سلف کے خلاف تفسیر کو اختیار کیا گیا تھا اسی کو تسلیم کرنا لازم آجاتا ہے۔

(۶) عرب کی جنگوں میں "محض بدویانہ سنگ اندازی" کے طریقۂ جنگ کے لئے تاریخی سند مطلوب ہے ورنہ خاص اس موقعہ کے لئے طریقۂ جنگ کی یہ تفسیر بے سند رہ جاتی ہے اور ناقابلِ قبول ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بلاغت کا تقاضا ہے کہ جب کسی لفظ کے ساتھ متعلقات کا اضافہ ہو تو ضروری ہے کہ اس کا کوئی فائدہ ہونا چاہئے یعنی اس اضافہ کو کسی مقصد کے لئے لایا گیا ہو ورنہ وہ کلام بلاغت سے گرجائے گا اور اس کا اعجازِ بلاغت تک پہنچنا تو معلوم؟ کیونکہ ایسی صورت میں یہ اضافہ بے معنی اور مہمل ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ اشعار کے تنگ میدان میں بھی بے ضرورت اس کو جائز نہیں سمجھا جاتا۔

دوسرا مقدمہ یہ قابلِ توجہ ہے کہ "سجیل" لغتِ عرب میں کنکری کو کہتے ہیں یعنی اگر مٹی کو آگ میں پکایا جائے تو پکنے کے بعد اس میں پتھر کی سی سختی پیدا ہوجاتی ہے اسی مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹھیکریوں کا

نام عربی میں سجیل اور فارسی میں "سنگِ گِل" ہے بلکہ بعض علماءِ لغت نے تو یہ تصریح کی ہے کہ سجیل فارسی مرکب لفظ "سنگِ گل" کی ہی تعریب ہے یعنی "مٹی سے بنا ہوا پتھر" اور یہ ظاہر بات ہے کہ مکہ کی پہاڑیوں پر چھوٹے بڑے پتھر تو بہر حال کافی ملیں گے لیکن وہاں سجیل کنکریوں کی افراط کے کوئی معنی نہیں۔

پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آیت "ترمیھم بحجارۃ من سجیل" میں قریش کی بدویانہ سنگباری مراد ہے تو اس صورت میں "بحجارۃ" کہنا کافی تھا بلکہ "حجارہ" کو "سجیل" کے ساتھ مخصوص کرنا حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہو جاتا اور ایک غلط بات کا اظہار لازم آجاتا ہے۔

ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ اس مقام پر سجیل سے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یعنی "سنگریزے" مراد ہیں تو یہ اس لئے صحیح نہ ہوگا کہ لغتِ عرب میں پتھر کے چھوٹے ٹکڑے کو "الحصیٰ" کہتے ہیں اور اس کی جمع "حصاۃ" آتی ہے۔ چنانچہ متداول کتب لغت میں بھی بصراحت یہ فرق مذکور ہے۔ "الحصیٰ۔ صغار الحجارۃ الواحدہ حصاۃ" "سجیل۔ الحجارۃ من الطین الیابس" حتیٰ کہ علماءِ لغت اس فرق کو یہاں تک نمایاں کرتے ہیں کہ جو ٹھیکریاں مٹی کے برتن سے ٹوٹ کر وجود میں آتی ہیں اگرچہ وہ سجیل کہلائی جا سکتی ہیں تاہم دقیق امتیاز کے وقت لغتِ عرب میں ایسی ٹھیکری کے لئے لفظ "خذف"[1] مخصوص ہے اور ہم کو یہ حقیقت بھی کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ محققین علماءِ لغت کا یہ دعویٰ ہے کہ لغت عرب میں ایک لفظ بھی دوسرے لفظ کا مرادف نہیں ہے اور جو لفظ بھی فصحا و بلغاءِ عرب کے کلام میں استعمال ہوتا ہے وہ اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور جن کو ہم مرادف الفاظ سمجھتے ہیں ان کے باہم جو نازک اور دقیق فرق ہے ان کی خصوصیات ضرور ملحوظ رہتی ہیں۔

غرض مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے مطابق اس مقام پر "سجیل" کا ذکر نہ صرف بے ضرورت بلکہ خلافِ واقعہ اور بے محل ہوا جاتا ہے۔ اور دوسرے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" مان لیا جائے جیسا کہ جمہور نے اختیار کیا ہے تو بغیر کسی خارجی مدد کے آیات سورۃ اپنا مطلب صاف صاف ادا کر دیتی ہیں اور سیاق و سباق کی مطابقت اور کلام کا انسجام اور اس کی ترتیب بحالہ

---

[1] مشہور اور متداول کتب لغت کا مطالعہ کیجئے۔

باقی رہتی ہے۔

لیکن تفسیر زیر بحث کے مطابق اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" نہیں ہے بلکہ "انت" ہے تو اس صورت میں "ارسالِ طیر" کی غرض و غایت سے قرآن (سورۃ الفیل) قطعاً خاموش نظر آتا بلکہ ربط کلام میں خلل واقع ہو جاتا ہے اس لئے کہ آیت "الم یجعل کیدھم" اور "ترمیھم" کے درمیان "وارسل علیھم" اپنے مقصد کے لئے قطعاً واضح نہیں ہے۔ اور نہ سیاق وسباق میں اس کی جانب کوئی اشارہ موجود ہے بلکہ یہ کلام اجنبی ہے جو اپنی تصریح کے لئے آپ ہی ذمہ دار ہے اور بغیر تصریح کے باعث خللِ کلام ہے اور اگر کلام کی اس اجنبیت کو باہر کی مدد سے حل اور آیت سے پیدا شدہ قدرتی سوال پر اس کی خاموشی کو خارجی تمہید سے دور کیا جاتا ہے تو بلحاظ بلاغتِ کلام ایسے ابہام واجمال سے "کہ جو خصوصی واقعہ کے سلسلہ میں اس طرح کلام میں موجود ہو کہ سیاق وسباق نہ اس کی وضاحت کرتے ہوں اور نہ اس پر دلالت کرتے ہوں" کلام میں نقص لازم آتا اور بے محل ابہام کا الزام وارد ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ "ارسالِ طیر" کی غرض و غایت یا حکمت کا اپنی جانب سے اختراع تو درست سمجھا جائے اور بغیر کسی سند کے یہ کہدیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کو صحنِ حرم میں افتادہ مردہ نعشوں سے پاک کرنے کے لئے بھیجا تھا اور بقاءِ ترتیب مضمون آیات اور حفاظتِ نقصِ کلام کی خوبیوں کے باوجود خود سورۃ میں ہی جو غایت اور حکمت بیان کی گئی ہے اور جو خارج سے مدد کی قطعاً محتاج نہیں ہے یعنی "ترمیھم" تو اس کو رد کر کے غیر معقول قرار دیا جائے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ مردہ نعشوں سے صحنِ حرم کی پاکی کے متعلق صحیح تاریخی روایت میں یہ موجود ہے۔

وذکر النقاش فی تفسیرہ ان السیل — اور نقاش نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ سیلاب آیا اور

احتمل جثتھم فالقاھا فی البحر [1] — اس نے مردہ نعشوں کو بہا کر سمندر میں جا ڈالا۔

اور تیسرے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بالفرض اگر آیت "وارسل علیھم طیرًا ابابیل" کی تفسیر میں صاحب نظام القرآن کے اس استشہاد کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جو بطور تمہید انھوں نے اشعارِ عرب سے

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۷۴۔

کیا ہے اور آیت کی خاموشی کو ختم کرنے کے لئے اصولِ بلاغت کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ابونواس یا نابغہ جیسے شعراءِ عرب کے کلام میں اگر یہ تخیل پایا بھی جاتا ہے کہ "جب کوئی فوج جنگ کے لئے سفر کرتی تھی تو مردار خوار جانور جھنڈ کے جھنڈ اس کے ساتھ چلتے تھے" تو اس تخیل سے یہ کیسے لازم آیا کہ شعراء کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے اور محض شاعرانہ تخیل نہیں ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لئے استشہاد کا کام دے سکے؟ بلکہ جب ہم عرب کی لڑائیوں کے ان تفصیلی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہوئیں اور جن کے جزئی جزئی حالات اور معمولی معمولی واقعات تک کی تفصیلات کتب سیر و تاریخ میں محفوظ ہیں تو ان میں سے کسی ایک جنگ میں بھی اس حقیقت کا ذکر موجود نہیں ہے کہ مردار خوار پرندوں کے یہ جھنڈ کے جھنڈ مسلم یا مشرک لشکر کی ابتداءِ مسافت ہی سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے چنانچہ غزوۂ بدر، احد، حنین، احزاب کے حالات اس قسم کے واقعہ سے قطعاً خاموش ہیں بلکہ اس کے خلاف غزوۂ بدر میں اس کا ثبوت تو موجود ہے کہ زعماءِ قریش کی نعشیں اٹھا کر ایک گڈھے میں ڈال دی گئیں اور یہ ذکر نہیں پایا جاتا کہ مسلمانوں کے یا مشرکینِ مکہ کے لشکر کے ساتھ مردار خوار پرند شروع ہی سے ہم سفر تھے اور انھوں نے ان مردہ نعشوں کو فوراً ہی ٹھکانے لگا دیا۔ اسی طرح عرب کے علاوہ دنیا کی اور جنگوں میں بھی کہیں اس واقعہ کا ثبوت نہیں ملتا پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعراءِ عرب کا یہ کلام شاعرانہ مبالغہ آمیز تخیل سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، دراصل وہ اپنے ممدوح کی بہادری پر مبالغہ آمیزیاں کرتے ہوئے یہ مبالغہ بھی کرتے ہیں کہ انسان تو انسان، مردار خوار جانور تک اس کی بہادری کا یقین رکھتے اور اس لئے اس کے لشکر کے ہمراہ چلتے ہیں حالانکہ حقیقتِ حال صرف اتنی ہوتی تھی کہ جب اس کے ممدوح نے دشمن کو شکست دیدی تو شکست خوردہ لشکر کی نعشوں پر گدھ چیل وغیرہ مردار خوار جانور نوچنے کھانے کو ڈٹ گئے۔ اس عام بات کو شعراء نے شاعرانہ دقیقہ سنجی کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔ کیا ابونواس کا یہی شعر جو مفسر صاحب نے بطور استشہاد پیش کیا ہے خود ہی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ محض شاعرانہ نکتہ سنجی ہے اس لئے کہ وہ کہتا ہے "کہ میرے ممدوح کے لشکر کے ہمراہ پرند

ہیں کیونکہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے" تو کیا یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ان مردار خوار پرندوں کی فراست و کیاست انسانی فراست سے بھی بڑھی ہوئی تھی کہ یہ معرکہ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی یہ بھی سمجھ جاتے تھے کہ فلاں کو فتح اور فلاں کو شکست ہوگی اور اس لئے فاتح کی فوج کے ہمراہ چلتے تھے نہ کہ مفتوح کی فوج کے ساتھ۔

اور اگر اپنی خیالی تفسیر کی خاطر یہ سب عجیب باتیں تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے تو نہ معلوم سلف اور جمہور کی تفسیر ہی کو مان لینے میں کیوں اس قدر جھجک ہے؟

رہا بصرہ میں جنگِ جمل کا ہونا اور حجاز میں پرندوں کے ذریعہ اس طرح اصل کیفیت کا حال معلوم ہو جانا کہ وہ انسانوں کے اعضاء کو پنجوں میں لئے اڑتے تھے تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ یہ مردار خوار پرندے طرفین کے لشکر یا جو فاتح بننے والا تھا اس کے لشکر کے ساتھ ساتھ چل کر میدان معرکہ تک پہنچ کر درختوں اور جھاڑیوں میں خیمہ زن ہو گئے تھے۔ کیا بصرہ میں نسر (گدھ) اور زاغ و زغن نہیں تھے اور کیا جو کچھ آج بھی ہوتا ہے وہی وہاں بھی نہیں ہوا ہوگا کہ جنگ کے نتیجہ میں جب میدان میں نعشیں پڑ گئیں تو فوراً ہی چہار جانب کی بعید مسافت سے مردار خوار پرند آپہنچے اور کٹے ہوئے اعضا کو پنجوں میں لے اڑے اور فضا میں ان کے ذریعہ اہلِ حجاز کو بھی واقعہ کی اصل کیفیت کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ گدھ کے لئے تو ماہرینِ علم الحیوانات کا بیان یہ ہے کہ قدرت نے اس کی قوتِ شامہ کو اس قدر حساس بنایا ہے کہ وہ مردہ نعشوں کی پھیلی ہوئی بو یا فضا میں پھیلی ہوئی گوشت کی بو کو بیسیوں میل کی مسافت سے محسوس کر لیتا اور سرعت رفتار کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا ہے۔

الحاصل، تفسیر زیر بحث میں آیت "وارسل علیھم طیرًا ابابیل" کی تفسیر کے لئے خارج سے ان اشعار کی مدد لینا جو صرف شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہیں اور صحیح تاریخی حقائق سے اعراض کرنا بلکہ خود قرآن کے سیاق و سباق سے ہی بغیر خارجی مدد کے واقعہ کی جو مکمل تصویر بنتی ہے اس سے گریز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

اس تفسیر پر چوتھے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ "ترمی" کا فاعل

"قریش" ہیں تو آیت "فجعلھم کعصف ماکول" میں "الفاء للجزاء" داخل ہوکر یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس کا مدخول (یعنی جس جملہ پر وہ داخل ہے) آیت "ترمیھم بحجارۃ من سجیل" کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جس کا مطلب زیر بحث تفسیر کے مطابق یہ ہوا کہ جب قریش نے سنگ باری کے ذریعہ ان پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے دشمن کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا یعنی سب وہیں کھیت رہے اور ہاتھیوں اور انسانوں سب کا کچومر نکل گیا۔

تو سوال یہ ہے کہ قریش کی بدویانہ سنگ باری سے کسی فوجِ گراں کا کہ جس میں دیوپیکر ہاتھیوں کی قطاریں بھی ہوں اس طرح بھرکس نکل جاتا کہ وہ اگر فرار ہوکر جان بچانا بھی چاہیں تو نہ بچ سکیں اسبابِ عادیہ کے اعتبار سے کیا معقول سمجھا جا سکتا ہے؟ اور کیا عقل یہ نہیں کہتی کہ جب ابرہہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ اور اس کی فوجِ گراں قریش کی سنگ باری کی تاب نہیں لاسکتے تو اس نے کیوں وہاں رہ کر ساری فوج کا بھرکس نکلوا لیا۔ اور کیوں وہ ان ہی وادیوں میں سے ہوکر فرار نہیں ہوگیا جن وادیوں سے ہوکر آیا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قریش کے پاس سنگ باری کے لئے مشینیں نہیں تھیں کہ وہ ابرہہ کے لشکر پر ہزاروں من کی مہیب چٹانیں اس عجلت کے ساتھ لڑھکا دیتے کہ تمام لشکری اور ہاتھی گھوڑے اور اونٹ سب کے سب وہیں دب کر رہ جاتے اور کھائے ہوئے بھس کی طرح سب کا کچومر نکل جاتا اور قریش پر خدائے تعالیٰ کا احسان تو اس صورت میں بھی پورا ہو جاتا تھا کہ اس نے ایسے عظیم الشان لشکر کو بدویانہ سنگباری سے ہزیمت خوردہ بنا کر فرار پر آمادہ کر دیا۔

البتہ یہ بات اس وقت صحیح ہو سکتی اور باور کی جا سکتی ہے کہ اس کو اسبابِ عادیہ کے عام قانون سے مستثنیٰ قرار دے کر قدرتِ الٰہی کے معجزانہ عمل کے ساتھ وابستہ سمجھا جائے اور یہ کہا جائے کہ عام طریقِ جنگ کے خلاف یہ ایک معجزہ تھا مگر اس صورت میں تفسیر زیر بحث کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن عزیز کی اس سورۃ کا اسلوبِ بیان از اول تا آخر کہہ رہا ہے کہ یہاں جو صورتِ حال پیش آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خاص نوامیسِ قدرت کے زیر اثر ہوا ہے اور اسی لیے جن لوگوں نے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھا یا مشاہدہ کرنے والوں کی زبانی سنا ہے وہ اس سے آگاہ

ہیں کہ یہ معاملہ کس درجہ عجیب اور کرشمۂ قدرت کے زیر اثر کس درجہ حیرت زا ہو گذرا ہے اور یہ سبق ہی اور عبرت و بصیرت ہے قریش کے لئے جو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو پیس ڈالنا چاہتے ہیں وہ سمجھیں کہ جس نے کعبہ کی حفاظت کا یہ غیبی انتظام کر دیا وہی آج قبلہ ابراہیمی کعبہ کی صحیح عظمت کے داعی کی حفاظت و صیانت کا ضامن ہے۔

غرض غیر مسلح انسانوں کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کی سنگ باری سے دیو پیکر ہاتھیوں اور آہن پوش لشکریوں کو فرار کا موقع نہ دے کر موقعہ ہی پر کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دینا اسی طرح عجیب ہے جیسا کہ پرندوں کی ماری ہوئی کنکریوں کا بندوق کی گولی کی طرح لگنا یا ایسے مہلک جراثیم کا حامل ہونا جن سے ایک فوجِ گراں کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو کر رہ جائے مگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک معجزانہ نشان تھا۔

اور اگر اس سے انکار نہیں ہے تو پھر کوئی وجہ وجیہ نظر نہیں آتی کہ سلف اور جمہور بلکہ بلا واسطہ خود آیاتِ قرآنی سے حاصل شدہ تفسیر سے عدول کر کے ایسی تفسیر کیوں اختیار کی جائے جو لغت اور روایات دونوں لحاظ سے اسقام و نقائص کی حامل ہو۔

پانچویں اعتراض کا مقصد یہ ہے کہ زیرِ بحث تفسیر میں اگر شعراءِ عرب کے اشعار سے استشہاد کرنا حلِّ مطلب کے لئے ضروری سمجھا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے لئے واقعہ سے متعلق مخصوص اشعار کو جن میں اس واقعہ کے معاصر عبد المطلب کے اشعار بھی شامل ہیں نظر انداز کر دیا گیا بلکہ ان سے اعراض روا رکھا گیا اور شعراءِ عرب کے ایک ایسے تخیل کو بطور استشہاد تسلیم کیا گیا جس کا مبنی بر حقیقت ہونا خود محلِ نظر ہے اور جس کے لئے خود آیاتِ قرآنی میں بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مقام پر موجودگیِ طیر کا معاملہ عام حالات کی بنا پر نہیں تھا بلکہ کرشمۂ قدرت نے خاص صورتِ حال کے ساتھ ان کو بھیجا تھا تب ہی تو ترمیہم سے قبل کی آیت میں "ارسل" فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان کی آمد کو خاص طور سے اپنی جانب منسوب کیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ کارخانۂ عالم میں جو کچھ بھی حرکت و سکون ہے سب اسی کی قدرت کے ہاتھوں سے ہے۔

نیز "ترمی" کے بعد "فجعلہم" کہہ کر یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ "رمی" کا یہ نتیجہ کہ وہ عصف ماکول کی طرح ہو گئے ہمارا اپنا فعل تھا جس میں دوسرے کو کوئی دخل نہیں تھا ورنہ اگر پرندوں کا وجود عام حالات کی بنا پر ہوتا اور "عصف ماکول" نتیجہ ہوتا قریش کے عمل سنگ باری کا تو اسلوب بیان یہ نہ ہوتا بلکہ یوں کہا جاتا "ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ منڈلانے لگے جبکہ تو ان پر سنگ باری کر رہا تھا اور ہو گئے وہ اس سنگ باری سے کھائے ہوئے بھس کی طرح۔"

الحاصل۔ جبکہ عرب قبل از اسلام اور بعد از اسلام دونوں زمانوں میں شعرائے عرب کے وہ اشعار موجود ہیں جن میں صاف صاف اس کا اقرار ہے کہ واقعہ کی نوعیت وہی ہے جس کو روایاتِ سلف ظاہر کرتی ہیں تو ان سے اعراض اور شعراء کے ایک عام تخیل سے استشہاد ہرگز درست نہیں ہو سکتا چنانچہ عبد المطلب کے وہ اشعار جو اس سے قبل ذکر میں آ چکے ہیں اس حقیقت کا صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ قریش نے ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ میں طاقتِ مقامت نہ دیکھتے ہوئے جنگ سے اعراض کیا اور وہ کعبہ کو ربِّ کعبہ کے حوالہ کر کے پہاڑیوں پر پناہ گزیں ہو گئے اور حالات کا انتظار کرنے لگے۔ عبد المطلب کہتے ہیں۔

لاھم ان العبد یمنع رحالہ فامنع رحالک

ہم اگرچہ عاجز ہونے کی وجہ سے شہر سے جا رہے ہیں لیکن یہ کوئی غم کی بات نہیں ہے ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے خدایا! تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔

اور آخر میں دشمن کے مقابلہ سے اپنے عجز اور درماندگی اور بہ ظاہر اسبابِ کعبہ کی حفاظت سے مایوسی کے اثرات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

ان کنت تارکھم وکعبتنا فامر ما بدا لک

اور اگر تیرا یہی منشاء ہے کہ وہ ہمارے کعبہ کے متعلق اپنا منشاء پورا کر لیں تو پھر جو تیرا جی چاہے وہ حکم فرما۔

عبد المطلب، واقعہ اصحابِ فیل کے معاصر ہیں، سردارِ قریش ہیں اور ان کی جانب سے

جنگ و صلح کے ضامن ہیں، وہ اقرار کر رہے ہیں کہ قریش، دشمن کے مقابلہ سے عاجز ہو کر کعبہ اور ابرہہ کے معاملہ کو سپرد بخدا کر کے نتیجہ کے منتظر ہیں مگر اس کے خلاف زیر بحث تفسیر اصرار کرتی ہے کہ قریش نے ضرور ابرہہ کے لشکر سے جنگ کی اور ان کو تباہ و ہلاک کر دیا ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

واقعہ سے متعلق یہ اشعار تمام کتب سیر میں بسند صحیح مذکور ہیں نیز عام روایات کی طرح اس واقعہ سے متعلق دو رائے تک موجود نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی قول تاریخی تواتر سے منقول چلا آتا ہے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا۔

علاوہ ازیں اگر فرض کر لیجئے کہ یہ اشعار عبد المطلب کی جانب غلط منسوب ہیں تب بھی ان اشعار سے یہ تو بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ جن اہل عرب اور اہل حجاز کے سامنے قرآن، واقعہ فیل کو بیان کر رہا ہے ان کے یہاں قبل از اسلام اس واقعہ سے متعلق یہی روایت مسلم تھی جو ان اشعار کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے اور اسی کو انھوں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنا یا واقعہ کا خود مشاہدہ کیا تھا اور اسی لئے عرب بعد الاسلام کے تمام شعراء بھی اپنے اشعار میں بلا اختلاف اسی حقیقت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔

عبد اللہ بن زبعری سہمی اس واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سائل امیر الحبش عنہا ما رائی　　　فلسوف ینبی الجاھلین علیمھا

ستون الفا لم یؤبوا ارضھم　　　بل لم یعش بعد الایاب سقیمھا

حبشہ کے سردار سے معلوم کرو کہ اس نے کیا کچھ دیکھا؟ عنقریب ناواقفوں کو اس واقعہ سے خبردار لوگ واقف کر دیں گے۔ ساٹھ ہزار لشکریوں میں سے کسی کو وطن لوٹنا نصیب نہیں ہوا اور اگر کوئی اِکا دُکا زخم خوردہ بھاگ نکلا تو وہ بھی خدائی مار کے زخموں سے نہ بچ سکا۔

اور عبید اللہ بن قیس کہتے ہیں۔

کادہ الاشرم الذی جاء بالفیـل فولّی وجیشہ مھزوم

واستهلت عليهم الطير بالجندل حتى كانه مرجوم

ابرہۃ الاشرم نے یہ تدبیر چلی کہ کعبہ کے گرانے کو ہاتھیوں کو لے کر آیا پس وہ بھاگا اور اس کا لشکر بھی شکست خوردہ ہو گیا جبکہ پرندوں کے لشکر ان پر کنکریوں کی بارش کرتے ہوئے پرے کے پرے آپہنچے اور سارا لشکر سنگسار ہو کر رہ گیا۔

اور ابو قیس بن اسلت انصاری ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے لئے خدائی مدد کا اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

فلما اتاکم نصر ذی العرش ردهم جنود الملیک بین ساف وحاصب

فولوا سراعا ھاربین ولم یؤب الی اھله ملحبش غیر عصائب

پھر جب عرش والے کے پاس سے تمہارے لئے مدد آپہنچی تو ابرہہ اور اس کے لشکر کا خدائی لشکر (پرندوں کے غول) نے منہ پھیر دیا جبکہ وہ ٹھیکریاں اور کنکریاں برسا رہا تھا پس سارا لشکر جلد ہی شکست کھا کر بھاگا اور ان میں سے چند معمولی ٹولیوں کے سوا کوئی بھی حبشہ تک نہ پہنچ سکا اور سب ہی ہلاک و تباہ ہو کر رہ گئے

چھٹے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام عرب کی مشہور حروب کی تاریخی تفصیلات اشعار عرب، کتب سیرت اور مسلم و غیر مسلم تواریخ میں موجود ہیں جن میں مذہبی، ملکی اور قومی ہر قسم کی جنگوں کے تذکرے پائے جاتے ہیں مگر کسی ایک جنگ کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ اہل عرب یا قریش نے محض بدویانہ سنگباری کی جنگ کی ہو بلکہ اس زمانہ کے متداول اسلحہ تلوار، تیر اور تبر وغیرہ سے ہی وہ جنگ کیا کرتے تھے جس میں منجنیق (گوپھن) کا بھی استعمال ہو جایا کرتا تھا اور اگر یہ تسلیم نہیں ہے تو اشعارِ عرب اور تاریخ عرب سے کوئی سند دکھائی جائے کہ محض سنگ باری کی جنگ کا کونسا مشہور یا غیر مشہور واقعہ تاریخ میں مذکور ہے۔ کیونکہ تاریخ تو آج تک یہی کہتی چلی آتی ہے کہ اہلِ عرب تلوار کے دھنی اور بات بات پر ان کے درمیان تلوار کا نیام سے نکل آنا روز مرہ کا مشغلہ تھا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بدویانہ سنگ باری کا یہ طریقہ اسی خاص واقعہ میں پیش آیا اور اس کے ثبوت کے لئے یہی اول اور آخر مثال ہے تو پھر خود اس مخصوص واقعہ کے لئے تاریخی ثبوت چاہئے

تاکہ یہ متعین ہو سکے کہ سلف اور جمہور سے منقول تفسیر غلط اور یہ جدید تفسیر ہی صحیح تفسیر ہے حالانکہ اس کے لئے کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔

پس اگر نہ خود عرب کے واقعاتِ جنگ میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور نہ خاص اس واقعہ کے لئے کوئی تاریخی شہادت پائی جاتی ہے بلکہ اس کے برعکس حجاز کی قومی روایات، تاریخی وقائع اور سلف صالحین کی نقولِ روایات سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابرہہ کے لشکر جرار کے مقابلہ میں قریش نے کوئی جنگ نہیں کی اور وہ تابِ مقاومت سے عاجز ہونے کی وجہ سے کعبہ کو ربِ کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑی پر پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ تو محض عربیت کے پیشِ نظر دو احتمالات میں سے ایسے احتمال کو اختیار کرنا جو بقاعدۂ عربیت بھی اسقام کا حامل ہے اور تاریخی شہادات اور سلف کی روایات کے بھی خلاف ہے ناقابلِ قبول ہے۔

اس مقام پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جانی چاہئے کہ کتب تفسیر و سیر میں چونکہ بکثرت ایسی روایات پائی جاتی ہیں جن کی نسبت سلف صالحین کی جانب بسندِ صحیح ثابت ہو جانے کے بعد بھی محققین علماءِ تفسیر یہ کہکر اس کے قبول و تسلیم کی قیمت گھٹا دیتے ہیں کہ یہ روایت اسرائیلیات میں سے ہے یعنی گو اس کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوہریرہؓ (رضی اللہ عنہم) کی جانب بلحاظِ سندِ روایت صحیح ہے لیکن وہ ان روایات میں سے نہیں ہے کہ جو نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل یا تقریر و تثبیت سے تعلق رکھتی اور اس بنا پر سلف کا مسلک قرار دی جا سکتی ہو بلکہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ، وہب بن منبہؒ اور کعب احبارؒ جیسے بزرگوں کی ان حکایات و اقوال سے ماخوذ ہے جو یہ حضرات متبحر علماءِ یہود میں سے ہونے کی بنا پر اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کی مجالس میں بیان کیا کرتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اجازت کے پیشِ نظر کہ مسلمانوں کو توراۃ اور اسرائیلی روایات کی نقل اس حد تک جائز ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات کے خلاف نہ ہو" مسلمان ان روایات کو بطورِ حکایت نقل کر دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے سورۃ الفیل کی تفسیر میں بھی کیا یہ امکان ہے کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" کو مان کر

سلف سے جو روایات منقول ہیں وہ بھی اس قسم کی اسرائیلی حکایات ہوں کہ جن کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ آیات کی یہ تفسیر سلف اور جمہور کا متفقہ مسلک نہیں ہے۔ تو اس کا جواب نفی میں ہوگا اور یہ اسلئے کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور جس وقت سورۃ الفیل کا نزول ہوا دونوں زمانوں میں اس واقعہ سے کعبہ کی عظمت کے مقابلہ میں عیسائیت کی سخت توہین لازم آتی ہے اور اسی بنا پر جدید یورپین مورخین بھی اس توہین سے تلملا کر جو قدرت کے ہاتھوں عیسائیت کو کعبۃ اللہ کی عظمت کے مقابلہ میں پیش آئی تھی" اس واقعہ کی بے سند اور دور از کار تاویلات کرتے نظر آتے ہیں اور جبکہ یہود اور علماء یہود بھی اپنی روایتی حاسدانہ خو کی وجہ سے اس مرکز توحید کی عظمت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو بوڑھے پیغمبر ابراہیم (علیہ السلام کی اسمٰعیلی شاخ کی اسرائیلی شاخ پر برتری کا باعث بنا ہے تو بے شبہ یہ کہنا مبنی برحقیقت ہوگا کہ جس واقعہ کی اشاعت یہود و نصاریٰ کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں ہو سکتی اس سے متعلق روایات کو اسرائیلیات اور اسرائیلی روایات کسی طرح نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان روایات کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ جس وقت سورۃ الفیل کا نزول ہوا ہے واقعہ کو گذرے ابھی پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوئے تھے مگر پھر بھی کسی مخالف جماعت یا فرد کو اس کی تکذیب کی جرأت نہ ہوسکی اور کسی ایک شخص نے یہ تک نہ کہا کہ آیات الفیل کا دعویٰ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن قریش میں اس کے متعلق جس قسم کی باتیں مشہور ہیں وہ سرتاسر غلط ہیں۔ اور اگر تکذیب کی گئی ہوتی تو تاریخ اس کو اپنے سینہ میں اسی طرح محفوظ رکھتی جس طرح اسلام کے مخالفوں کی ہر قسم کی ہرزہ سرائیوں اور معاندانہ واقعات و احوال کو آج تک محفوظ رکھا ہے۔

پس ایک منصف مزاج اور طالبِ حق انسان کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ سورۃ الفیل سے متعلق واقعہ کی تفصیلات جس طرح عرب روایات اور شعراءِ عرب کے اشعار اور سلف سے منقول تفاسیر میں منقول ہے وہی صحیح تفسیر ہے۔

سلف سے منقول سورۃ الفیل کی تفسیر اس لئے بھی قابلِ قبول ہے کہ اس کے مطابق وہ اسقام نہیں پیدا ہوتے جو جدید تفسیر کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ اس لئے کہ اگر ہم خارج کی

شرح وتفصیل سے قطع نظر صرف قرآن کی آیات کے معانی ہی میں محدود رہ کر تفسیر کریں تو ربطِ آیات اور ترتیبِ مضمون اور انجامِ سورۃ یہ سب امور بغیر کسی دقت وتاویل کے قائم رہتے اور آیات کے معنی یہ ہوتے ہیں۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا ان کی شرآمیز تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا اور اس نے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیجئے جو ان پر کنکریاں پھینک رہے تھے پس کر دیا پروردگار نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح۔

آیات کے اس صاف اور صحیح ترجمہ پر غور فرمائیے کہ کس طرح ایک آیت دوسری آیت کے ساتھ مربوط اور بغیر کسی اضافۂ مضمون کے خود ہی واقعہ کی پوری حقیقت کا اظہار کر رہی ہے البتہ قرآن میں مذکور معجزات کے سلسلۃ الذہب میں ایک کڑی کا ضرور اضافہ کرتی ہے۔

اور قرآن سے باہر عرب روایاتِ نثر ونظم اس صاف اور واضح حقیقت کے لئے بغیر کسی اضافہ کے صرف تفصیلِ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمہورِ سلف کے خلاف سورۃ الفیل کی تفسیر ایک جدید مدعی تفسیر علومِ قرآن نے بھی کی ہے جدید مفسر صاحب چونکہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیثِ صحیحہ کو بھی ادلہ شرعیہ سے خارج سمجھتے اور انکارِ حدیث کو اپنا مسلک بنائے ہوئے ہیں۔ اور خدمتِ مذہب کے نام سے اپنے مضامین میں اس الحاد کو خاص رنگ میں پیش کرکے انکارِ حدیث کی تبلیغ فرماتے رہتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی نگاہ میں سلفِ صالحین کے مسلک کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی؟

سورۃ الفیل کی یہ تفسیر اگرچہ مصنف نظام القرآن ہی کی تفسیر سے ماخوذ ہے مگر چونکہ جدید مفسر صاحب حقیقتاً علومِ عربیت اور علومِ قرآن دونوں سے ناواقف ہیں اور با ایں ہمہ مختلف زبانوں میں قرآن کی تفاسیر بکثرت وجود میں آنے کے باعث ارزاں شہرت حاصل کرنے کے لئے مفسر بننا چاہتے ہیں اس لئے انھوں نے نظام القرآن میں مسطور تفسیر کے علمی پہلوؤں سے گریز کرتے ہوئے محض خطابیات کے طریقہ پر آیات کے مفہوم ومعانی سے جدا اپنی جانب سے چند ایسے اضافوں کے ساتھ

اس کو پیش کیا ہے جن کو دیکھ کر صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایسے کلام کی تفسیر کر رہے ہیں جوان کے خیال میں خود اپنے ادائے مقصد میں کوتاہ اور اپنے اسلوبِ بیان میں ناقص ہے اور محتاج ہے ایسے چند چند اضافوں کا جن کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوسکے اور جواس کے سقم اور نقص کو دور کرسکیں چنانچہ فرماتے ہیں

جزئی تفاصیل میں جانے کے بغیر یوں سمجھو کہ اہلِ مکہ کی ایک مخالف قوت (ابرہہ) نے چاہا کہ قریش پر حملہ کیا جائے لیکن اس انداز سے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے چنانچہ اس کے لئے اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آپہنچے اور فوج کے مہیب ہاتھی انھیں کچل ڈالیں۔ یہ تھی اس کی خفیہ تدبیر (کید) اس تدبیر کے مخفی رکھنے کے لئے اس نے پورا پورا اہتمام کر لیا، لیکن مشیت کا منشا اہلِ مکہ کا بچانا تھا اس لئے اس مہم میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی۔ جس زمانہ میں بارود اور بم زمین کے ساتھ آسمان کو بھی آتش زار نہیں بنایا کرتے تھے بڑے بڑے لاش خور پرندے شل گدھ، چیل فوجوں کے ہمراہ ہو جاتے، جونہی کوئی فوج نقل و حرکت کرتی یہ اپنی خدا داد فراست سے اندازہ کر لیتے کہ اب رزق کا سامان پیدا ہونے لگا ہے، ہاتھیوں والی فوج نے اپنی نقل و حرکت کو اہلِ مکہ سے چھپائے رکھا لیکن ان پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ (طیرا ابابیل کے معنی جھنڈ کے جھنڈ ہیں نہ کہ وہ ابابیلیں، جو سرِ شام ہمارے ہاں اڑتی پھرا کرتی ہیں)۔ اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو لئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا۔ اہلِ مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے اور اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے اور پہاڑیوں پر چڑھ کر ایسا پتھراؤ کیا کہ فوج کا ہاتھیوں سمیت بھرکس نکل گیا۔ قرآنِ کریم نے اہلِ مکہ کو اس واقعہ کی یاد دلائی ہے۔ [1]

اس تفسیر پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا تفصیلی ذکر تو مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے سلسلہ میں آچکا اس لئے یہ بر خود غلط مقلدانہ تفسیر قابلِ اعتنا نہیں ہے البتہ اس میں اپنی جانب سے نئے اضافات کر کے قرآن کو جو لقمے دیئے گئے ہیں ان کی خرافت کا اظہار از بس۔

---

[1] طلوع اسلام ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۵۸۔

ضروری ہے ۔ مفسر جدید نے ان اختراعی اضافات کو اس لئے بیان کیا ہے کہ ان کی گڑھی ہوئی تفسیر کے مطابق آیات کے مفہوم و معنی میں جو سقم پیدا ہو جاتا ہے اس کو دور اور ربط آیات میں جو خلا واقع ہو جاتا ہے اس کو پُر کر دیا جائے ۔

ایک جانب مصنف نظام القرآن کے تفسیری مطالب کا اپنی جانب انتساب اور دوسری جانب تقلیدی مضمون میں مجتہدانہ غیر علمی اضافات کی اُپج ان دونوں باتوں نے مل کر جدید مفسر صاحب کی تفسیر سورۃ الفیل کو طرفہ معجون بنا دیا ہے ۔

آپ ایک مرتبہ پھر نشان زدہ عبارت کا مطالعہ فرمائیں اور ساتھ ہی سورۃ الفیل کی آیات کے سادہ معانی پر بھی توجہ دیتے جائیں تو آپ خود ہی حیرت و تعجب میں پڑ جائیں گے کہ اصحاب الفیل کے واقعہ سے متعلق یہ تمام کڑیاں جو جدید مفسر صاحب نے بیان فرمائی ہیں کہاں سے حاصل ہوئیں ۔

سورۃ الفیل کی آیات میں تو ان باتوں کا پتہ تک نہیں ہے پھر نہیں معلوم کہ جدید مفسر صاحب نے ان کو کہاں سے اخذ کیا جبکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ واقعہ سے متعلق روایات کو غلط اور "تل کے اوٹ پہاڑ" کی طرح سمجھتے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں خود قرآن کے اندر سے کہہ رہے ہیں کیونکہ واقعہ سے متعلق روایات تو مفسر صاحب کے اضافوں کے برعکس یہ بیان کرتی ہیں (۱) ابرہہ اپنی فوج گراں لے کر کہ جس میں بہت سے ہاتھی بھی شامل تھے علی الاعلان یمن سے مکے کے لئے نکلا تھا اور اسی لئے راہ میں بعض قبائلِ عرب نے مزاحمت کی اور ناکام رہے ۔ (۲) ابرہہ کے اس خروج کی تمام اقطاعِ عرب میں شہرت ہو گئی تھی ۔ (۳) اس لئے ابرہہ کی تدبیر جنگ خفیہ نہیں بلکہ علانیہ تھی (۴) ابرہہ نے حجاز پہنچکر عبد المطلب سے صاف کہدیا تھا کہ مجھے قریش سے کوئی سروکار نہیں میں تو کعبہ کے انہدام کے لئے آیا ہوں (۵) عبد المطلب اور قریش نے تابِ مقاومت نہ رکھتے ہوئے مقابلہ نہیں کیا بلکہ پہاڑی پر چلے گئے ۔ (۶) مشیت کا منشا کعبہ کی حفاظت تھی نہ کہ قریش کا بچانا کیونکہ ابرہہ کعبہ ہی کو گرانے آیا تھا ۔

اب جبکہ نہ قرآن ہی میں ان اضافوں کا ذکر ہے جن کو جدید مفسر صاحب نے بڑے شدومد سے

بیان کیاہے اور نہ ان کی بیان کردہ تفصیلات کے لئے کوئی تاریخی یا حدیثی سند موجود ہے تو ایسی تفصیلات پر مبنی تفسیر بلاشبہ تفسیر بالرائے اور قطعاً غلط اور مہمل ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ مفسر صاحب کے ان تمام اضافوں کی بنیاد صرف لفظ "کید" ہے جو سورۂ الفیل کی آیت "الم یجعل کیدھم" میں مذکور ہے اور جس کے معنی انھوں نے "خفیہ تدبیر" کے کئے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی لغو ہے اس لئے کہ اول تو فقط لفظ "کید" سے یہ داستانِ طویل کس طرح وجود میں آسکتی ہے تاوقتیکہ اس کے لئے قرآن کے اندر یا باہر سے کوئی سند موجود نہ ہو، دوسرے لغتِ عرب میں "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" کے لئے ہرگز مخصوص نہیں ہیں بلکہ کبھی وہ "شر آمیز تدبیر" کے مفہوم کو ادا کرتا ہے خواہ وہ علانیہ ہو یا خفیہ اور کبھی "مطلق جنگ" کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

الکید، الحیلہ، المکر، الخبث، الحرب" اور ان سب معانی میں "شر آمیز تدبیر" کا مفہوم مشترک ہے بلکہ خود قرآن نے لفظ "کید" کو مختلف مقامات پر "مطلق تدبیر" اور "طریق کار" کے معنی میں یا "علانیہ تدبیر" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ	جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا اور آخرت میں
يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَ	کوئی مددگار نہیں دیگا (یعنی خدا سے ناامیدی) تو اس کو چاہئے کہ آسمان
الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ	کی بلندی تک رسّی کھینچ لے جائے اور جب اس کو پکڑے ہوئے معلق ہو تو
اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ	چاہئے کہ اس کو کاٹ ڈالے پھر دیکھے کہ اس کی تدبیر اور اس کا یہ طریق کار
فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ	کیا اس چیز کو کھو دے گا جو اس کو غصہ میں لاتی ہے (یعنی خدا سے ناامید
كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۝ (الآیہ)	ہونا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی بلندی پر رسّی باندھ کر چڑھے
(سورہ الحج)	اور پھر بیچ میں پہنچکر اس کو کاٹ ڈالے)۔

اس مقام پر "کید" کے معنی فقط "طریق کار" اور "مطلق تدبیر" کے ہیں اور خفیہ اور علانیہ دونوں شرطوں سے آزاد۔

اور سورۂ انبیا میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قصہ میں ہے۔

قالوا حرقوه وانصروا الهتكم إن كنتم فعلين ۝ قلنا يانار كوني بردا وسلاما على ابراهيم ۝ وارادوا به كيدا فجعلنهم الاخسرين ۝ (الآیہ)	کافروں نے کہا تم اس (ابراہیم) کو آگ میں جلا ڈالو اور اپنے معبودوں (بتوں) کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو: ہم نے کہا (اللہ تعالیٰ نے کہا) اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کی چیز بن جا اور انھوں نے (کافروں نے) ابراہیم کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا پس ہم نے ان ہی کو خسارہ اٹھانے والوں میں کر دیا۔

اور سورۂ والصّٰفّٰت میں ہے۔

قالوا ابنوا له بنيانا فالقوه في الجحيم ۝ فارادوا به كيدا فجعلنهم الاسفلين ۝ (الآیہ)	انھوں نے (مشرکوں نے) کہا: بناؤ اس کے (ابراہیم کے) لئے ایک عمارت (یعنی آگ کی بھٹی) پھر ڈال دو اس کو آگ کی بھٹی میں پس انھوں نے اس کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا سو کر دیا ہم نے ان کو ذلیل و خوار۔

ان ہر دو مقامات کا سیاقِ کلام یہ ہے کہ جب مشرکین ابراہیم علیہ السلام کی واضح اور روشن دلائل توحید کے مقابلہ میں لاجواب اور عاجز ہو گئے تو قبولِ حق کی بجائے غیظ و غضب میں آکر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ شخص چونکہ ہمارے معبودوں (بتوں) کے حق میں گستاخ ہے اس لئے اس کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر زندہ جلا دو، ابراہیم علیہ السلام اس فیصلہ کو سن رہے تھے مگر انھوں نے مطلق کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے اعلانِ حق پر قائم رہے۔

قرآن نے مشرکین کے اس فیصلہ کو "کید" ہی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ خفیہ نہیں تھا بلکہ علانیہ تھا۔

غرض جبکہ "کید" خفیہ تدبیر کے لئے مخصوص نہیں ہے تو جب تک وضاحتِ کلام یا واضح قرینہ اس کا متقاضی نہ ہو کہ فلاں مقام پر "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" کے ہونے چاہئیں اس لفظ کو اس معنی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

اور ظاہر ہے کہ سورۃ الفیل میں اس تخصیص کے لئے نہ کوئی وضاحت موجود ہے اور نہ کوئی واضح قرینہ۔ حتی کہ خود جدید مفسر صاحب کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس اپنی بیان کردہ خفیہ تدبیر کی داستان کے لئے لفظ "کید" کے سوا نہ قرآن کے اندر سے کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ باہر ہے۔ اس لئے انھوں نے ابرہہ کی لشکر کشی سے متعلق داستان بیان کرتے ہوئے بے سند یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے "یہ بھی اس کی خفیہ تدبیر "کید"، اور یہ بتانے کی زحمت نہیں گوارا کی کہ "کید" کی یہ تفصیل انھوں نے کہاں سے حاصل کی ہے؟

یہ سوال اس لئے اور بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس مقام پر "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" ہی کے ہیں تب بھی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ خفیہ تدبیر کی تفصیلات وہی ہوں جو جدید تفسیر میں بیان کی گئی ہیں۔ کیونکہ "خفیہ تدبیر" کو کسی خاص تفصیل کے اندر محدود کرنے کے لئے دلیل اور سند درکار ہے۔

نیز جبکہ سورۃ الفیل میں "اصحاب الفیل" کا ذکر ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سلسلہ میں محض احتمالاتِ عقلی بے معنی ہیں بلکہ از بس ضروری ہے کہ واقعہ کے بنیادی اجزاء و تفاصیل خود قرآن میں موجود ہوں اور مفسرین کے ذہنی اختراع و ایجاد کے محتاج نہ ہوں اور پھر فروعی تفاصیل بھی اگر بیان کی جائیں تو ان کے لئے بھی داخلی یا خارجی سندِ صحیح کا ہونا ضروری ہے ورنہ تو واقعہ، واقعہ نہیں رہے گا بلکہ ہر شخص کی دماغی اُپج کا کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

جدید تفسیر میں خفیہ تدبیر کی بیان کردہ تفصیلات کے متعلق ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ آیت "وارسل علیھم طیرا ابابیل" میں "ارسالِ طیر" اور "کید" دونوں مل کر اس تفصیل کو ظاہر کرتے ہیں تو یہ کہنا بے لغو اور بے سود ہے اس لئے کہ اس آیت میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ "بھیج دیئے ہم نے ان پر پرند جھنڈ کے جھنڈ" اور جدید مفسر صاحب یہ فرما چکے ہیں کہ آسمانی فضاء میں بارود اور بموں کے استعمال سے قبل مردار خوار جانور لشکروں کے ساتھ ساتھ اس لئے منڈلاتے ہوئے چلتے تھے کہ ان کی فراست راہنمائی کرتی تھی کہ اب ان کی غذا کا سامان مہیا ہونے والا ہے اور شعراءِ عرب کے اشعار سے مصنف نظام القرآن

بھی یہ استشہاد کر چکے ہیں کہ جب دو فریق میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہونے کے لئے اپنی جگہ سے روانہ ہوتے تھے تو ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اڑتے ہوئے چلا کرتے تھے تاکہ مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں۔

تو تفسیرِ جدید کے مطابق ان دونوں باتوں کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ نکل سکتا ہے کہ آیت "وارسل علیھم طیرًا ابابیل" یہ ظاہر کرتی ہے کہ عام حالاتِ جنگ کی طرح اس جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے کہ وہ اس کی مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں لیکن "خفیہ تدبیر کی یہ تفصیلات کہ (۱) قریش پر اس انداز سے حملہ کیا جائے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے (۲) چنانچہ اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آپہنچے (۳) لیکن مشیت کا منشا چونکہ اہلِ مکہ کا بچانا تھا اس لئے اس میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی (وہ یہ کہ) پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو لئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا (۴) اہلِ مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے وہ اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے"۔ نہ آیت "وارسل علیھم (الآیۃ)" سے ظاہر ہوتی ہیں اور نہ "کید" سے اور نہ دونوں کو باہم ملا کر مطلب حاصل کرنے سے ان تفصیلات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے بلکہ یہ تک ظاہر نہیں ہوتا کہ اصحاب الفیل نے جو کید کیا تھا وہ "خفیہ تدبیر" کی ہی صورت میں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جدید تفسیر میں باایں ادعاءِ تردیدِ مسلکِ سلف صالحین (رحمہم اللہ) خفیہ تدبیر کی ان تفصیلات کے لئے کوئی ثبوت بہم نہ پہنچایا جا سکا اور جو کچھ کہا گیا صرف دماغی اختراع سے کہا گیا ہے اور اگر جدید مفسر صاحب کے پاس ان کے لئے کوئی "سند" داخلی یا خارجی" موجود ہے تو اس کے لئے صرف یہی کہا جا سکتا ہے "ھاتوا برھانکم ان کنتم صدقین"

تفسیر زیرِ بحث میں واقعہ سے متعلق تفصیلات کو اپنی جانب سے گھڑ کر جو شکل و صورت دی گئی ہے اس میں جدید مفسر صاحب نے جگہ جگہ اس پر زور دیا ہے کہ اصحابِ فیل کا مقصد

قریش پر حملہ کرنا اور ان کو تباہ و برباد کرنا تھا اور مشیت کا منشا ان کو بچانا تھا اسی لئے وہ سب کچھ ہوا جو سورۂ الفیل میں مذکور ہے لیکن ان تاریخی تفصیلات سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے جو واقعہ سے متعلق کتب سِیَر و تاریخ میں مذکور ہیں اور جو بے تکلف سورہ الفیل کی آیات کی تفسیر یا تفصیل کرتی ہیں تب بھی بخاری و مسلم (صحیحین) کی احادیث تفسیر جدید کے اس بنیادی مقدمہ کے قطعاً خلاف فیصلہ دیتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ "اصحاب فیل" کی یہ جنگ قریش کی تباہی کے لئے نہیں تھی بلکہ "کعبۃ اللہ" کی بربادی کے لئے تھی اور اس لئے مشیت کا منشاء کعبہ کی حفاظت تھا نہ کہ قریش کو بچانا۔

چنانچہ بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت مسور بن مخرمہؓ سے حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے۔

مسلمان اگرچہ جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ زیارت "بیت اللہ" کے مقصد سے مکہ جا رہے تھے مگر مشرکین نے یہ سمجھا کہ جنگ کا ارادہ ہے اس لئے خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) مقدمۃ الجیش بن کر راہ روکنے کے لئے ایک چھوٹے دستہ کے ساتھ آگے بڑھے، صدیق اکبرؓ نے یہ دیکھا تو کہا بخدا ہمارا ارادہ کعبہ کی زیارت کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر مشرکین مکہ ہمارے اس نیک مقصد میں حائل ہوئے تو ہم بے شبہ مقابلہ کریں گے تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راہ بدل کر چلو تاکہ خالد کو پتہ نہ چلے کہ ہم کس طرف سے ہو کر آ رہے ہیں اور یک لخت ان کے سر پر پہنچ جائیں، چنانچہ جب مسلمان ثنیۃ المرار (پہاڑی ٹیلہ) پر پہنچے جہاں سے اچانک خالد کے دستہ پر حملہ کیا جا سکتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی (قصواء) بیٹھ گئی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہرچند اس کو اٹھانا چاہا مگر وہ نہ اٹھی تب سب کہنے لگے۔ قصواء بھڑک گئی اور بے قابو ہو گئی، آپ نے ارشاد فرمایا قصواء نہ بھڑکی ہے اور نہ بے قابو ہوئی اور نہ اس کی یہ عادت ہے بلکہ اس کو اسی خدا نے روک رکھا ہے جس نے ہاتھیوں والوں کو روک دیا تھا (فقال صلی اللہ علیہ وسلم ما خلأت وما ذاك لها بخلق ولكن حبسها حابس الفيل) اور پھر فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے مشرکینِ مکہ "شعائر اللہ" کی عظمت کے سلسلہ میں جس بات کے بھی طالب ہوں گے میں اس کو پورا کروں گا، اس ارشاد کے بعد اونٹنی کو

ڈپٹا اور اونٹنی فوراً کھڑی ہو گئی اور حدیبیہ کے آخری کنارہ جا پہنچی۔[1]

اس روایت میں "حبسہا حابس الفیل" فرماکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ مشرکین مکہ اگر شعائر اللہ کی حرمت کے سلسلہ میں کسی بات کے بھی طالب ہوں گے تو میں اس کو پورا کروں گا تو یہ ارشاد مبارک صاف صاف یہ ظاہر کر رہا ہے کہ "حابس الفیل" نے جس طرح آج پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے یہ عہد لینے کے لئے "قصواء" کو چلتے چلتے روک دیا کہ اگر قریش سے جنگ پیش آئی تو وہ حرم اور کعبہ کی عظمت و حرمت کو مطلق کوئی آنچ نہ آنے دیں گے اسی طرح ماضی میں خدائے تعالیٰ نے اصحاب فیل کو اس لئے برباد کر دیا اور مکہ تک نہ پہنچنے دیا کہ وہ حرم اور کعبہ کو برباد کرنے اور اس کی توہین کرنے آئے تھے۔ چنانچہ خالدؓ کے آمادۂ جنگ ہونے اور صدیق اکبرؓ کے ارادۂ مقاومت نے جب صورتِ حال کو جنگ کے قریب کر دیا تو حرم کے قریب پہنچکر بحکم رب العلمین آپ کی ناقہ بیٹھ گئی تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ اعلان کرایا جائے کہ مشرکینِ مکہ سے ارادۂ جنگ ہے لیکن سرزمینِ مکہ "شعائر اللہ" کا مرکز و محور ہے یہاں کعبۃ اللہ ہے، مقام ابراہیم ہے، مسعیٰ ہے، مسجدِ حرام ہے اور تمام سرزمینِ مکہ "حرم" ہے اس لئے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مشرکینِ مکہ (قریش) سے جنگ کے سلسلہ میں شعائر اللہ کی حرمت و عظمت میں کوئی فرق آنے پائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس حقیقتِ حال کو فراست وحی سے سمجھ رہے تھے اس لئے اول آپ نے ناقہ (قصواء) کے بیٹھ جانے کی وجہ بیان فرمائی اور اس کے بعد یہ مسطورہ بالا اعلان فرمایا اور اب جبکہ کعبۃ اللہ اور شعائر اللہ کی عظمت و حرمت کا وعدہ منجانب اللہ لے لیا گیا تو اس کے فوراً بعد ہی خدا کے حکم سے قصواء خود بخود کھڑی ہو گئی اور منزل مقصود کی جانب گامزن ہوئی:

اور بخاری و مسلم (صحیحین) کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز جو خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے بچا لیا تھا مگر اس نے اپنے رسول اور مسلمانوں کو اس پر

---

[1] غزوۃ الحدیبیہ۔

قبضہ دیدیا تو یاد رہے کہ خدا کے اس حرم کی عظمت اب بھی اسی طرح ہے جس طرح اس سے پہلے تھی۔ جو موجود ہیں ان کو چاہئے کہ غائب تک اس خبر کو پہنچا دیں۔

اس روایت میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف الفاظ میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے قریش کی خاطر نہیں بلکہ کعبۃ اللہ اور حرم کی عظمت وحرمت کی خاطر بچایا تھا اور پھر مسلمانوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لئے کہ کہیں وہ فتح مکہ کے زعم میں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ مکہ میں جنگ کی اجازت نے حرم کی عظمت آج کچھ کم کردی ہے یہ خطبہ ارشاد فرما کر حقیقتِ حال کو واضح فرمایا اور تاکید فرمائی کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں موجود حضرات اس بات کو ان تک پہنچا دیں بلکہ امتِ مسلمہ کو ہمیشہ پہنچاتے رہیں۔

قریش کی بقاء اور ان کی حفاظت اور حرم وکعبہ کی بقاء اور ان کی حفاظت یہ دو جدا جدا حقائق ہیں اور خدائے تعالیٰ نے دوسری حقیقت کی حفاظت کو اپنے ذمہ لیا ہے نہ کہ پہلی کو۔ اس کے متعلق فتح مکہ کے وقت بعض صحابہ کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ اس خاص وقت میں اللہ تعالیٰ نے شاید نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کی خاطر حرم کی عظمت وحرمت کو بھی نظر انداز کردینے کی اجازت دیدی ہے۔ یہی غلط فہمی حضرت سعد (رضی اللہ عنہ) کو پیش آئی اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے بہت سختی کے ساتھ ان کے اس خیال کی تردید فرمائی اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ ان کو ان کے لشکر کی سرداری سے بھی معزول کردیا۔ چنانچہ بخاری نے فتح مکہ سے متعلق حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی طویل روایت میں اس طرح اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

"جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ پرچم لہراتے ابوسفیان کے پاس سے گذرے تو کہنے لگے، ابوسفیان! الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبۃ" (آج کا دن لڑائی کا دن ہے آج کعبہ کی حرمت کو بھی گزند پہنچ جائیگا) یہ سن کر ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ سعدؓ یہ کہہ رہے ہیں آپ نے سن کر فوراً فرمایا "کذب سعد۔ ولکن ھذا الیوم یعظم اللہ فیہ الکعبۃ ویوم تکسی فیہ الکعبۃ" (سعد نے جو کہا جھوٹ کہا، آج کا دن وہ ہے جس میں کعبہ کی عظمت کو اللہ تعالیٰ زیادہ

بلند کرے گا، آج کا دن وہ ہے کہ کعبہ کی حرمت کے لئے اس پر غلاف چڑھایا جائے گا) اور بعض روایات میں اس کے ہم معنی یہ الفاظ ہیں "الیوم یوم المرحمۃ الیوم تکسی الکعبۃ"۔

اس روایت میں اگرچہ "اصحاب فیل" کا کوئی حوالہ نہیں ہے مگر فتح مکہ کے دوران میں اس واقعہ کے پیش آجانے سے یہ حقیقت بہرحال اور زیادہ روشن ہوگئی کہ جنگ وصلح ہر دو حالات میں اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ قریش کی حفاظت نہیں بلکہ کعبہ اور حرم کی حفاظت مقصود رہی ہے۔

فتح مکہ میں آخر قریش مکہ پر ہی ان کی بدعہدی کی وجہ سے چڑھائی ہوئی اور اگرچہ قریش کے فرار سے جنگ کی صورت پیدا نہیں ہوئی تاہم بن قریشیوں نے تھوڑی بہت مزاحمت کی وہ قتل بھی ہوئے مگر "حابس الفیل" نے ان کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو ہی کامیاب کردیا، کیوں؟ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کا اعلانِ جنگ قریش کے لئے تھا اور وہ اس طرح کعبہ اور حرم کی حقیقی عظمت وحرمت کو واپس لانا چاہتے تھے اور "اصحاب الفیل" کو تباہی اور بربادی سے اس لئے واسطہ پڑا کہ اہلِ کتاب ہونے کے باوجود وہ مشرکینِ مکہ (قریش) کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوئے تھے بلکہ مرکزِ توحید "کعبۃ اللہ" کو برباد کرنے کے ارادہ سے آئے تھے۔

ہم نے جدید مفسر صاحب کی مفروضہ داستان کے خلاف نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے اگرچہ مسکت اور فیصلہ کن شواہد پیش کردیئے ہیں مگر ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں اپنی من گھڑت داستان کے سامنے احادیث کی یہ شہادات اسی طرح قابلِ مضحکہ اور لائق سخریہ ہیں جس طرح وہ اپنے مزعومہ اسلامی رسالہ[۱] میں بخاری اور مسلم کی بعض دوسری احادیث کا مذاق اڑا چکے اور ان کو ناقابلِ اعتماد قرار دے چکے ہیں۔ "والی اللہ المشتکیٰ"۔

الحاصل جس طرح موثق دلائل وشواہد کی روشنی میں تفسیر جدید کا یہ بنیادی مقدمہ یا اختراعی تفاصیل کا یہ اہم حصہ بے بنیاد اور باطل ہے۔ اسی طرح باقی حصص کو بھی مصداق قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا" سمجھ لیجئے کہ ان کی حقیقت کیا ہے کہ ان کے لئے نہ قرآن کے اندر کوئی سند موجود ہے ورنہ باہر تاریخ واحادیث سے کوئی ان کو تائید حاصل ہے۔

[۱] طلوع اسلام

مگر تفسیر بالرائے پر جدید مفسر صاحب کی یہ جسارت کس درجہ حیرت زا ہے کہ وہ اپنی خود ساختہ تفسیر کے مقابلہ میں سلف سے منقول تفسیر پر جو کہ احادیثِ صحیحہ، عرب روایات اور تاریخی تواتر سے مؤید ہے "تل کے اوٹ پہاڑ" کی پھبتی کسنے سے بھی نہیں چوکتے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

اگر مفسر صاحب نے باقی تفسیرِ قرآن میں بھی یہی گل کاریاں کی ہیں اور اسلامی خدمت کے لئے اسی پیمانہ کو معیار بنایا ہے تو ہم اس خدمتِ دین کے لئے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے ؎

گر ہمیں مکتب است وہم ملا
کارِ طفلاں تمام خواھد شد

چند تشریحی مطالب

(۱) آیت "وارسل علیھم طیراً ابابیل" میں "ابابیل" پرندوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور اس کے مفہوم میں "جماعت اور تتابع" دونوں ایک ساتھ داخل ہیں یعنی وہ پرند مراد ہیں جو پرے کے پرے بن کر اڑتے اور اڑتے ہوئے ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کرتے ہوں چنانچہ لغت میں ہے "الابابیل" الفرق. طیراً ابابیل: متتابعۃ مجتمعۃ" اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں "ابابیل ای تتبع بعضھا بعضاً" اور یہی مجاہدؒ سے منقول ہے اور پرے کے پرے بن کر اس طرح اڑنا کہ ایک دوسرے کے پیچھے لگا ہوا ہے طبعاً اور فطرۃً بعض چھوٹے پرندوں کا خاصہ ہے بعض علماءِ لغت کہتے ہیں کہ یہ "ابالۃ" کی جمع ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ یہ ایسی جمع ہے جس کے لئے کوئی واحد نہیں ہے۔ "الابابیل۔ جمعٌ لا واحد لہ"۔

(۲) "حجارۃ من سجیل" میں حجارہ کو "سجیل" کے ساتھ مقید کیا ہے یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس سے وہ شے مراد ہے جس کو فارسی میں "سنگِ گل" اور اردو میں "کنگھر" کہتے ہیں اور یہ کہ سنگ اور سنگریزوں کو "سجیل" نہیں کہا جاتا بلکہ ان کے لئے حجر پتھر اور حصٰی (سنگریزہ یا پارہ ہائے سنگ) بولا جاتا ہے۔

اہلِ لغت، پتھر اور پتھر سے مشابہ اشیاء کے درمیان جو فرق بیان کرتے ہیں اس کا حاصل بھی یہی ہے؛
یعنی الحجر پتھر الحصی سنگریزہ یا پارۂ سنگ، سجیل کنکر یا سنگِ گل الخذف مٹی کے برتنوں کے شکستہ ٹکڑے یا ٹھیکری۔

لہٰذا جس شخص نے "حجارۃ من سجیل" کے معنی سنگ یا پارۂ سنگ سمجھ کر "ترمیھم" کا ترجمہ "سنگ باری کر رہے تھے" کیا ہے غلط کیا ہے کیونکہ یہ لغت اور محاوراتِ عرب دونوں کے خلاف ہے۔ اور اس لئے اس معنی پر مبنی تفسیر بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن نے حصیٰ کو مجازاً "سجیل" کہا ہے تو ثابت کرنا چاہئے کہ قرآن نے حقیقت کو چھوڑ کر کس لئے اس مقام پر مجاز استعمال کیا ہے؟

اور اگر "سجیل" کے حقیقی معنی مراد ہیں تو یہ بتانا چاہئے کہ مکہ کی اس پہاڑی پر" جہاں چڑھ کر قریش نے کنگھر مارے" یہ کنگھر کہاں سے آ گئے تھے جبکہ پہاڑیوں پر سنگریزے یا پارہ ہائے سنگ تو ہوتے ہیں مگر کنگھر نہیں ہوتیں؟

(۳) آیت "فجعلھم کعصف ماکول" اس بات کے لئے نص ہے کہ ایسی فوجِ گراں کا جس میں ہزارہا مسلح لشکریوں کے علاوہ دیو پیکر ہاتھی بھی تھے کنکروں کی مار سے کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو جانا اور فرار ہو کر جان بچا لینے کی مہلت تک نہ ملنا قدرت کے اعجاز ہی کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا اور اسبابِ عقلی و عادی کے ماتحت عمل میں نہیں آیا۔

بصائر و عبر مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون "تعذیبِ اقوام و امم" بہ تقاضائے حکمت دو دور میں منقسم رہا ہے

(۱) جب تک پیروانِ دینِ حق اور متبعین پیغمبرانِ خدا کی تعداد معاندین اور مخالفین کے مقابلہ میں اس قدر قلیل رہی ہے کہ عام حالات میں وہ دشمن کے مقابلہ سے معذور رہے ہیں تو اس پورے دور میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے زمین و آسمان یعنی اجرامِ ارضی و فلکی کے ذریعہ ان کی نصرت و حمایت کا سامان ہوتا رہا ہے اور تعلیمِ حق و صداقت سے سرکش اور متمرد قوموں پر قدرت بلا واسطہ مختلف قسم کے زمینی اور آسمانی عذاب نازل کرتی رہی ہے۔ چنانچہ قوم نوح (علیہ السلام)، عاد، ثمود،

اصحابِ ایکہ، فرعون وقومِ فرعون وغیرہ اقوام وامم سب اسی قسم کے عذاب سے ہلاک و برباد کی گئیں۔ یہ دور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) جب جاں نثارانِ حق وصداقت کی تعداد اس درجہ پر پہنچ گئی کہ وہ اگرچہ معاندین کے مقابلہ میں تھوڑے بھی رہے ہوں تب بھی اپنی تعداد کی اکثریت کے لحاظ سے دشمن کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونے کے قابل ہیں تو پھر "سنۃ اللہ" یہی ہے کہ خود خدا کارانِ حق اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ میدانِ کارزار میں نکل کر دشمنانِ خدا کا مقابلہ کریں اور اپنی جان کی بازی لگا کر ملتِ بیضا، اور دینِ حق کی حمایت کے لئے سینہ سپر بنیں اور ساتھ ہی سچے رسولوں کے ذریعہ یہ وعدہ بھی دیا جاتا رہا کہ ثمرہ اور نتیجہ میں فتح ونصرت تمہارا ہی حصہ ہے "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین" اور یہ نصرت وفتح کبھی ملائکۃ اللہ کی معیتِ جہاد سے پوری کی جاتی ہے اور کبھی اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

غرض جن قوموں نے بھی حق وصداقت کے ظاہر ہو جانے اور خدائے برتر کے سچے پیغمبروں کی صداقت کو جان لینے کے بعد ازرہِ عداوت وغرور تعلیمِ حق سے نہ صرف منہ توڑا بلکہ اس کو مٹانے کی سعیِ ناکام کی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کو پاداشِ عمل کے چرخ پر کھینچ کر اور مختلف قسم کے عذاب چکھا کر صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور اگرچہ ان کی تعذیب کا قانون عام طور سے ان ہی دو دوروں کے اندر منحصر رہا تاہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کسی خاص طریق کار کے دائرہ میں محدود نہیں ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ہماری اس تقسیم میں بعض مستثنیات بھی موجود ہوں، البتہ تتبع اور استقرار کے پیشِ نظر یہ تقسیم ضرور صحیح ہے۔

(۳) کعبۃ اللہ کے خلاف اصحابِ فیل کی لشکر کشی اگرچہ قانون تعذیبِ امم کے دوسرے دور میں پیش آئی لیکن ایسے حالات اور ایسے زمانہ میں پیش آئی جو دورِ اول کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں یعنی "فترۃِ وحی" (انقطاعِ وحی) کا زمانہ جس میں نہ کوئی رسول ہے اور نہ کوئی نبی اور نہ وقت کے سچے دین کے حامل ہی نظر آتے ہیں اور اگر کچھ ہیں بھی تو منتشر افراد ہیں نہ کہ با اثر جماعت کہ وہ کعبۃ اللہ کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو بلکہ ایک مدعیِ دینِ مسیحی ہی کعبۂ ابراہیمی اور "مرکزِ توحید" کو برباد کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔

اور مشرکینِ مکہ شرک و کفر کے باوجود اگرچہ "بیت اللہ" کی عظمت کے قائل ہیں مگر ایسی فوجِ گراں سے مقابلہ میں تاب مقاومت نہیں رکھتے کہ جس کے ساتھ دیوپیکر ہاتھی بھی ہیں اور کعبہ کو ربِّ کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ ابرہہ اور اس کا لشکر (اصحابِ فیل) کامیاب ہو اور بیت اللہ برباد کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ کا ایسا نشان (معجزہ) ظاہر کرے جو اسباب و وسائل سے بالاتر ہو کر اس مرکزِ دین اور قبلۂ عالم "کعبہ" کی عظمت و حرمت کی حفاظت کا ضامن ہو، اور ابرہہ اور اس کے لشکر (اصحابِ فیل) کو قانونِ تعذیب امم کے پہلے دور کے مطابق ہلاک و برباد کر دے، تاکہ یہ واقعہ کائناتِ انسانی کے لئے باعثِ عبرت و بصیرت ہو۔ چنانچہ حضرتِ حق کی جانب سے یہی دوسری صورت رونما ہوئی اور اس کے اعجازِ قدرت نے "اصحابِ فیل" پر جو عذاب سماوی نازل کیا تھا سورۂ الفیل میں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔ "ذلك هو الحق" ۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

(۳) یہ واقعہ ولادتِ باسعادت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے چند روز[1] قبل پیش آیا، یہ وہ وقت تھا جبکہ کائنات کا گوشہ گوشہ خداپرستی اور توحید الٰہی کے نغموں سے محروم ہو چکا تھا، خدا کی بھیجی ہوئی سچی تعلیم کے مدعی ہر جگہ موجود تھے مگر سچی تعلیم معدوم ہو چکی تھی اور ادیان و ملل کے اصل خدوخال اور ان کی حقیقی شکل و صورت کو تحریف و تبدیل کے مرض نے مسخ کر دیا تھا، ہر جگہ شرک و کفر کا دور دورہ تھا کہیں اصنام پرستی ہو رہی تھی تو کسی جگہ کواکب پرستی کا شور تھا، کہیں آتش پرستی مقصدِ عبادت تھی تو کسی مقام پر عناصر پرستی دین کا نصب العین بن چکی تھی، کہیں تثلیث نے جگہ پاکر حضرت یسوع کو "مسیح بن اللہ" بنایا تھا تو کسی گروہ نے "عزیر بن اللہ" کہکر مذہب کے نام کا سہارا لیا تھا، غرض ساری کائنات میں یا خدا کا انکار کارفرما تھا اور یا پھر اصنام پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی، حیوانات پرستی نے فلسفیانہ تخیل کی آڑ لے کر شرک و کفر کو نمایاں کیا تھا۔ اس لئے یہاں خداپرستی کے

[1] کتب سیر میں راجح قول یہ ہے کہ یہ واقعہ ولادت باسعادت سے پچاس روز قبل پیش آیا۔

علاوہ اور سب کچھ موجود تھا اگر مفقود تھی تو وہ فقط خدائے واحد کی پرستش ہی تھی۔

ان حالات کے پیش نظر غیرتِ حق کا یہ فیصلہ ہوا کہ اب وہ نورِ ہدایت روشن اور وہ آفتابِ رسالت جلوہ گر ہو جو کسی ایک خاص خطۂ دنیا کو ہی نہیں بلکہ تمام عالم اور ساری کائنات کو "راہِ مستقیم" دکھائے اور کائنات پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی سکھائے۔ وہ گم کردہ راہ انسانوں کو راہ بتائے اور بھٹکے ہوئے غلاموں کو حقیقی مالک و آقا سے ملائے، ٹوٹے ہوؤں کا رشتہ جوڑے اور جاہلیت کی زنجیروں کو توڑے وہ دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحؑ کا حاصل ہو اور اس مرکزِ توحید "کعبہ" کی حقیقی عظمت و حرمت کا داعی جو خدا پرستی کے لئے سب سے پرانا اور مقدس گھر ہے اور جس کی تعمیر کا شرف ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) جیسے پیغمبروں کو بخشا گیا، آج اسرائیل کے خاندان سے "دعوتِ حق" امانت واپس لے لی گئی کیونکہ انھوں نے خیانت کی اور اپنے بزرگوں کی وصیت کو فراموش کر دیا "ان نعبد الٰھک والٰہ ابائک ابراھیم واسحٰق" آج اسمٰعیلؑ کا خاندان نوازا گیا اور خدا کی پاک امانت "سلالۂ اسمٰعیل" کو عطا کر دی گئی۔ وقت آ رہا ہے کہ رسالت و نبوت کا یہ چاند عنقریب غارِ حرا سے کھیت کرے اور آفتابِ حقیقت بن کر دنیا پر چمکے، اس کی ملت، ملتِ ابراہیمی کہلائے اور دنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر (کعبہ) پھر قبلۂ عالم اور مرکزِ کائنات بنے۔

ادھر حضرتِ حق کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے مگر دوسری جانب دنیا کی ایک حقیر ہستی یمن اور حبشہ کی فانی حکومت کے زعم میں یہ چاہتی ہے کہ مرکزِ توحید اور کعبۂ ملتِ حق "بیت اللہ" کو برباد کرے اور صفحۂ ہستی سے مٹا کر مرکزِ تثلیث صنعاء کے "القلیس" کو کائناتِ انسانی کا قبلۂ مقصود اور کعبۂ محمود بنائے اور اس طرح توحیدِ خالص کی جگہ تثلیث کی شرک پرستی کو فروغ دے، وہ سمجھتا ہے کہ میری فوجِ گراں اور شوکت و ہیبت کے مقابلہ سے سارا عرب عاجز و درماندہ ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ مہیب ہاتھیوں کا یہ لشکر جب "کعبۃ اللہ" کو منہدم کرنے کے لئے آگے بڑھے گا تو خدا کے اس گھر کو کوئی نہ بچا سکے گا، اس لئے وہ کرّوفر اور ہیبت و عظمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یمن سے چلتا ہے اور راہ میں جو قبائل مزاحمت کرتے ہیں ان کو پامال کرتا ہوا آگے

بڑھتا ہے، سردارِ قریش عبد المطلب جب اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو وہ اپنے غرور و نخوت کے ساتھ یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ ہمارا مقصد قریش سے نبرد آزما ہونا نہیں ہے بلکہ کعبہ کا انہدام و فنا مقصود ہے۔ عبد المطلب اچھوتے اور عبرت آموز انداز میں اپنی بے چارگی اور تابِ مقاومت سے معذوری کا اظہار کر کے کعبہ کو ربِّ کعبہ کے سپرد کر کے قریش سمیت ابرہہ کی راہِ مزاحمت سے ہٹ جاتے ہیں۔

اب مقابلہ انسانوں کا انسانوں سے نہیں ہے بلکہ فرعون صفت اور ہامان نما انسانی طاقت خدا کی طاقت سے ٹکرانا چاہتی ہے۔ یہاں انسانی مقاصد، دوسرے انسانوں کے مقاصد سے متصادم نہیں ہیں بلکہ حضرتِ حق کے مقصدِ پاک سے ایک ناپاک ہستی کا ارادۂ ناپاک تصادم چاہتا ہے پھر نتیجہ کیا نکلا؟ وہی جو ہونا چاہیے تھا کہ خدا کی معجزانہ قدرت کے سامنے انسانی قوت پاش پاش ہو کر رہ گئی اور اصحاب الفیل کا مقصدِ شر حضرتِ حق کے مقصدِ خیر کے مقابلہ میں "خسر الدنیا والآخرہ ذلک ھو الخسران المبین" کا مصداق بن کر رہ گیا۔

آج نہ اصحاب الفیل کا نام و نشان باقی ہے اور نہ القلیس صنعاء کا اور نہ وہ قریشِ مکہ ہی باقی ہیں جن کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا تھا لیکن قبلۂ توحید اور مرکزِ صداقت "کعبۃ اللہ" اسی طرح اپنی عظمت و جلالت کے ساتھ قائم و دائم ہے اور آج بھی قرآنِ عزیز اس کی رفعتِ شان کا ببانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ بیشک سب سے قدیم وہ گھر جو انسانوں کی "خدا پرستی" کے لئے بنایا گیا یقیناً وہ ہے جو مکہ میں ہے جو سر تا سر مبارک اور جہانوں کے لئے (مرکزِ) ہدایت ہے۔

(۴) سورۂ الفیل کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس سورۃ میں ایک متمرد اور سرکش جماعت کی ہلاکت کا عبرت آموز واقعہ مذکور ہے۔

دوسرے یہ کہ اس واقعہ سے منجانب اللہ کعبۃ اللہ کی حرمت و عظمت کی حفاظت کا بصیرت افروز نتیجہ نکلتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے جو غرض و غایت ہے وہ اپنے اندر کیا اسرار و حکم محفوظ رکھتی ہے تو اگرچہ خدا کی حکمتوں کا احاطہ انسانِ فانی کے حیلۂ امکان سے باہر ہے تاہم بنظرِ استحسان دو حکمتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

(الف) یہ واقعہ ولادت باسعادت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے ایک زبردست "نشان" کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ نظامِ قدرت کے ابھرے ہوئے نقوش ہم کو یہ خبر دیتے ہیں کہ اس کارگہ عالم میں جب بھی کوئی عظیم انقلاب بپا ہوتا ہے تو اس کے وجود سے قبل ضرور ایسے آثار اور ایسی علامات ظاہر ہوتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر عبرت نگاہ اور حقیقت آگاہ انسان آنے والے انقلاب کا اندازہ کر لیتا ہے اور انسان ہی نہیں بلکہ حضرت حق نے حیوانات تک میں احساس جزئیات کا ایسا ملکہ ودیعت کیا ہے کہ وہ طوفانِ باد و باراں اور بھونچال جیسے حوادث کا پتہ صرف علامات و آثار سے پا لیتے اور وقت سے قبل ہی اپنے اضطراب و کرب کے ذریعہ دوررس انسانوں کو ان حقائق کا علم کرا دیتے ہیں

آپ دور نہ جائیے روزانہ ہونے والے انقلاب ہی کو دیکھئے اور اس سے اس حقیقت کی صداقت کو وزن کیجئے، شبِ دیجور کی حیاتِ چند ساعت کا جب پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور طلوعِ آفتاب عالمتاب کی وجہ سے اس کو پیامِ مرگ ملجاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ رات کے آخری کنارہ پر پہنچ کر وہ کائنات کو اپنے رخِ روشن کا جلوہ دکھا دیتا ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اول افقِ مشرق میں سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ تاریکی کو روشنی سے بدلتا جاتا ہے اس وقت ہر ذی ہوش یہ سمجھ جاتا ہے کہ خورشیدِ خاور کی تنویر کا وقت آپہنچا گو نیند کے ماتے شبِ تاریک کی مرگِ ناگہانی اور سپیدۂ صبح کی منادیِ طلوعِ آفتاب سے غافل سوئے پڑے رہتے ہیں لیکن مردِ باہوش اس علامت کو دیکھ کر روزِ روشن کی آمد کا پتہ لگا لیتے اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاتے ہیں تاکہ آفتابِ عالمتاب کی ضو فشانی سے قبل ہی خود کو اس کے خیر مقدم کے لائق بنا سکیں۔

عالمِ مادی کے اس انقلاب کی طرح عالم روحانیات میں بھی "سنۃ اللہ" اسی طرح جاری و ساری ہے کیونکہ تمام عالمین کا "رب" ایک ہی" وحدہ لاشریک لہ ہستی ہے اس لئے ہر عالم کے لئے

اس کے نوامیس و قوانین میں بھی وحدت اور یکسانیت جلوہ گر ہے۔

کائناتِ روحانی میں عالم مادی کے وجود ہی سے یہ انقلاب تو ہوتا ہی رہا کہ جونہی توحیدِ الٰہی کی روشنی پر کفر و شرک کی تاریکی نے غلبہ پایا ناموسِ الٰہی نے کسی روشن ستارہ یا قمر لیلۃ البدر کے ذریعہ اس ظلمت کو کافور کر دیا لیکن ابھی عالم ایسی روشنی کا طلبگار تھا کہ اس کے طلوع کے بعد روشنی اور تاریکی کا فرق اس طرح نمایاں ہو جائے کہ پھر بھی ظلمت کفر توحید پر اس طرح نہ چھا سکے کہ سراب اور آبِ حیات کے درمیان امتیاز مشکل ہو جائے۔ ہاں۔ اگر روزِ روشن کی موجودگی میں بھی کسی شپّر کو آفتاب کی روشنی نظر نہ آئے تو یہ ایک جدا بات ہے کہ قصور کس کا ہے، آفتاب کا؟ یا شپرۂ چشم کا؟

غرض وہ وقت جب قریب آ پہنچا کہ نبوت و رسالت کا آفتاب عالمتاب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) طلوع ہو اور شرک و کفر کے پردہ ہائے ظلمت " ظلمات بعضها فوق بعض " چاک کر دیئے جائیں تو آسمان و زمین سپیدۂ صبح سعادت کے ایسے آثار و علائم نمودار ہونے لگے کہ چشم حق بیں اور دلِ حق آگاہ نے یہ محسوس کر لیا کہ عنقریب عالم روحانیات میں عظیم الشان انقلاب بپا ہونے والا اور وہ وقت آنے والا ہے کہ داستانِ شب سرد پڑ جائے گی اور حقیقت کا آفتاب چمک اٹھے گا اور دل و زبان یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم   چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

عالمِ روحانیات کا یہ سراجِ منیر ظاہر ہے کہ سرزمین مکہ سے طلوع ہونے والا تھا اور اس کی دعوتِ عام کا محور و مرکز بھی مقدس مقام بننے والا تھا جہاں عبادتِ الٰہی کا سب سے پرانا گھر "کعبۃ اللہ" قبلۂ عالم و عالمیان تھا، پس ایسے عظیم الشان انقلاب کے وقت کفر و شرک کی ظلمتِ شب نے ایک آخری سہارا لیا اور نورِ آفتاب پر غالب آنے کی کوشش کی یہی وہ منظر تھا جو ابرہہ اور اس کے لشکر اصحابِ فیل کی بدولت دنیا کے اس پردۂ متحرک پر نظر آیا کہ کسی طرح مرکزِ توحید "کعبۃ اللہ" کو برباد کر کے مرکزِ تثلیث "القلیس" کو مرجعِ خلائق اور مرجعِ عبادت بنا دیا جائے تاکہ ظلمتِ شرک ایسا فروغ

---

[1] قرآن نے مادی آفتاب کو بھی "سراج" ہی کہا ہے "وجعل الشمس سراجا" اس لئے روحانی آفتاب کو بھی سراجِ منیر کہا

پائے کہ طلوعِ آفتاب کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

مگر قدرت کے منشا کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور خدا کے ارادہ پر کوئی ہستی غالب نہیں آسکتی لہذا دنیا نے دیکھا کہ یہ منظر بہت جلد ہی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوگیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور تھوڑے سے عرصہ کے بعد ہی رسالت و نبوت کے آفتابِ عالمتاب نے روشن ہو کر ساری کائناتِ الٰہی کو منور کر دیا۔

تو اب کہنا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت سے قبل جو "نشان" ظہور میں آئے اور صبح سعادت کے لئے آثار و علامات کہلائے ان ہی میں سے "اصحابِ فیل" کا واقعہ بھی ایک زبردست "نشان" اور "عظیم المرتبت" علامت ہے۔

(ب) اس واقعہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش کو اپنے بہت بڑے احسان کو یاد دلایا ہے کہ وہ یہ نہ بھول جائیں کہ جس وقت وہ "کعبہ" کی عظمت کے قائل ہونے کے باوجود ابرہہ (اصحابِ فیل) کے اس مقابلہ سے عاجز رہے تھے جس میں اس نے "کعبہ" کی بربادی کا بیڑا اٹھایا تھا اس وقت ہم نے اپنی قدرتِ کاملہ کے "نشانِ اعجاز" سے وہ کر دکھایا کہ دشمن کی شر آمیز تدبیر اور اس کا ارادۂ بد دونوں خاک میں مل کر رہ گئے۔

کیا تم نے اس عبرت زا واقعہ سے یہ سبق حاصل نہیں کیا کہ یہ سب کچھ تمہاری خوشنودی کے لئے نہیں تھا جبکہ تم شرک کی تاریکیوں میں غرق اور کفر کی آلودگیوں میں ملوث تھے بلکہ "کعبہ" کی اس عظمت کی بقا کے لئے تھا جس کی تعمیر بوڑھے پیغمبر ابراہیم (علیہ السلام) اور جوان پیغمبر اسمٰعیل (علیہ السلام) کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور جس کے متعلق انھوں نے یہ فرمایا "ربنا انی اسکنت من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرعٍ عند بیتك المحرّم" (اے میرے پروردگار! میں نے بسایا ہے اپنی بعض اولاد کو بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے باعزت و حرمت گھر کے پاس)۔

اور اس حرمِ مقدس کی خاطر جس کے لئے ابراہیم (علیہ السلام) نے یہ دعا کی "واذقال ابراھیم رب اجعل ھذا البلد اٰمناً واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام" (وہ وقت یاد کرو! جب ابراہیمؑ

نے کہا: اے میرے پروردگار تو اس شہر "مکہ" کو امن والا کر دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے بچا کہ ہم بت پرستی میں مبتلا ہوں)۔

آج پھر وہ وقت ہے کہ خدا کا پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کعبہ کی حقیقی عظمت قائم کرنا اور اس کو بتوں اور بت پرستی کی تلویث سے پاک کرنا چاہتے ہیں مگر تم ان کو اور مسلمانوں کو ضعیف اور کمزور سمجھ کر اور اپنی قوت کے غرور اور گھمنڈ میں اکڑ کر آڑے آتے ہو تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس ذات نے "اصحاب فیل" کے کبر و غرور کو خاک میں ملا دیا تھا وہ تمہارے غرور کا بھی یہی حشر نہیں کر سکتا سمجھو اور معاملہ کی حقیقت پر غور کرو اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے باز آجاؤ۔

اس بات کی تائید سورۃ الفیل سے متصل سورہ القریش سے بھی ہوتی ہے اس لئے کہ اس سورۃ میں قریش کو یہ توجہ دلائی گئی ہے یا ان پر اپنے اس احسان کو ظاہر کیا گیا ہے کہ عرب قبائل کے باہم بات بات پر جنگ و جدل اور معمولی معمولی معاملہ پر حرب و ضرب کے باوجود وہ حرم مکہ میں کس طرح مامون و محفوظ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی خدمت کے انتساب کی وجہ سے حرم سے باہر بھی سردی اور گرمی کے دو موسموں میں اپنے محبوب تجارتی سفروں میں شام اور یمن تک بے خوف و خطر آتے جاتے ہیں اور کوئی آنکھ بدل کر بھی ان کی جانب دیکھنے نہیں پاتا۔

تو کیا وہ اس احسان کے شکر گذار نہیں ہوتے اور حرم اور کعبہ کی حقیقی عظمت کو سر بلند کرنے کے لئے خدا کا آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو جس صداقت کی جانب بلاتا ہے اس پر لبیک کہنے کو تیار نہیں ہوتے؟ ان کے لئے ہرگز یہ بات زیبا نہیں دیتی . . . . "فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع وامنھم من خوف" پس ان کو چاہئے کہ وہ اس گھر کے پروردگار کی ہی پرستش کریں کہ جس نے ان کی بھوک کے لئے سامان رزق بہم پہنچایا اور ان کو خوف و خطر سے مامون و محفوظ کر دیا۔

(۵) ابرہہ مذہباً عیسائی تھا اور اس لئے وہ بیت اللہ کعبہ کی عظمت کو کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا اور اس کا وجود گویا ایک خار تھا جو کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ اس نے

سوچا کہ "کعبہ" معمولی پتھروں کی ایک سادہ عمارت ہے، اگر اس کے مقابلہ میں ایک ایسی خوبصورت اور بے نظیر عمارت بشکل کلیسا (گرجا) تیار کی جائے جو بیش قیمت پتھروں اور جواہرات سے مزین ہو تو اس طرح میں سارے عرب کی توجہ "کعبہ" سے ہٹا سکوں گا اور اس جدید "معبد" کو مرجعِ خلائق بنا سکوں گا یہ سوچ کر ایک طرف اس نے یمن کے دارالحکومت صنعاء میں ایک بے نظیر گرجا "القلیس" بنوایا اور دوسری جانب ایک معمولی واقعہ کو حیلہ بنا کر کعبہ کی بربادی کا تہیہ کیا، نتیجہ جو کچھ ہوا مفصل مذکور ہو چکا۔ لیکن اس واقعہ میں اس جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ عیسائیوں کو ہی اس بیت اللہ "کعبہ" کے ساتھ عداوت رہے گی اور وہ اپنے غیر متمدن اور متمدن ہر زمانہ میں اس کے خلاف اپنی عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے اور ہمیشہ اس مرکزِ توحید سے کے درپے رہیں گے۔ چنانچہ تاریخِ ماضی اس کی شاہد ہے کہ جب کبھی نصاریٰ کو اس کا موقع میسر آیا انھوں نے عملاً اپنی عداوت کا اظہار کئے بغیر نہ چھوڑا اور اگرچہ خدائے تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ہمیشہ ان کے ارادوں کو ناکام رکھا مگر وہ بہر حال اپنے قلبی بغض و حسد کا ثبوت دئے بغیر نہیں رہے۔

(۶) "کعبہ" بیت اللہ یعنی "خدا کا گھر" کہلاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "العیاذ باللہ" اللہ تعالیٰ کسی گھر میں ساکن ہے یا وہ گھر کا محتاج ہے بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس نے اپنی خالص عبادت کی غرض سے اقطاع و امصار کے مسلمانوں اور سچے عبادت گذاروں کے لئے کعبہ کو مرکز و محور بنایا ہے اور یہ اس لئے کہ جبکہ خدائے تعالیٰ جہات سے وراء الورا اور پاک ہے اور انسان اپنے ہر کام میں جہات میں سے کسی جہت کا محتاج تو از بس ضروری تھا کہ تمام کائنات کے پیروانِ توحید اور عبادت گذاران رب العلمین کی عبادت اور ان کی حیاتِ ملی و دینی کے لئے ایک مرکز ہو تاکہ وہ انتشار اور تفرق و تشتت سے محفوظ رہیں اور وحدتِ اجتماعی کا سبق سیکھیں لہٰذا اس کے لئے وہ مقدس عمارت "شعار اللہ" قرار دی گئی جس کو مجدد انبیاء و رسل ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے مقدس بیٹے اسمٰعیل (علیہ السلام) نے دنیا میں سب سے پہلے صرف خدائے واحد کی پرستش کے لئے تعمیر کیا تھا اور جو توحید کے اعلان کی سب سے پرانی

یادگار تھی ۔ "ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب" (جو لوگ اللہ کی نشانیوں کی عظمت کریں گے تو یہ ان کے دل کی پرہیزگاری کی دلیل ہے)۔

پس کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کعبہ کی اس لئے عظمت کرے کہ وہ "صنم" ہے بخود قابلِ پرستش ہے اس لئے کہ جو ایسا سمجھے گا وہ مسلمان نہیں بلکہ مشرک کہلائے گا۔ بلکہ اس کی حرمت صرف اس لئے ہے کہ وہ "شعائر اللہ" ہے اور مرکزِ توحید، چنانچہ اسی حقیقت کو ایک عارف باللہ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ۔ ع

قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

فاعتبروا یا اولی الابصار ۰